روئداد

ادارۂ معارف اسلامیہ

اجلاس اوّل

منعقدہ لاہور

۱۵ و ۱۶- اپریل سنہ ۱۹۳۳ء

مجلس عاملہ ادارۂ معارف اسلامیہ
نے شائع کیا۔

سنہ ۱۳۵۲ھ لاہور سنہ ۱۹۳۳ء

روئداد

ادارۂ معارف اسلامیہ

اجلاس اوّل

منعقدہ لاہور

۱۵ و ۱۶ - اپریل سنہ ۱۹۳۳ء

مجلس عاملہ ادارۂ معارف اسلامیہ
نے شائع کیا -

سنہ ۱۳۵۲ھ لاہور سنہ ۱۹۳۳ء

فہرست مضامین

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام پروفیسر محمد اقبال
سیکرٹری ادارہ معارف اسلامیہ لاہور چھپکر دفتر ادارہ معارف اسلامیہ لاہور سے شائع ہوا۔

ادارۂ معارف اسلامیہ

اور

اس کا پہلا اجلاس

۱۹۲۸ء میں جبکہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تو اُس کو دیکھ کر ڈاکٹر سر محمد اقبال کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اسی نمونے پر ایک ادارہ مخصوص طور سے علوم اسلامیہ کی تحقیق و ترویج کے لئے قائم ہونا چاہئے چنانچہ ان کی تحریک اور رہنمائی سے اس مقصد کی تکمیل کے لئے لاہور کے بعض علم دوست مسلمانوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے یہ فیصلہ کیا کہ ادارہ مجوزہ کا نام **ادارۂ معارف اسلامیہ** ہو اور ہر دوسرے سال اس کا اجلاس ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں ہوا کرے جہاں محققین علوم اسلامیہ جمع ہو کر اپنے علمی مقالات سے حاضرین کو مستفید کیا کریں اور بعد میں یہ مقالات ایک کتاب کی شکل میں شائع کئے جایا کریں۔ بعینہٖ جیسے یورپ میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس یا ہندوستان میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کرتی ہے۔

لیکن اس اہم مقصد کو عمل میں لانے کے لئے روپے کی فراہمی ایک مشکل مسئلہ تھا جو اُس وقت حل نہ ہوسکا۔ لہٰذا دو تین سال یہ سکیم معرض التوا میں رہی تا آنکہ ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کو حیدر آباد تشریف لیجانے کا اتفاق ہوا۔ ان کی کوشش اور ذاتی اثر سے ادارہ کے لئے ریاست کی طرف سے دو ہزار روپے سالانہ کی

امداد تین سال کے لئے منظور ہوئی۔ سال اول کی قسط دسمبر ۱۹۳۲ء میں وصول ہونے پر مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ ادارہ کا پہلا اجلاس ۱۵ و ۱۶ اپریل ۱۹۳۳ء کو بصدارت ڈاکٹر صاحب ممدوح لاہور میں منعقد ہو۔

کچھ وقت کی تنگی اور کچھ عام مالی مشکلات کی وجہ سے یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کی طرف سے ڈیلیگیٹ بہت کم آسکے اور اسی سبب سے مقالات کی تعداد بھی جتنی ہونی چاہئے تھی نہ ہو سکی لیکن مجلس عاملہ کی رائے تھی اور وہ صحیح رائے تھی۔ کہ خدا کا نام لیکر ابتدا کر دینی چاہئے جو کمی پہلے اجلاس میں رہی وہ انشاء اللہ بعد کے جلسوں میں پوری کر دی جائیگی۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کو صدارت کے قبول کرنے میں پہلے کچھ تامّل رہا۔ ان کا خیال تھا کہ ادارہ کے حق میں یہ بات مفید ہوگی کہ اسکا صدر لاہور والوں میں سے کوئی نہ ہو بلکہ باہر کا کوئی شخص ہو۔ انہی کی تجویز پر پہلے سر عبد الرحیم اور پھر سر عبد اللہ سہروردی مرحوم کو صدارت پیش کی گئی لیکن ان دونو بزرگوں نے مجبوری ظاہر کی خط وکتابت میں بہت سا وقت صرف ہوا حتیٰ کہ اپریل آگیا۔ بحالت مجبوری ڈاکٹر صاحب نے صدارت تو منظور کر لی لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے خطبۂ صدارت نہ لکھ سکے۔ اجلاس کے افتتاح کے وقت جو انہوں نے تقریر کی وہ محض زبانی تھی انکا وعدہ تھا کہ بعد میں اس کو ضبطِ تحریر میں لایا جائیگا۔ لیکن افسوس کہ اُس وقت سے اب تک اُن کی مسلسل علالت نے اس وعدہ کے ایفاء کی اجازت نہیں تھی۔ مجلس عاملہ کو ایسے حالات میں سخت افسوس ہے کہ اجلاس اوّل کی روئداد خطبۂ صدارت کے بغیر شائع ہو رہی ہے۔

باہر سے جو حضرات بغرض شرکت بحیثیت ڈیلیگیٹ یا وزیٹر تشریف لائے ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱) نواب صدر یار جنگ مولا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی۔
۲ علامہ عبداللہ یوسف علی۔
۳ ڈاکٹر حسین الہمدانی پروفیسر اسمعیل کالج بمبئی۔
۴ ڈاکٹر عبدالعلیم (ڈیلیگیٹ جامعہ ملیہ دہلی)
۵ شمس العلماء مولوی عبدالرحمن صاحب (ڈیلیگیٹ دہلی یونیورسٹی)
۶ ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب پروفیسر فارسی (" " ")
۷ ڈاکٹر ہادی حسن پروفیسر فارسی (ڈیلیگیٹ علی گڈھ یونیورسٹی)
۸ مولوی سید سلیمان صاحب ندوی (ڈیلیگیٹ دار المصنفین اعظم گڈھ)
۹ مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی (" " ")
۱۰ مولانا مولوی سعید انصاری (" " " ")
۱۱ پروفیسر احسان سامی حقی، سابق پروفیسر علی گڈھ یونیورسٹی۔

پروگرام و کارروائی اجلاس اول

۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء

۱۵ اپریل کی سہ پہر کو بیلی ہال پنجاب یونیورسٹی میں ادارۂ معارف اسلامیہ کا باقاعدہ افتتاح ہؤا۔ حاضرین کی تعداد اس قدر تھی کہ ہال میں کوئی نشست خالی نظر نہیں آتی تھی۔ علاوہ اُن باہر سے آنے والے حضرات کے جن کے نام اوپر مذکور ہوئے بہت سے مقامی علم دوست بزرگ شریک جلسہ تھے۔ جن میں سے اسمائے ذیل خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

آنریبل جسٹس سر شیخ عبدالقادر۔ علامہ عبداللہ یوسف علی، شیخ اصغر علی صاحب ریٹائرڈ کمشنر، ڈاکٹر نند لال بیرسٹر ایٹ لا، خانصاحب قاضی فضل حق پروفیسر گورنمنٹ

کالج، خان بہادر ملک نے مان مہدی ڈپٹی کمشنر، خان بہادر سردار حبیب اللہ ایم۔ ایل سی
مولانا مولوی غلام محی الدین سیکرٹری انجمن حمایت اسلام، شیخ عظیم اللہ بی۔ اے ایل ایل
بی سیکرٹری انجمن حمایت اسلام، ڈاکٹر برکت علی قریشی پرنسپل اسلامیہ کالج، ڈاکٹر سعید اللہ
پروفیسر اسلامیہ کالج۔ ملک عبد القیوم بیرسٹر سابق ایڈیٹر البسٹرن ٹائمز، ملک برکت علی
صاحب ایڈوکیٹ، خانصاحب گل محمد خاں وکیل فیروز پور، پروفیسر محمد شفیع وائس
پرنسپل اورنیٹل کالج۔ حافظ محمود خانصاحب شیرانی، ڈاکٹر عبد الحق پروفیسر اسلامیہ کالج
خان بہادر سید مقبول شاہ سابق انسپکٹر سکولز، وغیرہم،

کارروائی کی ابتدا تلاوت کلام مجید سے ہوئی۔ مولانا سید احسان سامی حقی سابق
پروفیسر علیگڈھ نے اپنے عربی لہجہ میں ایک کورع پڑھا جو معنی اور مطالب کے لحاظ
سے نہایت برمحل تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب بیرسٹر صدر
استقبالیہ کمیٹی نے حاضرین سے خطاب کیا اور ممبران اور مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے
ادارۂ معارف اسلامیہ کے اغراض و مقاصد سے حاضرین کو آگاہ کیا۔ بعد ازاں علامہ
ڈاکٹر سر محمد اقبال نے صدر جلسہ کی حیثیت سے ایک پرمغز تقریر کی جس میں انہوں
نے ادارہ کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا اور اختتام تقریر پر حضور نظام کے گرانقدر
عطیہ کا شکریہ ادا کیا جو ذیل کے ریزولیوشن کی شکل میں بہ اتفاق منظور ہوا۔

"ممبران ادارۂ معارف اسلامیہ اپنے اجلاس اولین منعقدہ لاہور میں بالاتفاق
حضور نظام دکن کے اُس گرانقدر عطیہ کا جو انہوں نے از راہ کرم ادارہ کو بطور سالانہ
امداد کے مرحمت فرمایا ہے۔ مؤدبانہ شکریہ ادا کرتے ہیں"۔

صدر جلسہ کی تقریر کے بعد مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اردو میں اپنا
مضمون بعنوان "لاہور کا ایک مہندس خاندان" پڑھا جس کو سب نے پوری توجہ اور دلچسپی
کے ساتھ سنا۔ اختتام مضمون پر ماسٹر محمد عبد اللہ چغتائی نے اسی مضمون پر مزید روشنی

ڈالتے ہوئے ایک مختصر تقریر کی جس سے حاضرین کی معلومات میں مفید اضافہ ہؤا۔

پانچ بجے اجلاس اول ختم ہؤا۔ پروگرام میں اس کے بعد شام کے سات بجے تک یونیورسٹی لائبریری میں نمائش کے معائنہ کا وقت تھا۔ یہ نمائش جس میں مسکوکات اور مخطوطات کے نادر نمونے پیش کئے گئے تھے۔ خاص طور سے اجلاس ادارہ کے لئے ترتیب دی گئی تھی[۱]۔ حاضرین جلسہ میں سے جن بزرگوں نے جاکر اسے دیکھا وہ وہ ان نفائس کی ندرت اور عمدگی کے قائل ہوئے جو وہاں دکھائے گئے تھے۔

نمائش کو کامیاب بنانے کیلئے متعدد اصحاب نے پیہم کئی دن تک مسلسل کوشش کی، نہ صرف یہ کہ انہوں نے مختلف علمی ذخیروں سے نمائش کیلئے کتابیں اور تصویریں منتخب کیں اور مستعار لیں یا نمائش کے لئے مستعار دیں بلکہ ان کی فہرستیں مرتب کرنے اور اُن کو ترتیب دینے کیلئے اپنا بہت سا وقت صرف کیا اور سخت محنت اٹھائی ان میں لالہ لبھو رام لائبریرین پنجاب یونیورسٹی، پروفیسر حافظ محمود شیرانی اور ماسٹر محمد عبداللہ چغتائی اور مولوی نذیر احمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قلمی نسخے جو اس نمائش میں رکھے گئے۔ ان کا بیشتر حصہ پروفیسر شیرانی اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت تھا۔ لیکن مسکوکات کا مجموعہ سارے کا سارا پروفیسر صاحب ممدوح کا تھا۔ اس میں ہزاروں سکے طلائی تھے۔ جن کی مناسب حفاظت کے لئے روزانہ اس کو نمائش میں لانے اور پھر شام کو گھر واپس لیجانے میں انہوں نے خاصی زحمت اٹھائی۔

اجلاس دوم

اجلاس دوم ۱۵؍اپریل کی شام کو ساڑھے سات بجے لاکالج لاہور میں بہ صدارت

[۱] دیکھو اس نمائش کا حال بقلم پروفیسر شیرانی، اورینٹل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۳۳ء

پروفیسر محمد شفیع صاحب وائس پرنسپل اورینٹل کالج منعقد ہوا۔ اس میں صرف دو مضمون پڑھے گئے۔ جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) ڈاکٹر ہادی حسن صاحب پروفیسر علیگڈھ بعنوان "ظہیرالدین نیشاپوری"

(۲) ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب پروفیسر شاہ پور کالج بعنوان "عربوں کا سیاسی او معاشرتی نظام" (دیکھو روئداد حصہ انگریزی)

اجلاس سوم

اجلاس سوم ۱۶ اپریل کی صبح کو دس بجے لا کالج میں بہ صدارت ڈاکٹر برکت علی قریشی پرنسپل اسلامیہ کالج منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے

(۱) شمس العلما مولانا مولوی عبدالرحمن دہلوی بعنوان "مناصب اکبری اور انکی تنخواہیں" (دیکھو روئداد حصہ اردو)

(۲) مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی بعنوان "سسلی میں مسلمانوں کا تمدن" (دیکھو روئداد حصہ اردو)

(۳) پروفیسر محمد شفیع صاحب ایم-اے بعنوان "آل میکال" (دیکھو روئداد انگریزی)

(۴) ڈاکٹر حسین الہمدانی سورتی بعنوان "رسائل اخوان الصفا" (بزبان عربی) دیکھو روئداد۔

اجلاس کے اختتام پر صدر جلسہ نے سب مضامین پر مفید تبصرہ کیا اور پڑھنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔

اجلاس چہارم

تین بجے سہ پہر بہ صدارت شمس العلماء مولانا مولوی عبدالرحمن صاحب دہلوی

اس اجلاس میں جو مقالات پڑھے جانے والے تھے انکی تعداد زیادہ تھی اور وقت کم تھا ۔ لہٰذا بیس منٹ سے زیادہ کسی مضمون کو وقت نہ دیا جاسکا۔ ہمیں اس بات کا بیحد افسوس ہے خصوصاً اس لئے کہ جملہ مضامین نہایت دلچسپ تھے اور حاضرین مشائق تھے۔ کہ ہر مضمون بہ تمام و کمال پڑھا جائے۔ اس اجلاس کے مضامین حسب ذیل تھے

(۱) سید محمد عبداللہ ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل بہ عنوان "تنبیہات ابوالقاسم علی بن حمزہ البصری" (دیکھو روئداد حصہ انگریزی)

(۲) پروفیسر ایم۔ ایف قریشی ایم۔ اے بہ عنوان "مسلمانوں میں علم طبیعات کی ابتدا اور ابن الہیثم" (دیکھو روئداد حصہ انگریزی)

(۳) مولوی سید سعید انصاری اعظم گڈھی بہ عنوان "عربی علم اللغۃ کی تاریخ" (دیکھو روئداد)

(۴) ماسٹر محمد عبداللہ چغتائی بہ عنوان "کمال الدین بہزاد مصور" (دیکھو روئداد)

۵ بجے اجلاس ختم ہوا اس کے بعد مینارڈ ہال میں اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ لاہور کی طرف سے ادارہ کے جملہ ممبران و مندوبین کے اعزاز میں ٹی پارٹی ہوئی جس میں لاہور کے اکثر عمائد شریک تھے۔

اجلاس پنجم

اجلاس پنجم شام کو ساڑھے سات بجے لا کالج میں بہ صدارت ڈاکٹر محمد سعید اللہ صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے۔

(۱) ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب پروفیسر مشن کالج دہلی بہ عنوان "خاندان ترکمانان قراقویونلو" (دیکھو روئداد حصہ اردو)

(۲) پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب شیرانی بہ عنوان "فارسی زبان میں بچوں کے

تعلیمی نصاب" (دیکھو روئداد حصہ اردو)

اجلاس کے اختتام پر دو ریزولیوشن بالاتفاق پاس ہوئے پہلا ریزولیشن ڈاکٹر اظہر علی صاحب نے پیش کیا۔جس میں تحریک ہوئی کہ لالہ لبھورام صاحب لائبریرین، پروفیسر حافظ محمود خانصاحب شیرانی، اور ماسٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی ان تھک کوششوں سے نمائش کو کامیاب بنایا۔ دوسرے ریزولیوشن کی تحریک سیکرٹری ادارہ نے کی جس میں حضرات مندوبین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا گیا۔

مجلس عاملہ پنجاب یونیورسٹی کی ممنون ہے۔کہ انہوں نے ازراہ نوازش ادارہ کے افتتاحی اجلاس کے لئے ہیلی ہال کے استعمال کی اجازت دی۔

(محمد اقبال سیکرٹری ادارہ معارف اسلامیہ)

فہرست ممبران مجلس عاملہ

(۱) آنریبل شیخ سر عبدالقادر (صدر)

(۲) ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، بیرسٹرایٹ لا۔ لاہور

(۳) پروفیسر محمد شفیع۔اورینٹل کالج لاہور

(۴) پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی۔اورینٹل کالج لاہور

(۵) خواجہ عبدالوحید سیکرٹری اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ۔ لاہور

(۶) ملک عبدالقیوم بیرسٹرایٹ لا۔

(۷) پروفیسر محمد اقبال۔ اورینٹل کالج۔ لاہور (معتمد و خازن)

فہرست ممبران استقبالیہ کمیٹی

(۱) ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین ایم۔اے۔ایل ایل ڈی بیرسٹر ایٹ لا (صدر)
(۲) پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب شیرانی۔
(۳) آنریبل شیخ سر عبدالقادر صاحب
(۴) پروفیسر محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور
(۵) پروفیسر محمد شفیع صاحب اورینٹل کالج۔ لاہور
(۶) خانصاحب پروفیسر قاضی فضل حق صاحب
(۷) خواجہ عبدالوحید صاحب
(۸) ملک برکت علی صاحب ایم اے۔ایل ایل۔بی۔ایڈوکیٹ لاہور
(۹) مولوی غلام محی الدین صاحب ایڈوکیٹ لاہور
(۱۰) چودھری عبدالکریم صاحب مجسٹریٹ لاہور
(۱۱) خواجہ فیروزالدین صاحب بیرسٹر۔ لاہور
(۱۲) خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب انسپکٹر آف سکولز لاہور
(۱۳) مولوی عبدالباسط صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور
(۱۴) میاں محمد اسلم صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور
(۱۵) خانصاحب میاں امیرالدین صاحب سب رجسٹرار لاہور
(۱۶) ڈاکٹر سر محمد اقبال
(۱۷) ڈاکٹر محمد صدرالدین صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور
(۱۸) صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم۔ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

(۱۹) آنریبل سر ظفر علی جج ہائی کورٹ لاہور
(۲۰) شیخ فیاض الدین صاحب رئیس لاہور
(۲۱) پروفیسر عبد المجید صاحب۔ گورنمنٹ کالج لاہور
(۲۲) آنریبل سر شہاب الدین پریزیڈنٹ پنجاب کونسل،
(۲۳) نواب احمد یار خانصاحب دولتانہ۔ ایم۔ ایل۔ سی۔ لاہور
(۲۴) نواب شاہ نواز خاں صاحب رئیس ممدوٹ
(۲۵) خاں بہادر سردار حبیب اللہ خاں صاحب ایم۔ ایل۔ سی۔ لاہور
(۲۶) پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب گورنمنٹ کالج لاہور
(۲۷) مولوی ظفر اقبال صاحب۔ پروفیسر ٹریننگ کالج لاہور
(۲۸) قاضی ظہیر الدین صاحب ایم اے۔ پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور
(۲۹) مولوی سید مرتضیٰ حسین صاحب پروفیسر خالصہ کالج امرتسر
(۳۰) ڈاکٹر برکت علی صاحب قریشی۔ پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور
(۳۱) ڈاکٹر سعید اللہ صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور
(۳۲) میاں نظام الدین صاحب رئیس لاہور
(۳۳) پروفیسر عابد علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور۔
(۳۴) خاں غلام محمد خانصاحب گورنمنٹ پنشنر ٹمپل روڈ لاہور
(۳۵) شیخ سراج الدین صاحب آذر۔ پروفیسر گورنمنٹ کالج لہرور
۳۶ پروفیسر علم الدین سالک ایم۔ اے اسلامیہ کالج لاہور
۳۷ پروفیسر سید عبد القادر صاحب۔ اسلامیہ کالج لاہور
۳۸ میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) رئیس لاہور
۳۹ نواب نثار علی خاں صاحب قزلباش۔ رئیس لاہور

لاہور کا ایک مہندس خاندان

جس نے

تاج اور لال قلعہ بنایا

ہندوستان کے ارباب کمال میں خدا جانے کتنی ہستیاں ہیں جو گمنامی کے پردہ میں اس طرح چھپی ہیں کہ آج ہزار تلاش اور جستجو پر بھی اُن کا سُراغ نہیں لگتا، اس ملک میں تاریخ نویسی کا رواج بہت کم تھا، گو مسلمانوں کے آنے کے بعد تاریخ کی کچھ کچھ روشنی یہاں پھیلنے لگی، پھر بھی بادشاہوں کے ایوان تاریخ سے باہر بدستور اندھیرا چھایا رہا، شاعروں نے البتہ اپنے تذکروں کی محفل میں شمع جلائی، مگر اس کی روشنی اتنی مدھم ہے کہ خود ان کی صورتیں بھی اس سے پہچان میں اچھی طرح نہیں آتیں، روحانی بزرگوں کے مزاروں پر بھی چراغ جلائے گئے ہیں، مگر ان سے بھی تبرکات اور کرامات کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا، اگر ملا بدایونی، شاہ عبدالحق دہلوی اور آزاد بلگرامی نہوتے تو جو کچھ بھی معلوم ہے وہ بھی ہم کو معلوم نہو سکتا،

لاہور کے جس مہندس خاندان کا حال آج ہم کو سنانا ہے، افسوس ہے کہ تاریخوں میں نام کے سوا اس کے کسی رکن کا حال بھی مجھے معلوم نہیں ہوا، حالانکہ ان کی بنائی ہوئی عمارتیں تاج آگرہ لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی ہمیشہ سے مشہور روزگار ہیں، مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ جن

باکمالوں نے فن کی ندرت کا یہ کمال دکھایا ہے، کاغذ کے پرانے اوراق میں بھی ان کا نام و نشان نہیں ملتا،

شاہجہان کی تاریخوں میں اس کے سال ششم میں روضۂ تاج محل کے بننے کا پورا حال، ایک ایک چیز کی پیمائش کے ساتھ لکھا ہے، مگر جن نادرہ کار مہندسوں، نقاشوں اور طرّاحوں نے اس کا خاکہ کھینچا، اور جن معماروں نے ان کو بنا کر تیار کیا ان غریبوں کے نام تک بھی ان اوراق میں جگہ نہ پا سکے اور آج کل کے محققین بڑی چھان بین کے بعد بھی ان کا پتہ لگانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے،

اس خاندان کے بعض ارکان کے نام مصنف کی حیثیت سے بعض کتب خانوں کی فہرستوں میں مذکور ہیں، مگر ان میں بھی نام کے سوا کچھ اور نہیں، اور نہ ان افراد کے باہمی تعلق کا ذکر ہے، بلکہ ان کی حیثیت بیگانہ افرادِ انسانی کی ہے،

دیوانِ مہندس کا نسخہ

پورے دو برس ہوئے کہ ایک کرمفرمانے بنگلور سے مجکو اطلاع دی کہ ان کے پاس مہندس نام ایک شاعر کا فارسی دیوان ہے اور دریافت کیا کہ کیا آپ اس شاعر سے واقف ہیں، میں نے لکھا کہ آپ وہ نسخہ مجھے بھیج دیں تو میں اپنی رائے ظاہر کروں، موصوف نے بڑی مہربانی فرما کر نسخۂ مذکور میرے پاس بھیج دیا، میں نے اس شخص کی تلاش میں اکثر تذکرے دیکھے، لیکن اس میں کچھ پتہ نہ چلا[1] مگر خوش قسمتی سے خود اس دیوان میں شاعر کی مثنوی مل گئی، جس میں اس نے اپنے خاندان کا مختصر حال خود لکھا ہے، اس کو پڑھ کر میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی کہ یہ معماروں اور انجنیروں کی طرف سے پہلی آواز تھی جس میں تاج اور لال قلعہ کے بنانے کا دعویٰ کیا گیا تھا،

---

[1] بعض تذکروں میں مہندس کے بیٹے ریاضی کے ضمن میں مہندس کا نام مذکور ہے، س

اس مثنوی سے نہ صرف شاعر کے بلکہ شاعر کے باپ اور بھائیوں کے حالات بھی معلوم ہوئے، اور اس کے دوسرے قصائد اور اشعار سے یہ بھی قیاس میں آیا کہ اس باکمال خاندان کی گمنامی کا سبب کیا ہو سکتا ہے،

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص مُھَندِس ہے، مُھَندِس کے معنی علم ہندسہ جاننے والے یعنی انجنیر کے ہیں۔ اور اس کا یہ دیوان، چند قصیدوں بعض مثنویوں اور بہت سی غزلوں پر مشتمل ہے، اور یہ سب فارسی میں ہیں،

دیوان کا کوئی دوسرا نسخہ مجھے نہیں ملا، زیر نظر نسخہ چھوٹی تقطیع کے ۹۶ صفحوں پر حاوی ہے دیوان کے حصۂ غزل کے خاتمہ پر تاریخ اتمام، "۶ شہر ذی الحجہ ۴۷ بوقت شب تحریر یافت" لکھا ہے اور دیوان کے خاتمہ پر اس کتاب کی خریداری کی تاریخ لکھی ہے،

"بتاریخ بیستم رمضان المبارک ۱۱۵۷ھ دیوان مھندس خرید شد بسرکار نواب ابراہیم خان بہادر"

اور کتاب کے اندر بعض تاریخی قطعات ہیں جن میں سب سے آخری تاریخ ۱۰۶۶ھ کی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر یہ "۶ شہر ذی الحجہ ۴۷" ہجری سنہ ہے تو وہ یقیناً ۱۱۴۷ ہجری ہے، ورنہ میرا شبہ اس بنا پر کہ یہاں صرف ۴۷ لکھا ہے اور سیکڑہ نہیں لکھا ہے، یہ ہوتا ہے کہ یہ سنہ ہجری نہیں، بلکہ سنہ جلوس ہے۔ اب ۱۰۶۶ کے بعد اور ۱۱۵۷ کے بیچ میں ایسا بادشاہ جس کو جلوس کا سینتالیسواں سال نصیب ہوا ہو، اورنگ زیب عالمگیر کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ ۴۷ جلوس عالمگیری ۱۱۱۵ھ کے مطابق ہے،

اس نسخہ کے صفحہ اوّل پر عمدہ جلی نستعلیق سے "این کتاب سرکار نواب بہادر . . . " لکھا ہے، باقی حروف کٹ گئے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نسخہ کی تقطیع پہلے بڑی

تھی. جلد بندی کے وقت کچھ حاشیہ کاٹ دیا گیا ہے، اس کے نیچے "ایں کتاب سرکار نواب ابراہیم خان بہادر ہزبر جنگ بکتاب خان (بکتاب خانہ ؟) داخل شد" اس پر ایک مہر بھی تھی جو کسی نے مٹا دی ہے،

شاعر کا نام لطف اللہ اور تخلص مہندس بن چکے، اور وہ اپنے باپ کا نام احمدؒ معمار بتاتا ہے، معمار، احمدؒ کا پیشہ ہے، نام کا جزو نہیں، اس کے ایک قطعہ میں اس کا شاہی لقب "نادر العصر" مذکور ہے، اس شاعر کی بعض اور تحریریں بھی ہم کو دستیاب ہوئی ہیں جن میں وہ اپنے باپ کو لزوماً "استاد احمدؒ لاہوری" لکھا کرتا ہے، اب ان ٹکڑوں کے جوڑنے سے احمدؒ کا پورا نام و لقب "نادر العصر استاد احمدؒ معمار لاہوری" ثابت ہوتا ہے،

نادر العصر استاد احمدؒ معمار لاہوری

اس نادر العصر کے حالات کا سراغ مجکو تاریخ کی کتابوں میں کہیں نہیں ملا، البتہ محمدؐ صالح کنبوہ نے عمل صالح میں جو شاہجہان کی معاصر تاریخ ہے، شاہجہان آباد کے عمارات وقلعہ کی تعمیر کے بیان میں اس کا نام ان لفظوں میں لیا ہے،

"از شب جمعہ بیست و پنجم ذی حجہ مطابق نہم اردی بہشت سال دوازدہم از جلوس اقدس مطابق یک ہزار و چہل[1] و ہشت ہجری در زمان محمود و آوان مسعود استاد احمدؒ سر آمد معماران نادرہ کار بسرکاری غیرت خاں صوبہ دار آنجا و صاحب اہتمام ایں کار مطابق طرحے بدیع و نقشے تازہ کہ بہ ہیچ وجہ نظیر آں در شش جہت دنیا بنظر نظارگیان نیامدہ بود، رنگ ریختہ" (جلد ۳ صفحہ ۲۷، کلکتہ)

مولوی عبد اللہ صاحب چغتائی (اسلامیہ کالج لاہور) جن کو تاج اور ہندوستان کی

[1] اس مطبوعہ نسخہ میں جس کی تصحیح ناظم آثار قدیمہ سرکار نظام مولوی غلام یزدانی صاحب نے کی ہے، یہ سنہ لفظوں میں چہل و ہشت کے بجائے "ہشتاد و چہل" چھپ گیا ہے، جو قابل تصحیح ہے.

اسلامی عمارتوں کی تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے، ان کو مین نے اس معمار کے نام سے مطلع کیا تھا، اور تلاش حال کے لئے آمادہ کیا تھا، اونھوں نے پہلے تو لاعلمی ظاہر کی، پھر کچھ دنون کے بعد مجھے اونھوں نے لکھا کہ اُن کے پاس شاہجہانی و عالمگیری عہد کے امرا کے خطوط کا کوئی ناقص اور بے نام و نشان پرانا مجموعہ ہے، اس کے ایک خط میں نواب جعفر خان کو سرائے باغ اور قلعہ حسن ابدال کی تعمیر کے متعلق کچھ لکھا گیا ہے، اس سلسلہ مین استاد احمد معمار کا ذکر ان لفظون مین آیا ہے،

"... بدرگاہ سلاطین سجدہ گاہ معروض داشتہ حقیقت حسن سلوک و کاردانی محمد مومن مذکور و استاد احمد معمار کہ در طراحی و وقوف کار عمارت و معاملہ شناسی استعداد تمام و وقوف بکمال دارد"

عمدۃ الملک نواب جعفر خان ہمیشہ سے شاہجہان کا مقرب خاص تھا، مختلف مناصب جلیلہ کے بعد ۱۹ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۵ھ میں پنجاب کا صوبہ دار اور ۲۱ جلوس شاہجہانی مطابق ۱۰۵۷ھ میں شاہجہان کا وزیر ہوا تھا، اور پھر ۱۰۷۴ھ میں عالمگیر نے اس کو وزیر بنایا، اور ۱۰۸۱ھ میں اس نے وفات پائی، یہ خط غالباً پنجاب کی صوبہ داری یا وزارت کے عہد میں اس کو لکھا گیا ہوگا کیونکہ جیسا آگے معلوم ہوگا کہ اس کے دو برس کے بعد احمد وفات پا چکا تھا، سرسید مرحوم نے اپنی قابل قدر تصنیف آثار الصنادید میں استاد احمد کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے کہ "یہ اپنے فن مین "بے نظیر" اور ہندسہ و ہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشک ارشمیدس تھے"،

ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ استاد احمد، عہد شاہجہانی میں "سر آمد معماران نادرہ کار" تھا، اور اس کو عمارتوں کا نقشہ اور خاکہ بنانے اور تعمیرات کے دوسرے کامون مین کمال دستگاہ حاصل تھی،

تاج محل کے حالات میں بعد انگریزی آگرہ میں ایک فارسی رسالہ خدا جانے کس نے لکھا ہے، اس کے قلمی نسخے عموماً ملتے ہیں، اس میں حالات کے ساتھ ساتھ عمارات کی تصویریں بھی ہیں، شروع میں ممتاز محل کی وفات کی افسانہ نما کیفیت لکھی گئی ہے، اور پھر اس میں تاج محل کی تعمیر کا ایک ایک خرچ اور اس کے ایک ایک پتھر کی قیمت، اور اس کے ایک ایک کاریگر کے نام مع تعین تنخواہ لکھے ہین، جو زیادہ تر سنی سنائی حکایتون اور فرضی اعداد پر مشتمل معلوم ہوتا ہے، اس رسالہ مین کاریگرون مین سب سے پہلا نام استاد عیسیٰ "نادر العصر نقشہ نویس ساکن روم" لکھا ہے۔ اس کتاب کے مختلف نسخے دیکھے اور سب مین نامون کا کچھ نہ کچھ اختلاف پایا، اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس مین پندرہ کاریگرون تک کو ساکن روم و بلخ و قندھار و سمرقند لکھا ہے، جامعہ علیگڈھ، ندوہ اور دار المصنفین چارون کے نسخون مین یہ شتر گربگی بتغیر موجود ہے، بہرحال "استاد نادر العصر" تک تو نام صحیح ہے جو اسی احمدؒ معمار کا شاہی لقب تھا، مگر اس مین عیسیٰ نقشہ نویس ساکن روم کا نام اضافہ ہے، یا یہ کہ "استاد نادر العصر" اور "عیسیٰ ساکن روم" دو نام ہین، جو ایک مین مل گئے ہین، اس کتاب تاج مین امانت خان شیرازی کے سوا جس کا ذکر تاریخون اور تذکرون کے علاوہ خود تاج کے کتبون مین ہے، جن کاریگرون کی فہرست دی گئی ہے، اور جو تنخواہین لکھی گئی ہین، وہ تمامتر محتاج ثبوت ہین، لیکن تعجب ہے کہ تاج کے مورخین حال نے اُن کو بے چون وچرا تسلیم کرلیا ہے، بہرحال تاج کے معمارون مین سے جو نام اب سب سے زیادہ اہم سند رکھتا ہے، وہ یہی نادر العصر استاد احمدؒ ہے، جس کا نام اس مضمون مین سب سے پہلی دفعہ پیش کیا جارہا ہے،

لطف اللہ کے بیان سے اُس کے باپ احمدؒ کے کچھ اور حالات بھی معلوم ہوتے ہین، مثلاً یہ کہ احمدؒ معمار آجکل کا کوئی اناڑی راج نہ تھا، بلکہ وہ باقاعدہ ہندسہ (انجینیرنگ) ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، یونانی ریاضیاتِ فلکی کی سب سے اونچی کتاب مجسطی کا ماہر تھا،

اور اقلیدس میں خواجہ نصیر طوسی کی کتاب تحریر اقلیدس کا عالم تھا۔ لطف اللہ ایک مثنوی میں اپنے خاندانی حالات کا ذکر ان لفظوں مین کرتا ہے،

شاہجہان داورِ گیتی ستاں — روشنیٔ دودۂ صاحب قِبراں
عرش بریں قبۂ خرگاہِ اوست — رشکِ فلک سدۂ درگاہِ اوست
احمدِ معمار کہ در فنِ خویش — صد قدم از اہلِ ہنر بود بیش
واقفِ تحریر و مقالاتِ آن — آگہِ اشکال و حوالاتِ آن
حالِ کواکب شدہ معلوم او — سرِ مجسطی شدہ مفہوم او
از طرفِ داورِ گردوں جناب — "نادرِ عصر" آمدہ اورا خطاب
بود عمارت گرِ آن بادشاہ — داشتہ در آن حضرتِ فرخندہ راہ

ان اشعار سے نادر العصر احمد معمار شاہجہانی کے فضل و کمال کا پورا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہجہان کا مشہور عمارتگر تھا، اب اس کے بعد وہ اشعار آتے ہیں جن مین اس عظیم الشان حقیقت کا انکشاف ہے، جو اب تک ستر رو مخفی تھی یعنی یہ کہ یہی وہ ممتاز ہستی ہے، جس نے ممتاز محل کا روضہ اور دہلی کا لال قلعہ تعمیر کیا، کہتا ہے،

اگرہ چو شد مضرب رایاتِ شاہ — بس کہ برو بود عنایاتِ شاہ
کرد بحکمِ شہِ کشور کشا — روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکمِ شہِ انجم سپاہ — شاہجہان داورِ گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ ندارد نظیر — کرد بنا احمدِ روشن ضمیر

ان دو کے علاوہ عہدِ شاہجہانی کی دوسری عمارتین بھی اس نے بنائی تھیں چنانچہ کہتا ہے،

این دو عمارت کہ بیان کردہ ام — در صفتش خامہ روان کردہ ام

یک ہنر از گنج ہنرہائے اوست　　یک گہر از کانِ گہرہائے اوست

اس کے بعد اس کی وفات کا ذکر کیا ہے

چوں نبود عالم فانی مقر　　کرد سوی عالم فانی سفر

اس مثنوی کے شروع میں شاہجہان کا ذکر زمانۂ موجودہ میں کیا گیا ہے

عرش بریں قبۂ خرگاہِ اوست　　رشکِ فلک رُتبۂ درگاہِ اوست

اس سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی شاہجہان کی زندگی میں لکھی گئی ہے اور اسی کے عہد میں تاج محل اور قلعہ دہلی کی تعمیر کا یہ دعویٰ کیا گیا ہے، اس سے زیادہ ثبوت اور کیا درکار ہے،

استاد حامد

استاد احمد کے ساتھ اوس کے بھائی استاد حامد کا نام بھی ذکر کے قابل ہے یہ بھی معماری، ہندسہ، اور دیگر علوم ریاضی میں سربرآوردہ تھا، اور قلعہ کی تعمیر میں احمد کا شریک تھا، سرسید مرحوم اپنی قابل قدر کتاب آثار الصنادید میں قلعہ شاہجہانی کے بیان میں لکھتے ہیں کہ :-

"اچھی سے اچھی ساعت دیکھ کر استاد حامد اور استاد احمد معمارون نے کہ اپنے فن میں اپنا نظیر نہین رکھتے تھے، اور ہندسہ و ہیئت میں ثانی اقلیدس اور رشک ارزمیدس تھے اس قلعہ کی بنیاد رکھی" (طبع اول ص۳ باب دوم)

طبع دوم مین یہی عبارت ان لفظون مین ہے :-

"استاد حامد اور استاد احمد جو اپنے فن مین یکتا تھے، اس قلعہ کو بنواتے تھے،

(طبع دوم نامی پریس ص۲۵)

دہلی کے بڑے بوڑھون کی زبانی یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ جامع مسجد دہلی بھی اسی استاد حامد نے جس کا مشہور نام " استا حامد " ہے، بنائی ہے اور اس کے بنانے

میں اُس کا دوسرا شریک "اُستا ہیرا" تھا،

استاد حامد کا نام قلعہ دہلی کے بعد جو ۱۰۴۸ھ میں بنا، مانڈو کے ایک سیاحتی کتبہ میں جس کی تاریخ ۱۰۵۰ھ ہے، جیسا کہ آگے آئیگا، لکھا ہوا ملتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ تک زندہ تھا، دہلی کے ایک قدیم معزز خاندان کے ایک واقفکار سید مرتضیٰ علی صاحب ہیڈ کلرک دفتر کمانڈر ان چیف دہلی) کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ استاد حامد اور استاد احمد دونوں بھائی تھے، استاد حامد کے نام سے "کوچہ اُستا حامد" دہلی میں اب تک دریبہ اور جامع مسجد کے درمیان موجود ہے، اور ان کی اولاد دہلی میں سکونت پذیر ہے۔ اور لاہور والے کہلاتے ہیں اور آج کل وہ سادہ کاری کا کام کرتے ہیں، الغرض یہی وہ دو کاریگر ہیں جنھوں نے قلعہ معلی اور اس کے حیرت انگیز عمارات دیوانِ عام و دیوان خاص غسلخانہ اور دوسرے محلات شاہی بنائے اور اس کی تعمیر میں ایک تیسرا نام احمد کے بیٹے لطف اللہ کا شامل ہے، جس کا ذکر آگے آئیگا،

استاد احمد کی تاریخ وفات

اس دیوان کے آخر میں استاد احمد معمار کی وفات کی دو تاریخیں بھی درج ہیں،

(۱)

در زمان سعید شاہ جہان — شاہ عالم پناہ جم مقدار
نادر العصر رفت و گفت خرد — شد بفردوس احمد معمار

(۲)

آن نادر عصر زینت دہر — چون رفت بسوئی ملک سرمد
تاریخ وفات او خرد گفت — محمود العاقبت شد احمد

ے۔ دال کے بغیر اُستا حامد

ان دونون قطعون کے ہر چوتھے مصرع سے ۱۰۵۹ھ کے اعداد نکلتے ہین، روضہ کی تعمیر ۱۰۵۰ھ مین یعنی احمد کی وفات سے نو برس پیشتر ختم ہوچکی تھی، اور دہلی کا قلعہ ۱۰۴۸ھ سے شروع ہوکر احمد کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۰۵۸ھ مین تکمیل پایا تھا۔ ممکن ہے کہ استاد احمد روضہ کو ختم کرکے قلعہ کی تعمیر مین شامل ہوا ہو، یا روضہ کا اصلی تعمیری کام ختم کرکے شروع ہی سے قلعہ کی تعمیر مین مصروف ہوا ہو،

احمد معمار کی تین اولادین

استاد احمد نے ان تعمیری یادگارون کے علاوہ اپنی تین جسمانی یادگارین بھی چھوڑیں، اور ان کو بھی تعمیر و ہندسہ و ریاضیات کی بہترین تعلیم دی، اور غالباً اوس کے پیش نظر یہ چیز تھی کہ ریاضیات کی اعلیٰ درجہ کی جو کتابین اب تک صرف عربی زبان مین ہین، اون کو فارسی مین منتقل کیا جائے، تاکہ وہ علوم فارسی دانون کی دسترس مین آسکین، چنانچہ سنہ ۱۰۵۰ھ مین یعنی جس سال روضہ تمام ہوا ہے، اور قلعہ دہلی کی تعمیر جاری تھی، اس نے اپنے منجھلے بیٹے لطف اللہ کو عبدالرحمان صوفی کی صورالکواکب کے ترجمہ کا حکم دیا،

لطف اللہ کی جس مثنوی کے کچھ ابتدائی اشعار اوپر نقل کئے گئے ہین، اُس مین احمد معمار کی وفات کے ذکر کے بعد اُس کے ان تین باکمال فرزندون کے نام لئے گئے ہیں

بس سہ پسر ماند ز مرد سترگ　　زان سہ عطاء اللہ رشیدی بزرگ

دیوان کے اس نسخہ میں رشیدی کی جگہ کاتب نے "رشد" لکھا ہے مگر اس کی تصنیفات مین اس کے نام کے ساتھ "رشیدی" لکھا ملتا ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ اس لفظ کو اسی طرح پڑھنے سے شعر صحیح ہوسکتا ہے، پھر عطاء اللہ کی تعریف مین کہتا ہے،

نادرِ عصر خود و مشہورِ شہر　　عالم و علامہ و دانائے دہر

مردِ ہنر پرور و استادِ فن　　فاضل و دانشور و حبرِ زمن
مخزنِ علم آمدہ تالیفِ او　　گنجِ ہنرہاست تصانیفِ او
نثرِ وی از آبِ روان پاک تر　　نظمِ خوشش غیرتِ سلکِ گہر

اس آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عطاء اللہ شاعر بھی تھا اور غالباً اس کے نام کے بعد "رشیدی" اس کا تخلص ہے، اس کے بعد شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ اس نے تمام تر اپنے اسی بڑے بھائی سے تعلیم پائی ہے،

منکہ سخن پرور و دانش ورم　　بندۂ آن حبرِ سخن پرورم
منکہ ربودم زجہان گوئی علم　　از تپش یافتہ ام بوئی علم
منکہ شدم آگہِ سرِ نہان　　از دم او یافتہ ام قوتِ جان

اس کے بعد لطف اللہ اپنے کو احمد معمار کا منجھلا بیٹا بتاتا ہے اور اپنی تعریف آپ کرتا ہے،

ثانیِ آن ہرسہ برادر منم　　ہندسہ یکفن بود از صد فنم
گرچہ مُہندس لقبم از شہ است　　نامِ منِ دل شدہ لطف اللہ است

لطف اللہ اپنا نام اور مُہندس شاہی خطاب بتاتا ہے، اور یہی اس کا تخلص بھی ہے، اس کے بعد اپنے سب سے چھوٹے بھائی کا نام لیتا ہے،

ثالثِ آن ہرسہ بہادر بسال　　آمدہ نوراللہ صاحب کمال

پھر کہتا ہے کہ ہم تینوں بھائی معمار اور انجنیر ہیں،

ما ہمہ معمار و عمارت گریم　　ما ہمہ استاد و سخن پروریم

اس کے بعد اپنے چھوٹے بھائی نوراللہ کی نظم و نثر کی تعریف کرتا ہے، اور تعمیری مہارات فن کی بنا پر معمار کا موروثی لقب اسی کے لئے مخصوص کرتا ہے،

لیک بود قصر کلامش عجب | زان شدہ معمار مرا ور القب
گرچہ کم است سال وی از سال من | بیش بود حال وی از حال من
نثر وی از نظم گہر بار تر | نظم ز نثر آمدہ ہموار تر
دیدہ ز نور سخنش پر ضیا | طبع ز لطف سخنش پر صفا
گنج ہنر آمدہ در مشت او | ہفت قلم راندہ سہ انگشت او
گرچہ منم بے سخن استاد فن | آن یک و این یک بود استاد من

اسی آخری شعر کا شاید یہ مطلب ہے کہ مین سب سے چھوٹے بھائی کا استاد ہون، اور بڑا بھائی میرا استاد ہے، اس مثنوی کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے،

گرچہ مرا ہست مہندس لقب | ہندسہ زان ہر سہ برادر طلب

اس سے ثابت ہوا کہ ہندسہ اور عمارت گری کے فن مین یہ تینون بھائی مہارت رکھتے تھے،

الغرض احمد معمار کے ان تین باکمال بیٹون کے نام بہ ترتیب یہ ہیں،

۱- عطاء اللہ رشیدی نادر العصر،
۲- لطف اللہ مہندس،
۳- نور اللہ معمار

افسوس ہے کہ ان تین بھائیون مین سے اب تک جو کچھ ہم کو معلوم ہے وہ صرف بڑے اور منجھلے کے متعلق، اور سب سے چھوٹے نور اللہ معمار کے حال پر معلومات کی کوئی مزید روشنی نہیں پڑتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے باپ احمد معمار کی طرح صرف معماری رہا اور اسی سلئے معمار کے لقب سے وہ ممتاز ہے، وہ کسی کتاب کا مصنف نہیں ہے، باقی دو بھائی مختلف کتب ریاضی کے مصنف ہیں،

عطاء اللہ رشیدی

عطاء اللہ رشیدی کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ علم حساب مین دو کتابون کا مصنف ہے، جن مین سے ایک کا نام بیج گنت اور دوسرے کا نام خلاصۂ راز ہے، بیج گنت سنسکرت کا لفظ ہے" وبجا گنیتا" جس کے معنی علم جبر و مقابلہ کے ہین، یہ سنسکرت مین بھاسکر اچاریا کی تصنیف ہے، عطاء اللہ نے فارسی مین اس کا ترجمہ کیا، اس کتاب کے نسخے برٹش میوزیم اور میونک یونیورسٹی اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی لائبریریون مین ہین۔ اس مین مصنف اپنا نام "عطاء اللہ رشیدی بن احمد نادر" بتاتا ہے، رسالہ کا آغاز اس شعر سے ہے،

اوّل زستایشِ الٰہی گویم پس نعت رسول ادکماہی گویم

یہ شعر میرے خیال مین فیضی کے جواب مین ہے، فیضی نے سنسکرت کی حساب کی مشہور کتاب لیلاوتی کا جو ترجمہ اکبر کے زمانہ مین کیا ہے اس کے آغاز مین یہ شعر لکھا ہے، جو سراسر خوشامد ہے،

اوّل زثنای بادشاہی گویم وانگہ زستایشِ الٰہی گویم

رشیدی نے گویا اس کے جواب مین لکھا ہے،

اوّل زستایش الٰہی گویم پس نعت رسول ادکماہی گویم

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتبخانہ کا نسخہ (۵ ریاضی) میری نظر سے گذرا ہے اس کے دیباچہ مین ہے، :-

اما بعد می گوید بندۂ محتاج بخداوند قادر، عطاء اللہ رشیدی ابن احمد نادر کہ بتوفیق الٰہی در سنہ اربع و اربعین و الف ہجری مطابق ہشتم سال جلوس حضرت صاحب قرانی برادرنگ سلطنت وجہان بانی، کتاب جبر و مقابلہ بہندوی موسوم بہ بیج گنت تصنیف بھاسکراچارج صاحب لیلاوتی را کہ در علم حساب کشافی است بحقائق رائقہ و مفتاحے است بدقائق فائقہ

و محتویست بر فوائد بند، و مطالب ارجمند، کہ در لیلاوتی مذکور نیست، و در ہیچ نسخۂ فارسی و عربی مسطور نہ، از زبان ہندی بفارسی آوردم، و دیباچۂ کتاب را بکتابۂ دعائے دولت حضرت خاقانی، وارثِ ملکِ سلیمانی، مرتقی مدارجِ عز و جلال . . . . ابوالمظفر شہاب الدین محمّد صاحب قرانِ ثانی، شاہجہان نامی بادشاہ غازی . . . . . .

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب جو لیلاوتی کے مصنف بھاسکر اچاریہ کی دوسری کتاب کا ترجمہ ہے شاہجہان کے آٹھوین سالِ جلوس ۱۰۴۴ھ مین مکمل ہوئی ہے۔ برٹش میوزیم اور میونک یونیورسٹی کی لائبریریون کی فہرستون مین اس نسخہ کا مختصر حال درج ہے۔ کتبخانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن مین بدر الحساب کے نام سے بیج گنت کا ایک ترجمہ مذکور ہے، کتابت کا سال ۱۱۰۰ھ ہے، مگر مترجم کا نام نہین لکھا ہے معلوم نہین یہی عطاء اللہ رشیدی کا ترجمہ ہے، یا کوئی اور۔ کتبخانہ مین اس نسخہ کا ع ۱۸۲ (ریاضیات فارسی) ہے۔

عطاء اللہ رشیدی کی دوسری کتاب خلاصہ راز کا نسخہ برٹش میوزیم کے کتبخانہ مین ہے، اس مین اوس نے اپنا نام یہ لکھا ہے۔ "عطاء اللہ بن استاد احمد معمار" اس کا آغاز اس شعر سے ہے،

شکر بے حد بواحدِ ازلی   حمد بے حد بفردِ لم یزلی

رسالہ کا موضوع حساب، مساحت اور جبر و مقابلہ ہے، زبان فارسی نثر ہے اور رسالہ کی تقسیم دس بابون پر ہے، رسالہ کے دیباچہ مین شاہجہان بادشاہ اور شاہزادہ داراشکوہ کی ستایش ہے، اور رسالہ شاہزادہ کے نام سے معنون ہے۔ داراشکوہ کا قتل ۱۰۶۷ھ مین وقوع مین آیا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ

رسالہ اس تاریخ سے پہلے تالیف پاچکا تھا،

عطاء اللہ رشیدی جیسا کہ اس کے بھائی لطف اللہ نے اپنی مثنوی مین لکھا ہے شاعر بھی تھا۔ اور رشیدی تخلص کرتا تھا، مگر اوس کا کوئی شعر ہم تک نہین پہنچا ہے، بجز اس کے لطف اللہ کے ہاتھ کی ایک کتاب صور صوفی کا جو اصل نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری مین ہے اس کے آخر مین ایک صفحہ پر عطاء اللہ کے قلم کی ایک نثر ہے، جس مین آفتاب اور سہا کے تناسب سے کچھ فقرے لکھے ہین، اور آخر مین یہ شعر درج ہے،

عطاء اللہ کہ گر ناکس نہ ہیچ ز غیرت ہیچ افتد در خم و پیچ

لطف اللہ مہندس

احمد معمار کے دوسرے بیٹے لطف اللہ مہندس کی اس وقت متعدد یادگارین دنیا مین باقی ہین، اور کہنا چاہیئے کہ یہی وہ سپوت ہے جس کے ذریعہ اس کے باپ کا نام دنیا کو معلوم ہو سکا، سندیلوی نے اپنے تذکرہ مخزن الغرائب مین جو سنہ ۱۲۱۸ھ کی تصنیف ہے مہندس کے بیٹے امام الدین ریاضی کے تحت مین مہندس کا ذکر ان لفظون مین کیا ہے،

"مولوی لطف اللہ مہندس بودہ است، ایشان ہم بگفتن اشعار میل تمام داشتند، و مہندس تخلص میکردند، و در علم ریاضی مثل این ہر دو پدر و پسر در بلاد ہند نبودہ اند" (نسخۂ قلمی دار المصنفین صـ ۱۵۳)

اور سفینۂ خوشگو مین ہے،

"خلف ملا لطف اللہ مہندس تخلص لاہوریست کہ قلعۂ ارک و دار الخلافۃ شاہجہان آباد تجویز و صوابدید او بنا یافتہ"

یہی فقرہ حسین قلی خان کے نشتر عشق مین ہے،

اس کی چھ تصنیفات کے نام ہم کو معلوم ہو سکے ہیں، جن کے نسخے اس وقت ہندوستان اور یورپ کے کتبخانوں میں موجود ہیں، لیکن ان تصانیف کے علاوہ اس کی عجیب و غریب یادگار اس کا ایک آہنی کتبہ ہے جو سلاطین مالوہ کے پایہ تخت مانڈو میں وہان کے مشہور بادشاہ ہوشنگ غوری (۸۰۸ھ — ۸۳۸ھ) کے مقبرہ کے دروازہ کے داہنے ہاتھ پر لگا ہوا ہے، یہ ۷ انچ لمبا اور ۴½ چوڑا کتبہ ہے، جس میں بخط خفی حسب ذیل عبارت چار سطروں میں منقوش ہے۔

۱۔ بتاریخ نہم ربیع الثانی سنہ ہزار و ہفتاد ہجری،

۲۔ فقیر حقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار شاہجہانی،

۳۔ و خواجہ جادو رائے و استاد شیورام و استاد حامد،

۴۔ بجہت زیارت آمدہ بود،

اثریاتِ ہند کے ماہر جناب ظفر حسن صاحب بی۔ اے (محکمۂ آثار قدیمہ ہند) نے مانڈو کے کتبات پر انگریزی میں جو مقالہ لکھا ہے، موصوف نے اس میں یہ کتبہ سترہوین پلیٹ پر چھاپ دیا ہے، اور وہ اس وقت میرے سامنے ہے، غالباً ان معمار سیاحون کے لئے اس کتبہ کے یہان لگانے کا محرک یہ امر ہوا ہے کہ یہان اکبر بادشاہ نے اپنے سفر و گذر کی تاریخین ثبت کرائی ہین انہین کو دیکھ کر ان معمارون نے بھی اپنا یادگاری کتبہ لگا دیا ہے،

اس کتبہ سے متعدد باتون پر روشنی پڑتی ہے،

۱۔ اس عہد کے استادان تعمیر دوسری عمارتون کو بھی فن کی حیثیت سے دیکھنے کے لئے جایا کرتے تھے،

۲- ہندو مسلمان باکمالوں میں فن کی یکجہتی کا رشتہ خاصہ مستحکم اور مضبوط تھا،

۳- ہندو شاہی معماروں کے ساتھ خواجہ اور استاد کا بولنا کیسا عام تھا، خواجہ جادو رائے اور استاد شیو رام کیسی کیسی عزت کے الفاظ تھے،

۴- لطف اللہ مہندس گو شاعر و مصنف تھا تاہم اس میں اس کے موروثی فن تعمیر کا ذوق اتنا تھا کہ وہ دوسرے معماروں کے ساتھ کسی عمارت کے دیکھنے کے لئے سفر کی زحمت گوارا کر سکتا تھا،

لطف اللہ کی جن چھ کتابوں کے نام ہم کو ملے ہیں وہ حسب ذیل ہیں،

۱- صُوَرِ صوفی،

۲- رسالہ خواص اعداد،

۳- شرحِ خلاصۃ الحساب،

۴- منتخبُ الحساب،

۵- تذکرۂ آسمان سخن،

۶- دیوانِ مُہندس،

پہلی کتاب ہیئت میں اور بعد کے تین رسالے علم حساب میں، اور دوسری کو چھوڑ کر وہ عربی میں ہے، بقیہ پانچ کی زبان فارسی ہے، جن میں سے تین اوّل الذکر نثر میں ہیں اور آخری دو نظم میں، اب ذیل میں ہم ہر ایک تصنیف پر مختصر تبصرہ کرتے ہیں،

۱- صُوَرِ صُوفی مشہور مسلمان ہیئت دان عبد الرحمٰن الصوفی المتوفی ۳۷۶ھ نے ستاروں کے اشکال و صُوَر پر جو بلند پایہ تصنیف صُوَرُ الکواکب کے نام سے لکھی تھی، لطف اللہ نے ۱۰۵۰ھ میں اپنے باپ احمد معمار کے حکم سے اس کا

فارسی مین ترجمہ کیا' اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کی عمر کا پہلا کام ہے کہ اس کا دیباچہ کسی بادشاہ کے نام کے بجائے خود اس کے باپ کے نام نامی سے مزین ہے، اور اس مین نوجوان مصنف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی محنت کا بہترین صلہ یہ ہے کہ اس کا باپ اس کے اس کام کو دیکھ کر خوش ہو اس کتاب کا اصل مسودہ جو خود لطف اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہے مسلم یونیورسٹی لائبریری (۱۰۳ فارسی علوم) مین موجود ہے' دیباچہ کی عبارت یہ ہے'

"زخشندہ ترین کواکبی کہ از مشرق طبع بر فلک ظہور آمد حمد مبدعی و شکر مخترعی ....

اما بعد چنین گوید محتاج الی اللہ القادر الغفار' لطف اللہ بن احمد النادر المعمار' مد اللہ ظلہ' علی رؤس الاولاد' بحرمۃ النبی و آلہ الامجاد کہ چون اشارۂ آنحضرت بسوی این فقیر حقیر شد کہ کتاب عمدۃ الاسلام قدوۃ الانام مولانا عبد الرحمٰن ابن صوفی افاض اللہ علیہ شآبیب الغفران واسکنہ فرادیس الجنان کہ در معرفت نجوم ثابتہ کتابیست معتد' و رسالہ ایست کافیہ بحیث عموم فائدۂ کلام' و سہولت فہم مرام' بعبارت فارسی سادہ ترجمہ کردہ آید' تا بر ترغیب خاطر فارسی خوانان حقیقت طلب باعث تر شود' کمر اطاعت بر میان جان بستہ' دست را بنوشتن نگارین کرد' امید کہ با این سجیۂ مرضیۂ من در عقبیٰ ماجور' و ترجمۂ من در دنیا مقبول باشد' و طالبان این فن ازین ترجمہ مستفید شوند' چنانکہ از اصل این' و اگر خطائے باشد اصلاح فرمایند' الحمد للہ والمنۃ کہ در فرصتے اندک بگی بوجہ احسن و شائستہ میسر شد' و سنۃ یکہزار و پنجاہ ہجری اتمام پذیرفت' اما احسن و شایستہ تر وقتی کہ از نظر مبارک والد بزرگوار من بگذرد و بعین عنایت و چشم مکرمت نگاہ کنند و قبول فرمایند"

خاتمہ کی عبارت :-

.... ہزار در ہزار حمد ایزد داور کہ ترجمۂ کتاب صور صوفی حسب الحکم قبلۂ صورت

ومعنی، کعبۂ ظاہر و باطن، خداوند حقیقت و مجاز، ابویم المسمی باحمد المخاطب بنادر العصر سلّمہ اللہ تعالیٰ من بلیات الزمان و آفات الدہر بآخر رسید و اتمام پذیرفت،

بقلم شکستہ رقم لطف اللہ کہ مؤلف این رسالۂ و مترجم این مقالہ است کتاب باتمام رسید، الحمد للہ علی نعمائہ والصلوٰۃ علی انبیائہ لاسیما علی محمد و آلہ واصحابہ اجمعین، واغفرلی ولوالدی بحرمتہم یا ارحم الراحمین،

کتاب کے آخری صفحہ پر آفتاب اور سہا کی مناسبت سے کچھ فقرے مشق کئے گئے ہین اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی یادگار کے طور پر اس کو گھر کے ارکان نے محفوظ رکھا تھا، یہ مشق میرے خیال مین اس کے بھائی عطاء اللہ کے قلم سے ہے کہ آخر مین ایک شعر مین جو اوپر عطاء اللہ کے حال مین نقل کیا جاچکا ہے اس کا نام لکھا ہے،

۲۔ رسالۂ خواصِ اَعْداد یہ فارسی مین علم حساب پر سات صفحون کا رسالہ ہے، اور چار مقالون پر منقسم ہے، اس مین اعداد کے خواص اور قیمتون پر بحث کی گئی ہے، اس کا نسخہ برٹش میوزیم کے کتبخانہ مین ایک مجموعہ کے اندر ہے، جس مین دو رسالے لطف اللہ کے ہین اور تیسرا عطاء اللہ کا وہی خلاصۂ راز ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا (ع۱۶۷۴) اس کا آغاز یہ ہے،

"الحمد للہ ...... میگوید فقیر لطف اللہ متخلص بمہندس"،

۳۔ شرحِ خلاصۃ الحساب علم حساب مین بہاؤ الدین محمد بن حسین عاملی المتوفی سنہ ۱۰۳۰ھ کی مشہور عربی تصنیف خلاصۃ الحساب کی ممزوج شرح ہے، اوس کی شرحین متعدد علماء نے لکھی ہین، جن مین خود اس کے معاصر عصمۃ اللہ سہارنپوری کی عربی شرح جو سنہ ۱۰۸۷ھ مین لکھی گئی ہے بہت مفصل ہے،

اور چھپ بھی چکی ہے، اور جس کا نام انوار خلاصۃ الحساب ہے، دوسری یہ لطف اللہ مہندس کی ہے، اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتبخانہ مین ہے (ع۷۶۱ مخطوطات عربی) اس مین مصنف کا نام لطف اللہ المتخلص بالمھندس ابن الاستاذ احمد المعمار لکھا ہے اور اس کا آغاز ان لفظون سے ہے، الحمد للہ الواحد الفرد الصمد، یہ نسخہ ایک خاص حیثیت سے ممتاز ہے جس کا ذکر آگے آئیگا، اس کتاب کا دوسرا نسخہ ہندوستان مین رامپور کے کتبخانہ مین ہے (ع۴۵ ریاضی) اس نسخہ کے صفحات کی تعداد ایک سو بیس ہے۔

۴۔ منتخب یہ بہاء الدین عاملی کی مذکورۂ بالا تصنیف خلاصۃ الحساب کا فارسی ترجمہ اور خلاصہ ہے، انگلستان اور ہندوستان مین اس کے متعدد نسخے ہین، دو نسخے انڈیا آفس کے کتبخانہ مین ہین، تیسرا برٹش میوزیم لائبریری مین، چوتھا کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد دکن مین[1]، پانچوان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مین، اور چھٹا جامعہ ملیہ دہلی مین ہے، اس رسالہ کا منتخب نام تاریخی ہے، اس سے ۱۰۹۲ھ کی تاریخ نکلتی ہے مقدمہ مین لکھا ہے کہ یہ کتاب خاندان وزارت کے رکن رکین میر محمد سعید بن میر محمد یحییٰ کی فرمائش سے لکھی گئی ہے،

اس کا آغاز اور دیباچہ حسب ذیل ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، اما بعد می گوید فقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد

[1] برٹش میوزیم کے نسخہ کا ع۱۶۷۴۴ اور انڈیا آفس کے نسخہ کا ع۲۲۵۳ اور ع۲۲۵۴ اور آصفیہ باب ریاضیات فارسی ۲۱۱ ہے،

احمد معمار لاہوری غفراللہ لہ ولوالدیہ و احسن الیہما والیہ کہ کتاب حساب را کہ تصنیف است از محقق وتحریر مدقق شیخ بہار محمد بن حسین عاملی است (؟) رحمۃ اللہ علیہ مشتمل بر قواعد شریفہ وفوائد لطیفہ باشارات خلاصۂ دودمان سیادت منتخب خاندان وزارت میر محمد سعید بن میر محمد یحیی ادام اللہ اقبالہ وضاعف اجلالہ ترجمہ کردم کہ چون این نسخہ خلاصہ نام داشت این نسخہ را منتخب نہادم . . . . تمام تاریخ تالیف این رسالہ است و این رسالہ بنا بر ترتیب کتاب مرتب است بر مقدمہ و ابواب'

آخر مین ایک حسابی مسئلہ کا حل نظم مین ہے، جس کا خاتمہ ان دو شعرون پر ہے ؎

منکہ ہستم فقیر لطف اللہ بہ ہندس شہیر در افواہ
خاکپائے ہنروران کبار پور استاد احمد معمار

انڈیا آفس لائبریری کا نسخہ نمبری ع ۲۲۵۴/۵ ۳ شعبان ۱۱۴۵ھ کا لکھا ہوا ہے' اور حیدر آبادی نسخہ کی تاریخ ۱۲۴۳ھ ہے، اور کتب خانہ مین اس کا ع ۱۱۲ ریاضیات فارسی ہے، مسلم یونیورسٹی کا نسخہ سبحان اللہ خان لائبریری مین ہے اس کا ع ۱۱/۵ ہے، اور وہان اوس کا نام ترجمہ خلاصۃ الحساب ہے اور کتابت کا سال ۱۲۳۹ھ ہے، جامعۂ ملیہ کے نسخہ کا ع ۶ سلسلہ مخطوطات ہے، اور تاریخ سے خالی ہے'

۵- آسمانِ سخن

دولت شاہ سمرقندی کا فارسی شعرا کا تذکرہ جو ۸۹۲ھ مین تالیف پایا ہے' با این ہمہ اغلاط دلچسپ ضرور ہے اور اسی لئے اہلِ سخن کی محفلون مین اس کا تذکرہ رہا کیا ہے' دولت شاہ کا تذکرہ فارسی نثر مین ہے، اور سات طبقون پر منقسم ہے' اکبر کے زمانہ مین فائضی کرمانی

نام ایک شاعر نے اس کو نظم کر ڈالا، اور سات طبقون کے بجائے اوس کو دس طبقون مین مکمل کیا، لطف اللہ مہندس نے فائضی کے نسخہ مین دو اور طبقون کا اضافہ کر کے اوس کو ۱۲ طبقون مین پورا کر دیا، اور بارہ برجون کی مناسبت سے اوس کا نام "آسمانِ سخن" رکھا، یہ تمام واقعات لطف اللہ مہندس نے اس کتاب کے دیباچہ مین ذکر کیے ہین،

اس کتاب کا نسخہ شاہِ اودھ کے کتبخانہ مین تھا، ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتبخانہ کی فہرست مین اس کتاب کا صفحہ ۱۱۶ پر ذکر کیا ہے، اب کسی اور کتبخانہ مین اس کا نشان نہیں ملتا، معلوم نہین گردش چرخ نے اِس آسمانِ سخن کو کس خاک مین ملا دیا، لطف اللہ مہندس کے اس اضافہ مین کل ۲۵۰ بیتین ایک ایک بیت مین ایک ایک شاعر کا بیان تھا، اس کا پہلا شعر یہ تھا،

نخست شکر خدای کہ آسمانِ سخن بیافرید محیط نہ آسمان کہن

فہرست مذکور مین ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کے بارھوین طبقہ کے ۱۳ شعر نقل کئے ہین، ان شعرون مین شاہجہانی شعراء کے نام نظم کئے گئے ہین اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے دورِ اکبری کے بعد جو دو طبقے بڑھائے تھے، ان مین سے پہلے مین جہانگیری عہد کے اور بارھوین مین شاہجہان کے زمانے کے سخنورون کے نام ہونگے وہ ۱۳ شعر یہ ہین،

وحید دہر امانیؔ بن مہابت خان ولے بجا نزمان است شہرۂ دوران
دگر یگانہ ظفر خان تخلص احسن ربودہ گوی سخن از سخنوران در فن
دگر وحیدِ زمن آشنا عنایت خان بود بہجر سخن آشنا عنایت خان
دگر وحیدِ زمن شادمان غنم پرور بیانِ شادی وغم در کلامِ او مضمر
دگر سخنورِ کشمیر محسن فانی است بقای نام وی از دولتِ سخندانی است
مہِ سپہرِ سیادت یگانہ میر عماد کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد

لبیب عصر محمد حسین آشوب است | سخنوری کہ سخنہاش جملہ مرغوب است
دگر وحید زمان است طالبائے کلیم | کہ شعر اُو ید بیضا است نزد طبع سلیم
دگر فرید جہان قدسی محمد خان | بعہد شاہجہان گو ربودہ از اقران
الٰہی ہمدانی است در سخن استاد | سخنورے است کہ داد سخنوری می داد
لبیب از منہ امّی نخواند ہیچ کتاب | ز فیض حق شدہ مفتوح بر رخش صد باب
دگر وحید زمن باقیا تراز آزاد | خوش است ہیچ غزلہائے عاشقانہ او
فصیح از منہ فتحا کہ چون غزل می گفت | چو عندلیب غزلخوان در وگہری سفت

نوین شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ نے یہ دادِ سخن عہد شاہجہانی (۱۰۶۸ھ) کے بعد دی ہے،

۶ - دیوانِ مُہندس یہ پورا دیوان چھوٹی تقطیع کے چھیانوے صفحون مین ہے، سب سے پہلے دیوان کے شروع مین دس صفحون مین چار قصیدے ہین، پہلا نعت مین ہے، دوسرا دارا شکوہ کی، اور تیسرا شاید دارا شکوہ کے بیٹے سلیمان کی مدح مین ہے، اور چوتھا، کسی معشوق کا سراپا ہے، اس کے بعد نئی بسم اللہ سے غزلین شروع ہوتی ہین، جو حروف تہجی پر مرتب ہین، یہ گیارھوین صفحہ سے شروع ہوکر صفحہ ۸۷ پر تمام ہوتی ہین، پھر نئی بسم اللہ سے وہ مثنوی شروع ہوتی ہے جس مین اس نے اپنے خاندان کا احوال لکھا ہے، پھر ایک دو مختصر مثنویان اور چند قطعے ہین جن مین سے دو چار قطعے تاریخی ہین،

پہلے نعتیہ قصیدہ کی تشبیب بہت پُرزور ہے،

خسروِ مہر چو بنشست بر اورنگِ عمل | رستمِ روز در اقلیم سب افگند خلل

رومی روز برافراختہ رایت بمصاف | زنگی شب سپر انداختہ ہنگام جدل
کیمیا ساز نبود است گر این عامل روز | مس شب را بزر روز چرا کردہ بدل
روز افزودۂ و شب کاستہ آرزوی کہ مہر | کردہ آئینۂ ایام ولیالی صیقل
سنگ از تربیت مہر شود لعل و کنون | اخگر از تربیتش لعل شود در منقل
وقت آنست کہ در قافلہ از فیض بہار | آب زمزم شود اکنون نمی باب بدل
وقت آنست کہ واعظ چو نہد مجلس وعظ | صورت شیشہ شود نسخۂ واعظ بہ بغل

اس قصیدہ کے آخر مین شاعر نے اپنا اور اپنے باپ کا نام اور اپنے مشاغل تدرس وتدریس کا ذکر کیا ہے،

دل دانائی مرا فخر بعلم است و بفضل | جاہل است آنکہ بنازد بحلی و حلل
باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم | جہل ازین علم تو بہتر کہ نیاید بعمل
عمر در درس بسر بردی و در آخر کار | ہیچ حاصل نشد از مدرسہ جز بحث و جدل

دارا شکوہ کے مدحیہ قصیدہ مین اپنی مدح خود ان شعرون مین کرتا ہے،

مہندسم کہ کنم صورت فلک تصویر | کشم بروی زمین گر خطوط پرکاری
چنان بلند نہادم اساس قصر خرد | کہ بر سپہر زنم طعنۂ نگونساری
چنان منیر شود شبہۂ عمارت من | کہ نور مہر بود نزد نور او ناری
دمی کہ من بعمارت گری شوم مشغول | ملک مصالح کار آورد بسر باری
بدستیاری لطف شہ بلند اقبال | بلند پایہ زمن گشت قدر معماری
سپہر مرتبہ دارا شکوہ دریا دل | کہ ہمچو ابر کفش می کند گہرباری
بعہد دولت تو راجہ ہای کوہستان | ز فرق خویش نہادہ کلاہ جباری

بیک نگاہ کہ کردی بسوئی کوہستان گرفتہ پست و بلندی کوہ ہمواری

ان اشعار مین جن واقعات کی طرف اشارہ گیا ہے،

لطف اللہ مہندس کے اکثر اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نام و نمود کا حریص اور معماری جیسے پیشہ سے اپنے کو بلند سمجھتا ہے، چنانچہ اس قصیدہ مین وہ کہتا ہے،

شہا اگرچہ عمارت گریست پیشۂ من وگرچہ نیست ضمیرم ازین ہنر عاری

کنون کہ ملک دلم شد خراب عشق بتان تو خود بگو کہ چہ نسبت مرا بمعماری

غزلون کا عام انداز وہی ہے، جو اس عہد کے دوسرے ملا شاعرون کے کلام مین ہے، زبان مین کہین کہین ہندیت ہے، اس کے مقطعون مین خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس مین مہندس کی نسبت سے کوئی بات ضرور پیدا کرتا ہے، مثلاً

مہندس گرچہ آگہ بود زین پیش فرامش کرد قانون شفا را

باشد ز فلک مہندس آگاہ باآنکہ نشستہ بر زمین است

ای مہ بے مہر در چشم مہندس بے رخت از حضیض خاک تا اوج ثریا آتش است

رو مہندس بعلم یکدو سہ شکل این ہمہ افتخار بے معنی است

ای مہندس روکہ در علم نظر احتیاج مسطر و پرکار نیست

ہان حرف زمین بگو مہندس   تا کے ز فلک کنی حکایت

از مہندس مپرس سرِّ فلک   کین معما ز ہیچ کس نکشود

ایک مقطع مین اس مہندس کے لفظ سے کتنا لطیف استدلال کیا ہے،

در حقِّ من گمانِ خطائی بری خطاست   ہرگز شنیدۂ کہ مہندس خطا کند

تا بکے شکلِ زمین خواہی کشید   رو مہندس صورت افلاک کش

کہنہ شد آسمان مہندسِ خیز   تا بنا ہائے نو نہادہ شود

حسب ذیل غزل اس کے بہترین کلامون مین سے ہے،

یاران ہلالِ عید بر آمد نظر کنید   ماہِ صیام رفت مغان را خبر کنید

یاران دگر بگوری مفتی و محتسب   امروز خاک میکدہ کحل بصر کنید

آن کس کہ از بر آمدن مہ خبر کند   اورا باحترام دہن پر شکر کنید

اکنون رسید کوکبۂ عیش و انبساط   ای درد و غم ز مملکت دل سفر کنید

گر در من و نگار مہندس شود حجاب   دستش گرفتہ زود ز محفل بدر کنید

ذیل مین اس کے دیوان کے وہ اشعار نقل کئے جاتے ہین جن سے اس کے کچھ حالات معلوم ہوتے ہین، اس کا نام

باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم   جہل ازین علم تو بہتر کہ نباید بعمل

خواہم کہ کشم بادہ چو لطف اللہ احمد   تا چند کشم محنت دورِ قمری را

ہمچو لطف اللہ احمد کوس دانش می زدم — چون شدم عاشق بجہل خویش کردم اعتراف

ان شعرون مین لطف اللہ اس کا، اور احمد اس کے باپ کا نام ہے، لاہور اس کا وطن تھا،

کے بود آمدن قاصد فرخندہ پیام — مدتے شد کہ ز لاہور نیامد خبرے

ہندسہ و منطق و حکمت مین اوس کو غلو تھا،

بر من ہیچمدان کشف شد از فیض ازل — راز سربستہ کہ بر ہندسہ دان مشکل بود

صرف در منطق و حکمت شدہ این عمر عزیز — لیک آن نکتہ نخواندم کہ درو حاصل بود

معماری و ہندسی مین نامور تھا،

لطف اللہ معمار مہندس شدہ اُستاد — گر کار درایت نکند پس چہ کند کس

درس و تدریس کا بھی شغل تھا،

عمر در درس بسر بردی و در آخر کار — ہیچ حاصل نشد از مدرسہ جز بحث و جدل

کسی شاہزادہ کے نام ایک مثنوی ہے جس سے مراد غالباً داراشکوہ ہے، کہ "شہزادۂ بلند اقبال" کے نام سے وہی مخاطب تھا، اس مین وہ کہتا ہے،

لطف شہ می کند مددگاری — ورنہ آگہ نیم ز معماری

خواندہ ام یک دو نسخہ از ہر باب — ہیئت و ہندسہ و نجوم و حساب

نہ نویسم ز بیم بے ادبی — کہ چہا خواندہ ام من از عربی

. . . .

لطف شہزادۂ بلند اقبال — گر شود بندہ را معاون حال

خدمت بندہ را بقصر باید — کہ ازو علم رفتہ باز آید

جنوبی ہند کا قدیم طرزِ حکومت

یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس ملک کا قدیم طرز حکومت کیسا تھا۔ جہاں تک قدیم روایات، کہانیوں، کتبوں اور سیاحوں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے دورِ تمدن میں ایک ایسی حکومت قایم تھی جسکو ہم حکومت خود اختیاری سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔

راجہ حکومت کا مختار کل ہوتا تھا۔ مگر اس کے اختیارات ملکی قانون کی رو سے بالکل محدود تھے۔ وہ کبھی اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کبھی راجہ ان کے مقررہ اختیارات سے تجاوز کرتا تھا تو ملک میں بغاوت اور تخت سے اسکی معزولی یقینی تھی۔ کوتیسلیا ارتھا شاستر راجہ ایک قدیم کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے :-

"راجہ کو بذاتِ خود ملک کے حالات کا مشاہدہ کرنا چاہئے۔ اور یہ دیکھنا چاہئے کہ رعایا اس کے افسروں سے خوش ہے یا ناخوش۔ اور افسر رعایا سے کس قسم کا سلوک کرتے ہیں۔ اگر کسی مقام پر رعایا اور افسر میں نا اتفاقی ہو تو راجہ کو چاہئے کہ رعایا کی طرفداری کرے۔ اگر رعایا میں ایک سو آدمی اس افسر کے خلاف ہیں تو اس کو معزول کرتے ہوئے دوسرا افسر مقرر کرنا چاہئے۔"

(آرین رول ان انڈیا۔ دکن اور جنوبی ہند صفحہ ۲۳۲)

رعایا کے آرام و آسائش، حفاظت اور حکومت سے اچھے تعلقات قایم کرنے کے لئے ملک میں ایسا طرز حکومت قایم تھا جس کو بارا بلوتی کہا جاتا ہے :-

مورخ رئیس لکھتا ہے :-

" بارا بلوتی کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ اس لئے کہ قدیم زمانے میں کسی شہر کی آبادی پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ حکومت خود احتیاط کرتی تھی۔ کہ شہروں کی آبادی پانچہزار سے بڑھنے نہ پائے "

رئیس نے بارا بلوتی کی تشریح اس طرح کی ہے :-

" (۱) گاؤں کا حاکم۔ جس کو گوڈا۔ پٹیل یا رڈی کہا جاتا ہے

(۲) شانبھوگ یا کرنم۔ جسکے متعلق گاؤں کی زمینات اور لگان کا حساب کتاب تھا

(۳) تلاری۔ وہ شخص جو گاؤں کی نگہبانی کرتا تھا۔ (یہی شخص رڈی اور کرنم کا چپراسی بھی تھا)

(۴) نیرگنٹی۔ اسکے ذمہ نالابوں یا نہروں کی حفاظت اور کھیتوں کو پانی کی فراہمی تھی۔

(۵) حجام (۶) بڑھئی (۷) کمہار (۸) دھوبی (۹) لوہار۔

(۱۰) نجومی (۱۱) چمار (۱۲) سنار "

مذکورۂ بالا بارہ آدمیوں سے پہلے چار کو حکومت سے براہ راست تعلق رہتا تھا۔ باقی آٹھ کو صرف گاؤں والوں سے تعلقات تھے۔ اور ہر گاؤں میں انکا رہنا ضروری تھا۔ کتاب قدیم ہندوستان (Ancient India) کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۱۷۳ پر لکھتا ہے

" حکومت کی زیادہ تر آمدنی لگان سے تھی۔ جو پیداوار کا ۱/۶ حصہ تھا "

دو قدیم کتابیں جن کا نام " سکوانیتی اور کوٹلیا ارتھا شاستر " ہیں۔ ان میں اس قدیم زمانے کی طرز حکومت پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کتابوں میں شہروں اور

دیہات کی طرز تعمیر کے متعلق لکھا گیا ہے کہ شہر اور قصبے کے درمیان تعلق رکھنے کے لئے کشادہ راستے بنائے جاتے تھے۔ جہاں کہیں دریا یا ندی درمیان میں حائل ہو۔ پل تعمیر کئے جاتے تھے۔ راستوں کی تعمیر کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ درمیان میں اونچے اور دونوں بازو ڈھلوان ہوتے تھے۔ کہ بارش کا پانی جم نہ سکے۔ ان راستوں کی مرمت حکومت کے ذمہ تھی۔ ہر دو گاؤں یا شہروں کے درمیان ایک مسافر خانہ ہوتا تھا۔ جہاں مسافروں کے نام و پتہ لکھ لئے جاتے تھے۔

شاہی فوج کو حکم تھا۔ کہ دیہات کے قرب و جوار میں نہ رہے۔ بادشاہ کے افسر اور اس کے ملازموں کو بھی تاکید تھی کہ دیہاتیوں کے مہمان نہ رہیں۔ اور انکے معاملات میں دخل نہ دیں۔ کسی سپاہی کو بغیر شاہی پروانے کے دیہات کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

راجہ پر لازم تھا کہ سال میں ایک دفعہ شہروں اور دیہات کا معائنہ کرے۔ اور دریافت کرے کہ رعایا اس کی حکومت سے راضی ہے یا نہیں۔ جب کبھی سرکاری ملازم اور دیہاتیوں کا معاملہ راجہ کے آگے پیش ہو تو راجہ کو چاہئے کہ اپنے افسروں کی طرفداری نہ کرے۔ سرکاری افسر کو جس کے خلاف ایک سو آدمی شہادت دیں۔ ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گاؤں کے حاکم کو جو راجہ کا نائب ہوتا تھا۔ لازم تھا کہ چوروں، رہزنوں اور عمال اِن حکومت کے ظلم و ستم سے رعایا کو محفوظ رکھے۔ حاکم ایسا شخص ہونا چاہئے۔ جس کو حکومت کرنے کا نشہ نہو"۔

ٹیکسوں کے متعلق لکھا گیا ہے :-

"راجہ کو اپنی رعایا پر اس قدر ٹکس لگانا چاہئے گویا ان کے گلے میں پھول کا

ایک بار ڈالا جا رہا ہے۔

راجہ کو کبھی اپنی ہی رائے پر کام نہیں کرنا چاہئے اس کو اکثریت کی رائے کا خیال کرنا ضروری ہے۔ پبلک کی رائے بادشاہ کی رائے سے زیادہ وقعت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ جو رسی مختلف دھاگوں سے بنتی ہے۔ وہ اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ شیر کو مقید کر سکے۔

راجہ کا زبانی حکم قانون نہیں بن سکتا۔ جو راجہ بغیر تدبر کے صرف زبانی احکام دے اور جو افسر بغیر تحریری حکم کے عمل کرتا ہے۔ دونوں چور ہیں جب تک راجہ کے حکم پر سرکاری مہر نہ ہو وہ حکم قابل تعمیل نہیں ہو سکتا۔"

(آرین رول ان انڈیا صفحہ ۲۲۲ ـ ۲۲۵)

یہی مصنف لکھتا ہے :-

"دیہات کی پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ بہت زبردست اختیارات رکھتی تھی۔ اگرچہ ٹیکس کی ادائگی کے معاملات میں وہ حکومت کی تابع تھی۔ لیکن زمین پر اور زمین کا لگان حاصل کرنے کیلئے اس کو کامل اختیارات تھے۔

سوائے اس زمین کے جو راجہ کی ملکیت تھی یا ایسی زمین جو مندروں کے نام وقف تھی۔ باقی تمام زمین مجلس شوریٰ کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ زمین کی تقسیم اسی مجلس کے ہاتھ میں تھی۔ صرف متنازعہ معاملات میں راجہ یا اس کے نائب دخل دے سکتے تھے۔" (صفحہ ۲۲۴)

دیہات کی مجلس شوریٰ اگر اپنے فرائض اچھے طور پر بجا نہ لاتی تھی۔ تو ملک کی بڑی مجلس دخل دیکر ملزموں کو جرمانہ کی سزا دیتی تھی راجہ کو بھی

اختیار تھا کہ اگر انتظام خراب ہو تو ملازموں کو جرمانہ کرے۔ یا اور کوئی سزا دے۔ (صفحہ ۲۲۹)

جنوبی ہند کے حالات آرین حملوں کے بعد

اوپر جن خاندانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب کے سب اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب جنوب میں آرین قوم آباد ہو چکی تھی۔ اگر ڈریوڈین قوم کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ تو اس آرین زمانے کے حالات پر بھی اسی طرح تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ یہاں بھی واقعات پر اسی طرح مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ جس سے صحیح اور اصلی حالات معلوم نہیں ہوتے۔ یہ مغربی مورخین کا نہایت احسان ہے کہ انہوں نے کم از کم کتبوں سے سنہ اور خاندانوں کے نام اور کچھ حالات معلوم کر لیے ہیں۔ اس ملک کی صحیح تاریخ اس زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ جب مسلمان پہلے پہل اس ملک میں آئے۔ (یعنی ۱۳۱۰ء سے) اس سے پہلے اس ملک کا تمدن۔ طرز حکومت، معاشرت، تجارت وغیرہ کے حالات کیلئے ہم ان سیاحوں کے ممنون ہیں جو اس ملک میں اُس زمانے میں آئے، ہوئے تھے۔ اور اپنے سفرناموں میں کچھ لکھ دئے تھے۔

عرب سیاحوں کے علاوہ غیر ملکی سیاح جو اس ملک میں آئے۔ ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ چینی سیاح ہیونگ شیانگ، یونانی سیاح میگس تھینس، اور بطلیموس۔ اطالوی سیاح پلینی اور ابرین۔ پرتگالی سیاح مارکو پولو۔ (Marcopolo)

(نوٹ:۔ مسلمان سیاحوں کے نام علیحدہ باب میں دئے گئے ہیں)

اطالوی سیاح پلینی لکھتا ہے :-

"...مصر سے ساحل ملیبار تک جہازات دو مہینے دس دن میں پہونچ جاتے ہیں۔

مزرس (ملیبار میں مغربی ساحل پر) اور پوہار (مشرقی ساحل پر) اس زمانے میں

بہت بارونق بندرگاہیں ہیں۔ یہاں سے رومی جہازوں پر ہندوستان کی اجناس

لادی جاتی ہیں۔ رومۃ الکبریٰ ہر سال ساڑھے پانچ کروڑ سٹرس (رومی سکے)

ہندوستان کے مال پر صرف کرتا ہے۔ یہ رقم روم والے اپنی تفریح اور عورتوں

کے بناؤ سنگار پر صرف کرتے ہیں۔ پہلی اور دوسری مسیحی صدیوں میں رومی

باشندوں کی بہت بڑی تعداد ان بندرگاہوں میں آکر آباد ہوگئی تھی۔ اور

مزرس میں ان لوگوں نے قیصر آگسٹس (Augustus) کے نام سے ایک

عالیشان کلیسا بھی تعمیر کیا تھا۔"

اس زمانہ میں زیادہ ترین چیزیں رومہ کو جاتی تھیں۔ ہینے کالی مرچ۔ موتی اور پنا (موتی اب بھی جنوب کے سمندروں میں ٹناولی کے قریب ملتا ہے پنا زمرد کی قسم کا ایک قیمتی پتھر ہے۔ اس کی کانیں ضلع کوئمبتور۔ اننت پور اور کرنول میں پائی جاتی ہیں)

(نوٹ :- رومہ کی تاریخ سے پایا جاتا ہے کہ یہ تجارت پہلے مصریوں اور عربوں کے ہاتھ میں تھی۔ رومیوں کو جنوبی ہند کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ حضرت مسیح سے بیس سال پہلے۔ قیصر آگسٹس کے زمانے میں رومیوں نے مصر کو فتح کرلیا۔ اور اس وقت سے رومیوں کی آمدورفت جنوبی ہند میں شروع ہوگئی اور یہ سلسلہ کم وبیش ڈھائی سو سال تک جاری رہا۔ جس کے بعد پھر یہ تجارت عربوں کے ہاتھ میں آگئی اور اس وقت تک رہی۔ جب تک پرتگیز اس ملک میں نہیں آئے۔)

ایک اور مصنف پٹرونیس لکھتا ہے :-

"فیشن زدہ رومن عورتیں آج کل اپنے بناؤ سنگار اور نمائش کیلئے ایک ایسا مہین کپڑا استعمال کرتی ہیں۔ جس کو ہوا کا جال کہا جاتا ہے۔"

(نوٹ :۔ مصنف کی مراد ہوا کی جال سے ہندوستان کی نفیس و باریک ململ یا ڈھاکہ کی "آبِ واں" ہوا کرتی تھی۔)

کتاب پری پلس کا مصنف لکھتا ہے :۔

"کالی مرچ، موتی، ہاتھی دانت، صندل، ہیرے، لعل اور صدف بندرگاہ مزرس میں ملتے ہیں۔"

دی بگننگس آف ساؤتھ انڈین ہسٹری کا مصنف صفحہ ۱۲۹ پر لکھتا ہے :۔

"چولا خاندان کا پایۂ تخت چوہار مشرقی ساحل پر تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا یہاں کی منڈی میں ہر قسم کا مال ملتا تھا۔"

بندرگاہ ٹونڈی (جو موجودہ رامناد کے قرب و جوار میں تھا) کے متعلق یہی مصنف لکھتا ہے :۔

"اس بندرگاہ میں علاوہ اور سامان تجارت کے اگھیر (جو ایک قسم کی سیاہ خوشبودار لکڑی ہے) ریشم، کافور، مصری، صندل، نمک وغیرہ ملتے تھے۔"

اطالوی سیّاح اسٹرابو نے لکھا ہے :۔

"پانڈیا خاندان کے ایک راجہ نے جناب مسیح سے تیس سال پہلے اپنا ایک سفیر رومی قیصر اگسٹس کے دربار میں بھیجا تھا۔"

یونانی سیّاح میگس تھینس لکھتا ہے :۔ (یہ سیاح تین سو سال قبل مسیح جنوبی ہند میں آیا ہوا تھا)

"یہاں ملک کی حکومت پانچ طبقوں میں منقسم ہے۔

اول ۔ پنچایت جو ملک کے امن کی ضامن ہے۔

دوم - مذہبی پیشوا جن کے ذمہ مذہبی تہوار اور مندروں کا انتظام ہے

سوم - طبیب جو ملک کی صحت وصفائی کے نگران ہیں -

چہارم - منجم - جو آئندہ ہونے والے واقعات کی پیشینگوئی کرنے کے علاوہ شاہی جشنوں، تہواروں اور شادی بیاہ کی تاریخ مقرر کرتے ہیں -

پنجم - راجہ کے وہ ملازم جو حکومت کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں -

سیاح مارکوپولو لکھتا ہے :- (یہ سیاح ۱۲۹۱ء میں یعنے مسلمانوں کے پہلے حملے سے چالیس سال پہلے جنوبی ہند میں آیا تھا)

" سب سے عجیب وغریب بات یہ ہے کہ اس ملک میں فقیر سے لیکر امیر تک ننگے رہتے ہیں - یہاں تک کہ بادشاہ بھی جس کے گلے میں اس قدر قیمتی جواہرات کے ہار ہیں جن کی قیمت سے ایک سلطنت خریدی جا سکتی ہے - سوائے ایک دھوتی کے اور کچھ نہیں پہنتا - جنوبی ہند کے اکثر راجاؤں کی حرم میں پانچ سو سے زیادہ عورتیں اور بہت سے بچے ہیں - راجہ کی حفاظت خاص طور پر ان لوگوں کے ذمہ ہے جو قسم کھا کر زندگی اور موت میں اسکے شریک ہوتے ہیں - یہاں کے لوگ زیادہ تر نباتات پر گذر کرتے ہیں - ملیبار کے لوگ تجارت کیلئے بہت مشہور ہیں - اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائشی تاجر ہیں - ملیبار کے سوا ملک کے دوسرے حصوں میں تمام تجارت ویسیا (ویش) قوم کے ہاتھ میں ہے - ہر جگہ سونے کی افراط ہے - اور یہ سونا بھی مختلف مقامات میں زمین سے نکالا جاتا ہے - ہیرے بھی گولکنڈہ اور اس کے نواح میں ملتے ہیں - ملک میں ہر جگہ ململ اور دوسرے قیمتی کپڑے بنائے

جاتے ہیں۔ مدورا اور سیلون کے قریب دریا سے موتی نکالے جاتے ہیں۔
ان چیزوں کے علاوہ کالی مرچ۔ سونٹھ اور دوسرے گرم مسالے، تیل
اور دوسرے رنگ غیر ممالک کو بھیجے جاتے ہیں۔ اور ان کے عوض چین کا
ریشم، یونان و مصر کی سوغات اور ایران و عرب کے قالین و گھوڑے یہاں
آکر فروخت ہوتے ہیں۔ ان میں جو تجارت سب سے ممتاز ہے وہ گھوڑوں
کی تجارت ہے۔ اس لئے کہ گھوڑے اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے اور اگر
کہیں ہوتے ہیں تو اس قدر جفاکش اور تیز رفتار نہیں ہوتے۔ جس قدر
عرب و ایران کے گھوڑے ہیں۔ اس لئے ملک میں ہر جگہ ان کی منڈیاں
ہیں۔ اور عرب و ایران کے لوگ اس تجارت سے خوب نفع اٹھاتے ہیں۔"

مسلمان مورخ وصاف لکھتا ہے :۔

"جنوبی ہند کا ملک کولم سے لیکر شمال میں نلور تک تین سو فرسخ کے طول
میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے حکمرانوں کو "دیورا" کہتے ہیں۔ چین
ماچین اور ہند و سندھ کی سوغات جہازوں میں بھری ہوئی یہاں آتی
ہیں۔ خلیج ایران کے جزائر، عراق و خراساں، روم اور یوروپ کے تحائف
معبر کی منڈیوں میں ملتی ہیں۔ معبر ہند کی کنجی ہے" (معبر سے مراد ساحل کورومنڈل ہے)

ایک اور جگہ یہی مورخ لکھتا ہے :۔

" اس جگہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ساحل ہے۔ سمندر کے کناروں میں
سے قدیم اور جدید نادر اشیا سے پُر اور جنس جنس کے خزانوں اور گرانمایہ
جواہروں اور عمدہ سامانوں اور گرانقدر برگزیدہ متاعوں کی کثرت سے

بے مثال کاریگری کی قدرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس علاقہ کے اطراف و جوانب عود اور قرنفل کی خوشبو سے مہکتے ہیں۔ اور گرد و نواح کے علاقے طوطیوں کی زبان سے چہکتے ہیں۔" (تاریخ وصاف ترجمۂ جناب محمد علی صاحب ایم۔اے)

اسلامی مورّخ و سیّاح

وصاف کے علاوہ جن مسلمان مورخوں و سیاحوں کی کتابوں میں اس ملک کا ذکر پایا جاتا ہے۔ ان کی تعداد سولہ ہے۔ ان میں چار بغداد کے باشندے تھے۔ چار اندلس کے۔ چار ایران کے اور چار خالص عربی النسل تھے۔ ان میں سب سے پہلے جنوبی ہند کا تذکرہ جس مورخ کی تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ وہ ابن خرداذبہ کی کتاب ہے۔ جو ۸۴۲ء میں لکھی گئی۔ اس میں اس نے ان تجارتی راستوں اور مقامات کا ذکر کیا ہے۔ جو جنوبی ہند اور عرب و ایران کے درمیان تھے۔ دوسرا مورخ بھی عجمی النسل ہے۔ جس کا نام ابوزید حسن ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ تاجر سلیمان کی زبانی لکھا ہے۔ جس نے ایک سے زیادہ مرتبہ ایران چھوڑ کر جنوبی ہند ہوتا ہوا چین تک سفر کیا تھا۔ مورخ مسعودی نے اپنی کتاب ۹۴۳ء میں لکھی تھی۔ اس میں اس نے مالدیپ اور جزیرۂ سیلون کا ذکر کرتا ہوا یہاں کے باشندوں کے مذہب، اوضاع و اطوار پر بحث کی ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں مشہور عربی سیّاح ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی یہاں آیا تھا۔ اور اس نے نہایت تفصیل سے یہاں کے حالات لکھے ہیں۔ ۱۱۵۲ء میں مشہور جغرافیہ دان ادریسی جو جزیرۂ سسلی کا باشندہ تھا۔ اپنی کتاب لکھی۔ اس کے بعد ۱۱۷۹ء میں یاقوت اور ۱۲۶۳ء میں قزوینی نے اپنی کتابوں میں اس ملک کے حالات لکھے ہیں۔

سنہ ۱۳۲۱ء میں ابوالفدا نے یہاں کے حالات لکھے تھے۔ لیکن اس نے یہ حالات ابن سعید کے سفرنامہ سے لئے ہیں۔ جو سنے سنائے ہیں۔ تیرھویں صدی میں وصاف اور رشید الدین نے یہاں کے جغرافیہ اور تاریخ کا کچھ ذکر کیا ہے۔ سب سے زیادہ جس شخص نے یہاں کا حال لکھا وہ سیاح ابن بطوطہ ہے۔ جو ملک مراقش کے شہر تنجیر میں سنہ ۱۳۰۴ء میں پیدا ہوا اور جس نے شہر فیض میں سنہ ۱۳۷۷ء میں انتقال کیا۔ اس نے اپنے سیاحت نامہ میں اس ملک کے اس قدر حالات لکھے ہیں۔ کہ دوسری کتابوں میں اس قدر وضاحت سے حالات نہیں ملتے۔ ابن بطوطہ عرصہ تک اس ملک میں سیاحت کرتا رہا۔ گو اسی زمانے میں ہندوستان میں بھی مسلمان مورخ پیدا ہو چکے تھے۔ جیسے امیر خسرو وغیرہ۔ سولھویں صدی عیسوی میں سیدی علی قلبی ترکی امیرالبحر نے اپنی کتاب میں ہندوستان کی بندرگاہوں اور مشہور شہروں کا ذکر کیا ہے۔ سیدی علی بحری راستے دریافت کرنے اور معلومات حاصل کرنے کیلئے آیا تھا۔ اور واپس جاکر اس نے اپنی کتاب "محیط" لکھی۔ اس کتاب کی تدوین میں اس نے مشہور ماہر بحر احمد ابن مجید سے مدد لی تھی۔ اور آج یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ پرتگال والوں نے اسی احمد ابن مجید کی مدد سے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا تھا۔ پرتگالی امیرالبحر واسکوڈی گاما جس نے مغربی قوموں میں سب سے پہلے ساحل ہند پر قدم رکھا۔ وہ احمد بن مجید کا شاگرد تھا۔

جنوبی ہند میں اسلام

جنوبی ہند میں اسلام کی اشاعت کے بیان سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس ملک میں یہودیت اور عیسائیت کا تذکرہ بھی کر دیا جائے۔ جو اسلام سے پہلے اس ملک میں اپنے لئے

جگہ پیدا کر چکے تھے۔

یہ لکھا جا چکا ہے کہ نامعلوم زمانہ سے مصر، عراق و عرب کی تجارت جنوبی ہند سے ہو رہی تھی۔ ان ممالک میں جب یہودیت کا آغاز ہوا تو ان تاجروں کے ذریعہ یہودیت جنوبی ہند میں آئی۔ ملیبار، کوچین اور ٹراونکور میں یہودیت کا آغاز انہیں تاجروں سے ہوا۔

مذاہب عالم کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں جانتے ہیں کہ جب شام میں عیسائیت کا آغاز ہوا تو یہودیت سے اس کا تصادم ہوا۔

ریورنڈ سیل لکھتا ہے:۔

"ایک زمانے تک دونوں مذہبوں کے پیرو ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ ان لڑائیوں میں مسیحی غالب رہے۔ اور انہوں نے یہودیوں پر طرح طرح کے ظلم کئے جن سے بچنے کے لئے بہت سے یہودی عراق، شام و عرب سے نکل کر ملیبار اور ٹراونکور کے ساحل پر آکر سکونت پذیر ہو گئے۔"

"تاریخ ابوالفدات معلوم ہوتا ہے کہ" شالیات اور سنگل جو ملیبار کے دو شہر تھے ان میں خالص یمن کی یہودی نوآبادی تھی۔"

(نوٹ :۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مذہب کو یہاں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ یہودی ملک میں بالکل قلیل تعداد میں ہیں)

یہودیت کے بعد ملک میں عیسائیت کا رواج بھی انہیں تاجروں سے ہوا۔ جو مصر و عرب، عراق و شام سے آتے تھے۔ اور انہوں نے بھی یہودیوں کے پہلو بہ پہلو اپنی نوآبادیات قایم کیں۔ اور یہی عیسائی شریانی عیسائی کہلاتے ہیں۔ عیسوی مذہب کو بہ نسبت یہودی مذہب کے بہت زیادہ کامیابی ہوئی۔ اور شاید اس کا سبب یہ ہو کہ مسیحیوں نے ملک شام وغیرہ

میں اپنی حکومتیں قایم کرکے تمام تجارت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اور باقاعدہ تبلیغ کا انتظام کررکھا تھا۔ مسیحی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ کی غرض سے سنٹ تھامس (St Thomas) نے ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ وہ بندرگاہ مزرس (کرنگا نور) پر جہاز سے اترا۔ اور یہاں اشاعتِ دین کا کام کرتا رہا۔ اس نے ملیبار اور ٹراونکور میں آٹھ کلیسا مندرجہ ذیل مقامات پر تعمیر کیے۔

کرنگا نور، کولم، پارور اپلی پورم، کوکامنگلم، نیرانم اور نیل کل۔ یہاں سے فارغ ہوکر وہ مشرقی ساحل پر آیا۔ اور ایک پہاڑ پر اس نے سکونت اختیار کی۔ یہی وہ پہاڑی ہے جس کو سنٹ تھامس مونٹ (St Thomas Mount) کہا جاتا ہے۔ جس کو مقامی طور پر پلے وارم بھی کہتے ہیں۔ یہ مقام مدراس سے قریباً پانچ میل پر ہے۔

قدیم عیسائیوں یا یہودیوں نے ملکی جھگڑوں اور لڑائیوں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس لیے تاریخ میں انکا تذکرہ بالکل نہیں ہے۔ مسیحیت کا تذکرہ پھر ملک میں اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب مغربی قومیں تجارت کے لیے آئیں۔

عیسوی مذہب کے چھ سو سال بعد ملک عرب میں مذہب اسلام کا ظہور ہوا۔ عربوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اور وہی عرب تاجر جو پہلے بت پرست وغیرہ رہکر تجارت کرتے تھے۔ اب مسلمان ہوکر تجارت کرنے لگے۔

نامعلوم زمانے سے تیرہویں صدی تک جس قدر حالات مل چکے ہیں۔ ان کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی کسی جگہ لکھا گیا ہے کہ مسلمان سنہ ۱۳۱۰ء میں جنوبی ہند پر حملہ آور ہوے تھے۔ لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ اس سے پہلے جنوبی ہند مسلمانوں سے قطعی ناواقف تھا۔ یا جنوبی ہند میں اسلام کی بنیاد اسی حملہ سے پڑی۔

دنیا میں یہودیت اور عیسائیت کے بعد مذہب اسلام آیا۔ اسلام لانے سے پہلے عرب قریباً سب کے سب بت پرست تھے۔ اس زمانے میں عرب کی تجارت بہت وسیع پیمانہ پر تھی۔ ان کے جہاز بندرگاہ بصرہ اور ساحل حضرموت ویمن سے چین ماچین تک آیا جایا کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد عرب تاجر تجارت کیلئے جن جن علاقوں میں پہونچے۔ وہاں اسلام کی آواز کو بھی پہونچایا۔ چنانچہ جنوبی ہند میں اسلام پہلے پہل انہی لوگوں کی مقدس کوششوں سے پھیلا ہے ۹۵ھ میں خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانے میں بہت سے عرب تاجر جزیرۂ سیلون میں آکر آباد ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں مسلمان تاجروں نے اپنی ایک نوآبادی ملیبار میں بھی قائم کرلی حال میں جو قدیم کتبے ملے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہند کے راجاؤں نے ان عربوں سے تجارتی تعلقات رکھنے کیلئے انہیں ہر قسم کی مراعات دے رکھی تھیں۔ اور یہ تجارت ان بندرگاہوں میں ہوتی تھی۔ جو معبر (کورومنڈل) اور ملیبار کے ساحل پر تھے۔ مشرقی ساحل پر متوپلی (موجودہ مچھلی بندر کے قریب) اور جنوب میں بندرگاہ کایل۔ اس تجارت کے لئے بہت مشہور تھے۔ مغربی ساحل پر بھٹکل۔ کالی کٹ اور کولم وغیرہ میں تجارت کی بہت بڑی بڑی منڈیاں تھیں۔

ان تجارتی تعلقات کا دوسرا ثبوت تاریخ وصاف سے بھی ملتا ہے۔ وصاف لکھتا ہے:۔

"اس بندرگاہ کایل اور ملیبار کے دوسرے بندرگاہوں کو دس ہزار گھوڑے فروخت کے لئے بھیجے گئے۔ ان میں چودہ سو گھوڑے خاص ملک الاسلام جمال الدین مرزبان فارس کے ہیں۔ ہر گھوڑے کی قیمت ۲۲۰ دینار سرخ ملتی ہے۔ اگر کوئی گھوڑا راستہ میں مرجائے تو اس کی قیمت بھی ثبوت ملنے پر ادا کردیا تھا۔ اس وقت معبر میں ملک الاسلام جمال الدین کا مختار (ایجنٹ) اس کا ایک

رشتہ دار بھائی تقی الدین عبدالرحمٰن بن محمد الطیبی عرف مرزبان نامی ہے

تقی الدین بندرگاہ کایل میں رہتا ہے۔ اور اس کی نگرانی میں فتن اور مالی فتن

کی منڈیاں بھی ہیں"

فتن اور مالی فتن کے متعلق مورخ یول لکھتا ہے۔ کہ ان شہروں کو موجودہ زمانے میں دیوی پٹن اور مرکیار پٹن کہتے ہیں۔

یول اپنی تاریخ ہند میں لکھتا ہے:۔

"ملک الاسلام جمال الدین کے ایجنٹ تقی الدین عبدالرحمٰن کا انتقال ۱۳۰۳ء میں ہوا۔ رشید الدین جس نے وصاف کا ترجمہ کیا ہے۔ ایک اور عرب تاجر جمال الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جمال الدین اس ملک کے راجہ کا وزیر بھی تھا"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں صرف ایک جمال الدین کا خاندان نہیں۔ بلکہ کئی عرب خاندان آباد تھے۔ اور ان عربوں کا راجاؤں کے دربار میں خاصہ اقتدار تھا۔ لیکن کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس زمانے میں عرب مسلمان کسی راجہ کے وزیر ہوئے ہوں۔ رشید الدین کی تحریر کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ عرب تاجر درباروں میں کافی رسوخ رکھتے تھے اور راجہ ان سے وقتِ ضرورت مشورہ لیتے تھے۔ اس لئے ممکن ہے کہ لوگوں نے انہیں بھی وزیر مشہور کر دیا ہو۔

وصاف سے پہلے بھی عرب و ایران کے مورخین نے اپنی کتابوں میں جنوبی ہند کا ذکر کیا ہے۔

۱۳۱۰ء میں مسلمانوں کا پہلا حملہ ہوا تھا۔ اس حملے کے بعد اسلامی مورخین یا سیاحوں نے جو کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں بھی مسلمانوں کا ذکر ہے۔ جو اس ملک میں پہلے سے آباد تھے۔

امیر خسرو نے لکھا ہے :-

"ملک الاسلام (کافور) نے جب مقام کنہ ور (کنانور۔ ضلع ترچناپلی) میں راجہ بیر کا تعاقب کیا تو یہاں اس کو چند مسلمان ملے۔ جو ہندوؤں کی رعایاؤں میں تھے یہ لوگ صرف نیم مسلمان تھے۔ اور سوائے کلمہ کے دوسرے شعائر اسلام سے بالکل ناواقف تھے۔ ملک الاسلام نے انکی جان بخشی کی۔ یہ قتل کے مستوجب تھے۔ لیکن ملک نے صرف ان کے مسلمان کہلانے کے باعث انکی جان بخشی کی"۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ مغربی اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے :-

" راجہ بلال دیو (حاکم دھورسمند۔ میسور) کے پاس بیس ہزار مسلمانوں کی فوج تھی۔ جن میں زیادہ تر جنگی قیدی اور غلام تھے"۔ (صفحہ ۳۵۸)

یہی سیاح کوکن اور میبار کے متعلق لکھتا ہے :-

" شہر ہنور (کوکن) کے باشندے شافعی مذہب رکھتے ہیں۔ وہ دیندار۔ نیک بخت اور بحری طاقت کے لئے مشہور ہیں۔ سنداپور فتح ہونے کے بعد زمانہ نے انہیں خوار کر دیا تھا۔ اس شہر کے عابدوں میں شیخ محمد ناگوری ہیں۔ انہوں نے میری دعوت اپنی خانقاہ میں کی۔ اس شہر کی عورتیں اور کل اس ساحل کی عورتیں سیا ہوا کپڑا نہیں پہنتیں۔ بلکہ بے سلا ہوا کپڑا پہنتی ہیں۔ یہ عورتیں خوب صورت اور باعفت ہوتی ہیں۔ ناک میں سونے کا بُلاق پہنتی ہیں۔ اور یہ انکی خصوصیت ہے کہ سب حافظ قرآن ہوتی ہیں۔ یہ لوگ فقط تجارت بحری سے گذارہ کرتے ہیں۔ زراعت نہیں کرتے۔ یہاں کا بادشاہ سلطان جمال الدین ہے۔ ملیبار کے لوگ بھی اس کو خراج دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کے پاس بحری طاقت بہت بڑی

ہے اور چھ ہزار پیادہ اور سوار بھی رکھتا ہے۔ یہ بادشاہ جمال الدین محمد بن حسن بڑا نیک بخت اور پارسا ہے۔ وہ ایک ہندو راجہ ہریب (ہری ہر) کے ماتحت ہے۔ یہاں کے لوگوں کی غذا چاول ہے"

(ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ از مولوی محمد حسین صاحب ایم۔ اے صفحہ ۲۸۹)

ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں ملک کنارا۔ ملیبار اور ٹراونکور کے بہت سے شہروں کا ذکر آیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں۔ اور مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ اور فاکنور (برکور) میں جامع مسجد اور بدپتن میں چار مسجدیں تھیں۔

(نوٹ:- فاکنور ضلع شمالی کنارا میں واقع ہے۔ اور بدپتن موجودہ کالی کٹ سے سولہ میل پر تھا)

ملیبار کی تاریخ دیکھی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ملیبار کی یہ مسجدیں جن کا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ہے۔ پہلی صدی ہجری میں تعمیر ہوئی تھیں۔ ان مساجد کو شرف بن مالک اور ان کے بھتیجے مالک بن حبیب نے تعمیر کیا۔ یہ بزرگ اپنے اہل و عیال کے ساتھ عرب کو چھوڑ کر ملیبار میں آکر آباد ہوئے۔ یہ پہلی اسلامی نوآبادی تھی جو مغربی ساحل پر ہوئی۔ ان عربوں نے ساحل ملیبار پر نو مقامات پر مساجد تعمیر کیں۔ کدن کلور (موجودہ کرنگا نور) کولم، ہیلی ماراوی جرفتن۔ وہ فتن، تندرینا (موجودہ کالیکٹ) چالیات (موجودہ چالیام) فاکنور (موجودہ برکور) منجرور (موجودہ منگلور) ابن بطوطہ نے ان تمام مقامات کا اپنے سفرنامہ میں ذکر کیا ہے۔

ملیبار کی تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ چیرا خاندان کا آخری راجہ چیرومن پرومال جس کو عربی میں سامری لکھا گیا ہے۔ اسلام قبول کر لیا تھا۔ امپیریل گزیٹیر میں لکھا ہے کہ راجہ چیرومن پرومال ۲۵ راگست ۸۲۵ء مطابق ۲۱۰ھ میں بعزم سفر ملیبار سے روانہ ہوا۔ ۸۲۷ء میں ساحل عرب پر پہونچا۔ اس کے چار سال بعد اس کا انتقال ہوا۔

شیخ زین الدین معبری مصنف تحفۃ المجاہدین (جو ملیبار کی اسلامی تاریخ ہے) نے جنوبی ہند اور خصوصاً ملیبار میں اشاعت اسلام کے اسباب اس طرح بیان کئے ہیں ۔

"ملیبار کے ہندوں میں رسم و رواج کی بندشیں اور ذات پات کی پابندیاں مدت سے قایم تھیں ۔ اگر اعلےٰ ذات کا کوئی آدمی کسی ادنیٰ ذات کے آدمی سے چھوجاتا یا حد مقررہ سے قریب ہو جاتا تو غسل کئے بغیر کھانا کھانا اسے جائز نہیں ہے ۔ اگر بغیر غسل کے کھالیتا ہے تو اپنی ذات سے باہر ہوجاتا ہے ۔ ادنیٰ ذات والوں کا پکایا ہوا کھانا اعلےٰ ذات والوں کے لئے منع ہے ۔ اگر اعلےٰ ذات کا مرد کسی ادنیٰ ذات کی عورت سے شادی کرتا ہے ۔ یا کسی اعلیٰ ذات کی عورت کے ساتھ کسی ادنیٰ ذات کے مرد کی شادی ہو جاتی ۔ تو اعلیٰ ذات والا اپنی ذات سے خارج ہو جاتا ہے ۔"

(نوٹ)۔ شیخ زین الدین معبری ۹۱۱ھ مطابق ۱۳ ر شعبان ۹۳۸ھ پنجشنبہ کے روز کوچین میں پیدا ہوئے ۔ اور ۱۰ ر شعبان ۹۲۸ھ کو انتقال فرمایا ۔ آپ کا مزار شہر فنان میں ہے جو کلی کٹ کے جنوب میں ہے ۔ آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کی تھیں ۔ جن میں تحفۃ المجاہدین جو ملیبار کی تاریخ ہے ۔ بہت مشہور ہے)

تھیونو (Thevenot) سیاح نے بھی لکھا ہے کہ "ملیبار میں دو قومیں آباد ہیں ۔ ایک نائر اور دوسرے پولئے ۔ اگر کوئی نائر کسی پولئے کے اس قدر قریب ہو جائے کہ اس کا سانس اس تک پہونچ سکے تو نائر سمجھتا ہے کہ وہ ناپاک ہو گیا ۔ اور مجبوراً اس پولئے کو قتل کر دیتا ہے ۔ اگر وہ نائر اس پولئے کو قتل نہ کرے اور راجہ کو معلوم ہو جائے تو راجہ نائر کو مروا دیتا ہے ۔ جب کبھی پولئے گھروں سے باہر کھیتوں میں نکلتے ہیں تو اس اتفاق سے بچنے کے لئے متواتر "پولو" پکارتے ہیں ۔ کہ نائر موجود ہوں تو ہٹ جائے ۔ اور جب نائر اس آواز کو سن لیتا ہے تو

چلا کر کو کو کہہ دیتا ہے۔ اس سے پولیا سمجھ لیتا ہے کہ یہاں کوئی نائر موجود ہے۔ اور وہ راستہ چھوڑ کر دُور ہٹ جاتا ہے۔"

ادنیٰ ذات کے لوگ گاؤں کے اندر جوتیاں پہن کر داخل نہیں ہو سکتے۔ انکی عورتوں کو اپنی ساڑی کا پلو دائیں ہاتھ کی طرف چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ ساڑی کا پلو دائیں طرف صرف اعلیٰ ذات کی ہندو عورتیں چھوڑ سکتی ہیں۔ ملیبار میں یہ بھی رواج ہے کہ نیچ ذات کی عورتیں اپنا سر اور سینہ اونچی ذات والوں کے آگے چھپا نہیں سکتیں۔ اس لئے یہ عورتیں صرف ایک کپڑا سینہ سے نیچے باندھتی ہیں۔

رسم و رواج کی پابندی اور ذلت کے احساس نے جہاں جنوبی ہند کی چند ادنٰے قوم والوں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ وہاں ان کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ذات کے ہندوں نے بھی اسلام قبول کیا۔ جب رسم و رواج کے خلاف کوئی فعل ہوتا تھا تو بدنامی سے بچنے کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ مذہب تبدیل کر لیا جائے۔

اس کے متعلق کتاب ملیبار میں لکھا ہے:۔

"رسم و رواج کے خلاف نائر جب کسی فعل کے مرتکب ہوتے تو اس بدنامی سے بچنے کیلئے یا تو وطن چھوڑ کر ایسی جگہ چلے جاتے ہیں۔ جہاں ان سے کوئی واقف نہیں ہے۔ یا اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ پولیوں کے لئے بھی اس ذلت سے بچنے کا طریقہ صرف قبول اسلام ہے۔ یہ لوگ جب اسلام قبول کر لیتے ہیں تو انہیں مساوات کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے (صفحہ ۳۰)

لیکن دوسرے مورخین لکھتے ہیں:۔

"یہ اسلام کی حقانیت ہی تھی کہ دوسری قوموں کو اس مذہب کے قبول کرنے پر



آمادہ کی۔ اس کے علاوہ عرب کے مسلمان تاجر تجارت کے ساتھ۔ تبلیغ مذہب کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ ان تاجروں کے اخلاق۔ ان کی پاکبازی اور دیانت شعاری آہستہ آہستہ یہاں کے باشندوں کے دلوں میں گھر کر رہی تھی۔ اور یہی وہ چیزیں تھیں جو جنوب میں تبلیغ اسلام کا باعث بنیں۔ ان تجارتی تعلقات کی بنا پر صرف مالک بن حبیب کا خاندان بلکہ بہت سے عرب تاجر قبائل بھی جنوبی ہند میں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی اس سکونت اور میل جول کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں اور جنوبی ہند کی قوموں میں رشتہ داریاں پیدا ہو گئیں۔ ان عربوں نے یہاں شادیاں بھی کیں۔ اور کنیزیں بھی خریدیں۔ آج جنوبی ہند میں مسلمانوں کی جو مختلف قومیں علیحدہ علیحدہ ناموں سے نظر آتی ہیں۔ وہ اسی اختلاط کا نتیجہ ہے۔ ساحل ملیبار میں عربوں کی نسل موپلا کہلائی۔ کورومنڈل میں لبے اور مرکیار وغیرہ۔ انہیں عربوں کی اولاد ہیں۔ کوکن میں یہی لوگ نوائط کہلائے۔ ممکن ہے کہ ہر جگہ بعض ہندو خاندان اسلام کی صداقت سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے ہوں۔ اور بعد میں مسلمانوں سے رشتہ داری ہوئی ہو۔

جنوبی ہند کے اسلام کو اولیاء اللہ سے بھی بہت زیادہ تعلق ہے جو اس ملک میں خاص تبلیغ کی غرض سے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان میں حضرت نطہڑ ولی رحمۃ اللہ علیہ (ترچناپلی) اور آپ کے خلفا کو بہت امتیاز حاصل ہے۔ حضرت نطہڑ ولی رحمۃ اللہ علیہ کا اصلی نام خواجہ مظہر الدین ہے۔ آپ کے خلفاء میں حضرت بابا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ (پلگنڈہ) میں بہت مشہور رہیں۔

حملہ کیا جاتا ہے۔ وہ حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانے میں ہوا۔ اس فوج کی کمان حجاج کے بھتیجے محمد بن قاسم کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں کا یہ حملہ واقعی ایک کامیاب حملہ تھا جس کے نتیجہ کے طور پر تمام ملک سندھ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ لیکن حجاج کی وفات پر محمد بن قاسم کو دمشق بلا لیا گیا۔ اور فتوحات رک گئیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ان فتوحات کا رک جانا ایک نقصان عظیم تھا۔ اگر یہ فتوحات جاری رہتیں تو یقیناً آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ بنی امیہ کے بعد بنی عباس نے بھی ہندوستان پر کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ پھر جو کامیاب حملہ ہندوستان پر ہوا۔ وہ سلطان محمود غزنوی کا حملہ تھا۔ اس نے پنجاب یعنی ہندوستان کے دروازے پر قبضہ کر لیا۔ غزنی خاندان کے بعد غوری خاندان نے ان فتوحات کو اور وسیع کر دیا۔ دہلی، اجمیر اور قنوج کی راجدھانیاں مسلمانوں کے قبضہ میں آگئیں۔ غوری خاندان کے بعد خاندانِ غلاماں برسرِ حکومت ہوا۔ اور دہلی پایہ تخت بنی۔ اس طرح اب مسلمان بجائے افغانستان میں بیٹھے ہوئے حکومت کرنے کے خاص ہندوستان میں آکر ہندوستانی بن گئے۔ اور ان کی فتوحات روز بروز وسیع ہوتی رہیں

خاندانِ غلاماں کی حکومت کم و بیش اسّی سال تک رہی۔ اس کے بعد خلجی خاندان تخت نشین ہوا۔ اسی خاندان کے پہلے سلطان جلال الدین فیروز کے عہد میں اس کے بھتیجے علاؤالدین نے ۱۲۹۴ء میں دکن پر فوج کشی کی۔ اس حملہ کا حال مورخ ہیگ نے اپنی کتاب ہسٹارک لینڈ مارکس آف دی دکن (Historic Landmarks of the Deccan) میں اس طرح لکھا ہے:۔

"اسلامی فوج کی کمان سلطان جلال الدین فیروز کے بھتیجے علاؤالدین کے قبضہ میں تھی۔ علاؤالدین اس وقت کڑہ کا گورنر تھا۔ جو الہ آباد سے ۴۲ میل شمال

ان تحریروں سے یہ بات ظاہر ہے کہ اوائل اسلام ہی سے جنوبی ہند مسلمانوں سے واقف تھا۔ لیکن ملک میں ان کی حکومت نہیں تھی۔ یہ اگلے مسلمان صرف تجارت کرتے تھے۔ اس لئے ہندوستان کی بہت سی تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

مسلمان اور جنوبی ہند

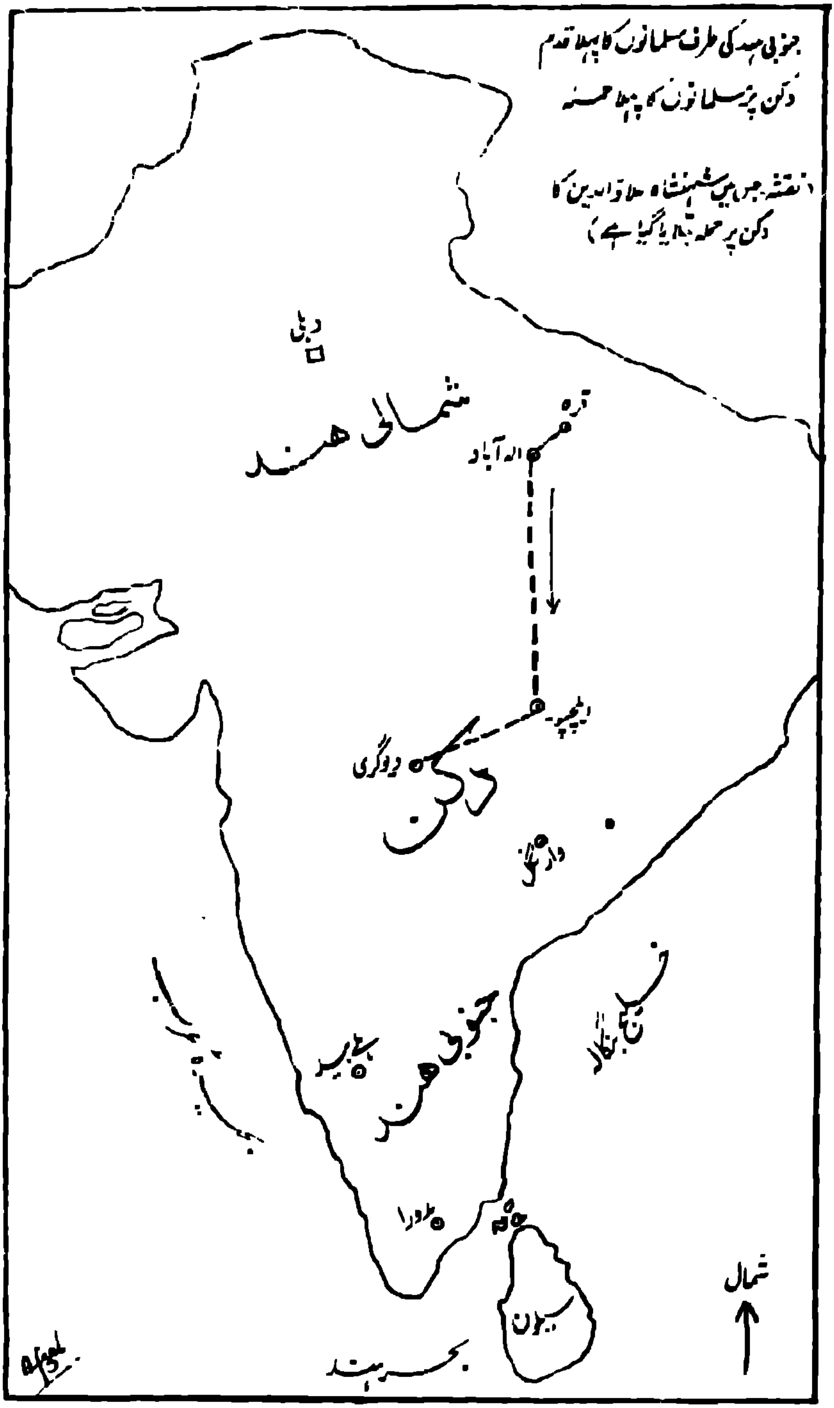
سیاسی تاریخ

تیرہویں صدی کا خاتمہ اور چودھویں صدی کی ابتدا جنوبی ہند کی تاریخ میں ایک نیا انقلاب لاتی ہے۔ اور یہ انقلاب ایک نئی قوم کے فاتحانہ حملہ سے ہوا۔ یہ نئی قوم مسلمان تھی۔ یہ ہم لکھ چکے ہیں کہ جنوبی ہند مسلمانوں سے نا واقف نہ تھا۔ مسلمان عرب تاجر ایک عرصہ سے یہاں رہتے تھے۔ مگر انہیں کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہ تھی۔ لیکن اب مسلمان ملک میں ایک دوسری صورت سے بھی داخل ہوئے۔ جنوبی ہند پر مسلمانوں کا پہلا حملہ سلطان علاؤالدین کے عہد میں ہوا۔ یہ حملہ کوئی اچانک حملہ نہیں تھا۔ مسلمان، ہند میں گویا قدم بقدم آئے، اور رفتہ رفتہ جنوبی ہند میں پہنچے۔ اس لئے یہاں ضروری ہے کہ تسلسل قایم رکھنے کے لئے یہ تحریر کیا جائے کہ مسلمان شمالی ہند میں کس طرح آئے۔ اور کس طرح قدم بقدم جنوب کی طرف بڑھے

اہل عرب کو اسلام قبول کرنے کے بعد قدرتی طور پر اپنے مذہب کی تبلیغ کا خیال پیدا ہوا چنانچہ ہندوستان پر عربوں کا سب سے پہلا حملہ خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوا۔ اس کے بعد حضرت علی نے بھی ایک مہم بھیجی۔ لیکن ان مہموں کو کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا حملہ جو ہندوستان کی تاریخ میں بلحاظ کامیابی پہلا

مشرق میں دریائے گنگا پر واقع ہے۔ شہر بھلسا کی فتح کے وقت اس نے دیوگیری کی شان وشوکت اور یہاں کی دولت وخزائن کا حال سنا۔ اس نے اسی وقت ارادہ کر لیا کہ اپنی فتوحات کو جنوب کی طرف وسیع کرے۔ کڑہ آکر علاؤالدین فوج کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ اور جس وقت تیاری مکمل ہو چکی تو ۱۲۹۴ء میں کڑہ سے نکلکر جنوب میں چندیری ہوتا ہوا ایلچ پور پہونچا۔ جو موجودہ وقت میں ضلع برار میں ہے۔ اسکے افسروں اور سپاہیوں کو تک یہ معلوم نہیں تھا کہ علاؤالدین کس مقصد سے اور کس ملک پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ایلچ پور پہونچکر علاؤالدین نے فوج کو آرام دیا اور یہاں مشہور کر دیا کہ وہ سلطنت دہلی کا ایک افسر ہے۔ اور شہنشاہ سے ناراض ہوکر جنوب میں تلنگانہ کے راجہ کے پاس ملازمت کیلئے جا رہا ہے۔ چند دن ستانے کے بعد یکایک شب میں علاؤالدین نے اپنی فوج کو ایلچپور چھوڑ کر جنوب کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دیوگیری سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر مقام لصوڑا میں آکر ٹھیرا۔ جس وقت یہ خبر دیوگیری میں پہونچی تو راجہ رام دیو نے مدافعت کے خیال سے ایک فوج بھیجدی جس کو علاؤالدین نے آسانی سے شکست دی۔ اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے دیوگری کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے یہاں مشہور کر دیا کہ شہنشاہ دہلی کی فوج پیچھے پیچھے آرہی ہے۔ اور جو فوج اسکی کمان میں ہے صرف ایک ہراولی دستہ ہے۔ اس خبر سے گھبرا کر راجہ نے صلح کر لی۔ راجہ نے علاؤالدین کو پچاس من سونا، ایک من موتی، چالیس ہاتھی اور گھوڑے دینا قبول کر لیا۔ علاؤالدین نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ اس


جنوبی ہند کی طرف مسلمانوں کا پہلا قدم
دکن پر مسلمانوں کا پہلا حملہ
(نقشہ جس میں شہنشاہ علاؤالدین کا دکن پر حملہ بتایا گیا ہے)
دہلی
شمالی ہند
کڑہ
الہ آباد
ایلچپور
دیوگری
دکن
ورنگل
جنوبی ہند
خلیج بنگال
مدورا
سیلون
بحر ہند
شمال

وقت اس کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ کس خطرے میں ہے۔ دیوگیری میں جو ہندو فوج تھی وہ تھوڑی سی تھی۔ فوج کا بڑا حصہ کسی اور جنگ میں مصروف تھا۔ اگر وہ فوج واپس آجائے تو اس وقت کیا ہوگا؟ اگر وہ واپس ہونا بھی چاہے تو خاندیس، مالوہ اور گونڈوانا کی ہندو سلطنتیں اس کا راستہ روک دینگی۔

صلح کی شرائط ابھی طے ہو رہی تھیں کہ بیچ میں دیوگیری کی فوج اپنی مغربی سرحد سے واپس آگئی۔ راجہ کا بیٹا اس فوج کی کمان خود کر رہا تھا۔ راجہ نے بیٹے کو کہلا بھیجا کہ صلح ہو چکی ہے۔ اس لئے مسلمانوں پر حملہ نہ کیا جائے۔ لیکن شنکر دیو نے جس کی فوج علاؤالدین کی فوج سے کئی حصہ بڑھکر تھی۔ علاؤالدین کو کہلا بھیجا کہ جو کچھ اب تک حاصل کیا گیا ہے۔ چھوڑ کر واپس ہو جائے۔ علاؤالدین نے اس کو اپنی توہین سمجھی۔ اس نے دیوگیری کے محاصرہ پر ایک ہزار کی فوج چھوڑ کر باقی فوج سے شنکر دیو پر حملہ آور ہوا۔ خوش قسمتی اسکے ساتھ تھی۔ جنگ میں ہندو فوج کو بری طرح شکست ہوئی اور شنکر دیو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ علاؤالدین نے پلٹ کر دیوگیری کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔

رام دیو والئ دیوگیری اس تمام عرصہ میں امید و بیم کی حالت میں بسر کی لیکن مدافعت کی تیاریاں بھی کر لی تھیں۔ مگر شنکر دیو کی شکست کا حال سنکر اسکی ہمت پست ہوگئی۔ اور نئے سرے سے صلح کا طالب ہوا۔ علاؤالدین نے اب شرائط صلح کو ذرا سخت کر دیا۔ آخر بڑی مشکل سے صلح کی شرائط طے ہوئیں۔ راجہ نے علاؤالدین کو چھ سو من سونا۔ سات من موتی، دو من ہیرے اور جواہر

ایک ہزار من چاندی۔ چار سو تھان ریشم اسی وقت دیدئے اور آئندہ کے لئے ہر سال ضلع ایلچپور کے محاصل بطور خراج دینا منظور کر لیا۔ علاؤالدین نے اپنی جانب سے یہ اقرار کیا کہ مسلمانوں کی فوج جو پیچھے پیچھے آرہی ہے وہ دیوگیری پر حملہ نہیں کریگی۔ معاہدہ اٹھا کر علاؤالدین واپس پلٹ گیا۔ لیکن اس کے اس حملے نے جنوبی ہند پر مسلمانوں کے آئندہ حملوں کی بنیاد رکھدی"

اس لحاظ سے جنوب کی طرف یہ پہلا فاتحانہ قدم تھا جو مسلمانوں نے اٹھایا۔

دکن پر مسلمانوں کا دوسرا اور تیسرا حملہ

جنوب کی طرف دوسرا اور تیسرا قدم

قریباً بارہ سال تک دیوگیری کے راجہ رام دیو اپنے عہد کو نبھاتے ہوئے دہلی کو خراج ادا کرتا رہا۔ اس کے بعد جب اس نے دیکھا کہ علاؤالدین شمالی مہموں میں مصروف ہے تو اس نے خراج بھیجنا بند کر دیا۔ علاؤالدین اس وقت دہلی کا شہنشاہ تھا۔ اس کو امور سلطنت پر اس قدر دسترس حاصل تھی کہ جزئیات تک نظر انداز نہیں ہوتے تھے۔ دیوگیری کا خراج بند ہوتے ہی اس نے اپنے غلام ملک کافور کو دکن پر فوج کشی کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ اس حملے کا محرک ایک اور سبب بھی تھا۔ جس کو مورخ ہیگ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۴ پر اس طرح لکھا ہے:۔

" علاؤالدین نے جس وقت گجرات پر چڑھائی کی تھی تو وہاں کے راجہ رائے کرن کی خوبصورت رانی کملا دیوی اس کے ہاتھ آگئی تھی۔ رانی نے اپنی خوشی سے دہلی

کے شاہی محلات میں بطور حرم رہنا منظور کر لیا۔ لیکن یہاں اس کو اپنی بیٹیوں کی
یاد ہمیشہ مغموم رکھتی تھی۔ ایک تو فوت ہو چکی تھی۔ اور دوسری جس کا نام دیول
دیوی تھا۔ اپنے باپ رائے کرن کے پاس گجرات میں تھی۔ اس لڑکی کی منگنی دیو
گیری کے راجہ رام دیو کے بیٹے شنکر دیو سے ہونے والی تھی۔ شنکر دیو مرہٹہ
تھا۔ اور رائے کرن ایک اور ذات کا ہندو۔ وہ اس شادی کا اس لئے مخالف
تھا کہ اس میں اور مرہٹوں میں رشتہ داری نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن دیوگیری
والوں نے جنگ میں یہ شرط بہ جبر منوا لی تھی۔

علاؤالدین نے رائے کرن کو لکھا کہ دیول دیوی کو دہلی بھیجدیا جائے
جب یہ فرمان گجرات میں پہونچا تو رائے کرن نے یہی مناسب سمجھا کہ بیٹی کو
مسلمانوں کے حوالے کرنے سے یہ بہتر ہے کہ مرہٹوں کو دیدی جائے۔ اس نے
بیٹی کو دیوگری بھیجدیا۔ لیکن یہ ابھی راستے میں ہی تھی کہ علاؤالدین کے سپہ سالار
الغ خاں نے گجرات پر حملہ کر دیا۔ رائے کرن کو شکست ہوی۔ لیکن محلات میں
دیول دیوی کا پتہ نہیں ملا۔ اتفاقاً ایک دن جب اسلامی فوج دریائے گرجا
کے کنارے کیمپ ڈالے ہوئے تھی تو چند سپاہی غارہائے ایلورا دیکھنے کیلئے
نکلے۔ ان غاروں کے قریب میدانوں میں جب وہ پھر رہے تھے تو انہیں ایک
مختصر سی ہندو فوج نظر آئی۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ دیوگیری کی فوج، رائے
کرن کی مدد کو آرہی ہے۔ اس لئے انہوں نے مجتمع ہوکر اس فوج پر حملہ کر دیا
ہندوؤں کو شکست ہوی۔ اور وہ گھوڑا جس پر دیول دیوی سوار تھی زخمی
ہوکر بیٹھ گیا۔ اس وقت مسلمان سپاہی مال غنیمت حاصل کرنے کیلئے بڑھے

محافظوں نے کہا کہ یہ راجہ رائے کرن کی بیٹی ہے۔ یہ سن کر مسلمانوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ انہوں نے دیول دیوی کو الغ خاں کے پاس پہونچایا جہاں سے وہ دہلی پہونچا دی گئی۔ اور وہاں اس کی شادی خضر خاں سے ہو گئی"

(نوٹ :۔ امیر خسرو نے ان حالات کو نظم میں لکھ کر دیول دیوی کو مشرقی داستانِ محبت کی ایک غیر فانی ہیروئن بنا دیا ہے)

الغ خاں ادھر گجرات کی لڑائی میں مصروف تھا۔ ادھر سلطان علاؤالدین نے دیوگیری والوں کو سزا دینے کے لئے ملک کافور کو بھیجا۔ ۱۳۰۷ء کی جنگ میں رام دیو کو شکست ہوئی۔ کافور نے اس کو قید کر کے دہلی بھیجدیا۔ جہاں سلطان نے اسکی نہایت خاطر و مدارات کرتے ہوئے پھر اس کی ریاست اس کو بخش دی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ شہنشاہ نے رام دیو کو رائے کا خطاب عنایت کیا۔ سفید چتر پکڑنے کی اجازت بھی دی۔ ان عنایات شاہی کو دیکھکر رام دیو اس کے بعد تا دم مرگ وفادار رہا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی ہند پر آئندہ حملوں کے لئے شہر دیوگیری مسلمانوں کا ایک مرکز بن گیا۔

دکن پر مسلمانوں کا تیسرا حملہ

اس جنگ کے دو سال بعد یعنے ۱۳۰۹ء میں علاؤالدین کے حکم سے ملک کافور تلنگانہ کی فتح کے لئے پھر دوسری بار دکن میں آیا۔ اس وقت دیوگیری کے راجہ رام دیو نے بھی مسلمانوں کی تائید کی۔ ملک کافور نے اندور (نظام آباد) پر قبضہ کرتے ہوئے ورنگل پر چڑھائی کی۔ ورنگل کا محاصرہ کر لیا گیا۔ عجب نہیں تھا کہ ورنگل فتح ہو جاتا۔ لیکن کافور کو ہدایات تھیں کہ راجہ اطاعت کرلے تو صلح کر لی جائے۔ اس لئے جب پرتاب رودرا دیو نے صلح چاہی تو

ملک کافور بہت سا زر و جواہر، ایک سَو ہاتھی اور سات ہزار گھوڑے لے کر دہلی واپس چلا آیا۔

جنوبی ہند پر مسلمانوں کا پہلا حملہ

۱۳۱۰ء

دکن پر تیسرے حملے کے ایک سال بعد یعنی ۱۳۱۰ء میں سلطان علاؤالدین خلجی نے ملک کافور کو جنوبی ہند پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس حملے کے علل و اسباب وغیرہ پر مورخین نے زیادہ روشنی نہیں ڈالی ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے:۔

"اس زمانے میں سرحد کابل سے لیکر انتہائے بنگالہ تک اور گجرات و دکن کے سب قلعے و صوبہ جات بادشاہ علاؤالدین کے زیر فرمان ہوئے۔ اور تمام رجواڑوں میں بھی اس کا سکہ و خطبہ رائج ہوا کہیں دس بیگھہ زمین ایسی نہ تھی۔ جہاں اس کا حکم نافذ نہ ہو۔ تب اس نے چاہا کہ راس کماری کے حدود اور سواحل ہند و لنکا کو مسخر کرے۔ لہٰذا ملک نائب و حاجی خواجہ کو ۷۱۰ھ میں لشکر عظیم کے ساتھ روانہ فرمایا۔ اور مشہور تھا کہ وہاں کے بتخانے زر و جواہر نفیسہ سے بھرے ہوئے ہیں جب یہ دونوں دیوگڑھ پہونچے تو معلوم ہوا کہ رام دیو کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور اس کے بیٹے کو باپ کے موافق مخلص نہ پایا۔ لہٰذا ایک سردار کو مع فوج حاضرہ کے قریب جو دکن کی گنگا کے کنارے واقع ہے۔ چھوڑ کر آگے بڑھے۔ اور کفار کندہ کے قتل میں زیادہ اہتمام کیا۔ اور اس ہیبت و سیاست سے تین ماہ

بعد ان مقامات میں پہونچے اور وہاں راجہ کرناٹک کو گرفتار کر کے ۔ ولایت کو غارت کیا ۔ اور بت خانوں کو توڑ کر وسیع بتوں پر قبضہ کر لیا اور آخر میں ایک مسجد تعمیر بنائی ۔ اور وہاں خطبہ سلطان علاؤالدین کا پڑھا ۔ وہ مسجد راسیشور میں بدستور باقی ہے ۔ اور اس کو مسجد علائی کہتے ہیں ۔

ملک نائب نے سب اموال ہاتھیوں پر لاد کر دہلی کی طرف کوچ کیا ۔ جو لنکا کا پل مشہور ہے ۔ اور وہاں سے بھی ہزاروں برس کے خزانے لیے ۔ اور صحیح سلامت کوچ پر کوچ روانہ ہو کر ۷۱۱ھ میں دہلی پہونچا ۔ اور تین سو بارہ ہاتھی اور بیس ہزار گھوڑے اور دو کروڑ اشرفیاں و طلائی صندوق اور موتی و جواہرات کے صندوق جو شمار سے باہر تھے ۔ ہزار ستون کے سامنے بادشاہ کے روبرو پیش کیے ۔" (تاریخ فرشتہ اردو صفحہ ۱۶۲ مطبوعہ نولکشور)

اس زمانہ میں جنوبی ہند کی مالی حالت کے متعلق یہی مورخ لکھتا ہے :-

" مورخین نے ملک نائب کے فتوحات کرناٹک میں سوائے طلا کے چاندی کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں سونے کی اس قدر کثرت تھی کہ چاندی شمار میں نہ لاتے تھے ۔ اور اس زمانے میں بھی وہاں کا چلن اکثر سونے کے عوض ہے ۔ اور وہاں کے فقیروں کو چاندی کے زیور سے شرم آتی ہے ۔ مالداروں کا کیا ذکر وہاں کے اوسط درجے والے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتے ہیں ۔" (صفحہ ۱۷۳)

امیر خسرو کی تاریخ علائی میں کچھ زیادہ تفصیل آئی ہے ۔ لیکن وہ بھی بہت کچھ تشنہ ہے ۔ امیر خسرو لکھتے ہیں :-

" دیوگری اور ورنگل کی فتوحات کے بعد ہندوستان میں صرف دو ہندو سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک دوارسمندر کی اور دوسری مدورا کی۔ ملک کافور اب انہیں فتح کرنے کیلئے نکلا۔ ۲۴ جمادی الآخر ۷۱۰ھ میں فوج دہلی سے نکلی۔ جس وقت ملک کافور باندری (پرندعا پور) میں مقیم تھا۔ اس کو اطلاع ملی کہ مدورا میں دو بھائی ویرا پانڈیا اور سندرا پانڈیا تخت کیلئے لڑ رہے ہیں۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھاکر دوارسمندر کا راجہ بلال دیو سوم انکے ملک پر حملہ آور ہوا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے ہونے والے حملہ کا حال سنکر اپنے پائے تخت کو واپس ہوا ہے۔ اتوار مورخہ ۲۲ رمضان المبارک کے دن ملک کافور نے امرائے فوج سے مشورت کی اور سوار فوج کا ایک منتخب دستہ لیکر بارہ دن کی مسافت کے بعد دوارسمندر کے آگے پہنچا۔ یہاں اس نے راجہ کے آگے تین شرائط پیش کیں۔

(۱) اسلام قبول کیا جائے یا (۲) ذمی بنکر جزیہ دینا قبول کرے۔ یا (۳) جنگ پر آمادہ ہو جائے۔

حالات کا اندازہ کرتے ہوئے راجہ بلال دیو سوم نے صلح کر لینی چاہی۔ اگرچہ راجہ ویر پانڈیا نے اسکی تائید کیلئے فوج بھیجی تھی صلح ہوگئی راجہ نے اپنا تمام خزانہ ہاتھی اور گھوڑے ملک کافور کی نذر کر دیا۔ ملک کافور نے اس نذرانہ کے ساتھ بلال دیو کو بھی شہنشاہ کے پاس دہلی کو بھیجدیا۔"

ان تحریروں سے ظاہر ہے کہ امیر خسرو اور فرشتہ نے اسباب وعلل کو چھوڑ کر صرف نتائج کو قلمبند کر دیا ہے۔ اور انہی روایات کو لیکر عام طور پر انگریزی مورخین نے لکھا ہے۔

"اس حملے کا سبب بھی وہی ہے جو پہلے حملوں کا تھا۔ مسلمانوں کو مال و زر اور ہاتھیوں کی ضرورت تھی جو سب بہ بینے جنوبی ہند میں کثرت سے تھے۔"

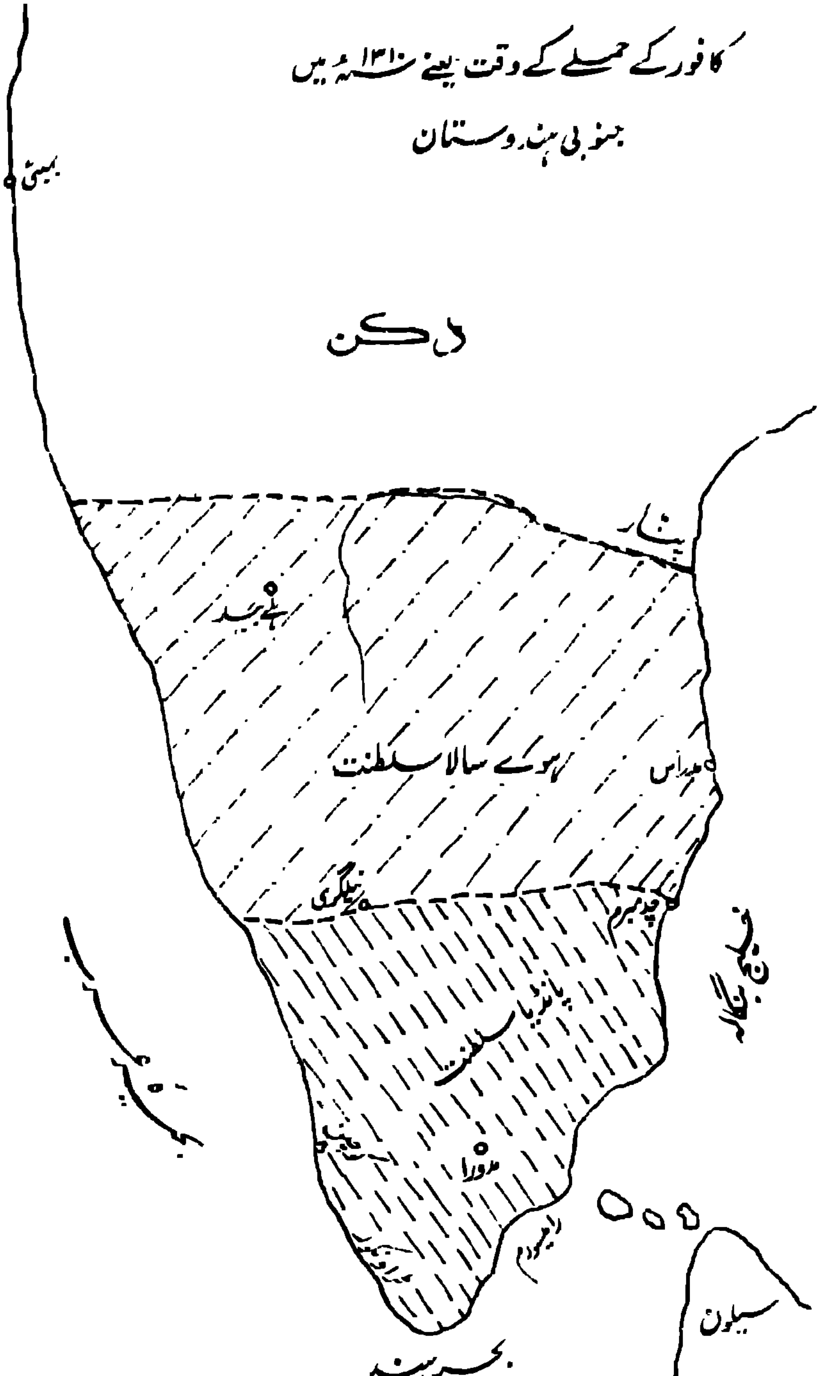
چنانچہ رئیس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے:۔

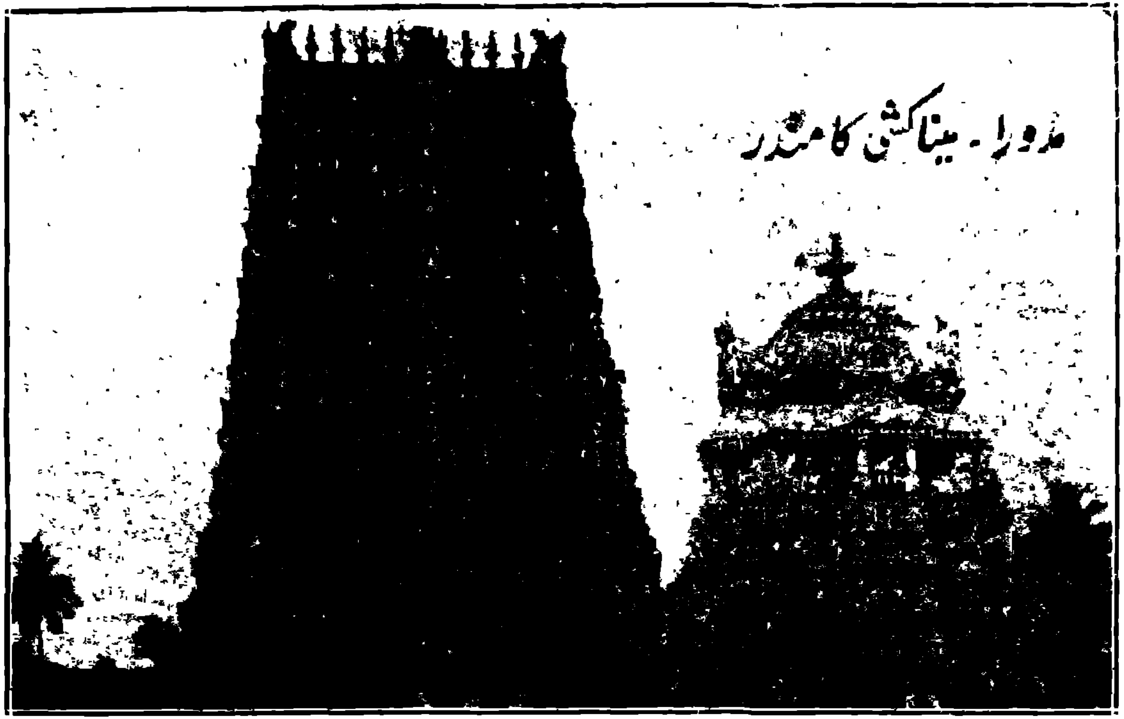
"۱۳۱۰ء میں علاؤالدین کے جنرل ملک کافور نے ہوے سالا کی اس مملکت پر حملہ کیا۔ جس کا پائے تخت دوار سمندرم میں تھا ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد راجہ بلال سوم کو شکست ہوئی۔ اور وہ مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوا۔ فاتحین نے دوار سمندرم کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ دشمن کے ہاتھ بے حساب خزانہ و در زر و جواہر آئے۔ ملک کافور نے اس فتح کے بعد جنوب میں مدورا کو فتح کیا۔ اور یہاں سے رامیسورم تک بڑھا۔ جہاں اس نے ایک مسجد تعمیر کی۔"

لیکن وصاف نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:۔

"جنوبی ہند میں اس وقت قابل ذکر دو سلطنتیں تھیں۔ جن میں ایک میسور کی ہوے سالا حکومت تھی۔ جس کا پائے تخت دوار سمندرم میں تھا۔ اور دوسری مدورا کی پانڈیا حکومت تھی۔ ہوے سالا حکومت دریائے کرشنا سے نیچے ملیبار تک اور بحیرۂ عرب سے لیکر ساحل کورومنڈل تک پھیلی ہوئی تھی۔ جنوب میں پانڈیا خاندان تمام ملک کرناٹک پر راس کماری تک حکومت کر رہا تھا۔ ملیبار۔ اور ٹراونکور وغیرہ اسی کے ماتحت تھے۔ اس زمانے میں جب دہلی میں شہنشاہ علاؤالدین برسر حکومت تھا تو مدورا کے تخت کے لئے دو بھائیوں میں جن کا نام ویرا پانڈے اور سندرا پانڈے تھا لڑائی ہوئی۔ ویرا پانڈے نے سندرا پانڈے کو مدورا سے نکال دیا۔ اور اس نے سلطان علاؤالدین سے تائید چاہی۔"

کافور کے حملے کے وقت یعنی ۱۳۱۰ء میں
جنوبی ہندوستان




مدورا ۔ میناکشی کا مندر

مورخ آئیٹ نے بھی وصاف کی اس روایت کی تائید کی ہے۔ مدورا کے ڈسٹرکٹ گزیٹر کے مصنف نے بھی کتبوں اور مقامی روایتوں سے نتیجہ نکالتے ہوئے لکھا ہے :-

"مدورا کے تخت کے لئے وارثوں میں سخت لڑائی ہوئی۔ ان میں سے ایک نے سلطان علاؤالدین سے مدد مانگی اور اس نے اپنے جنرل ملک کافور کو جنوب میں بھیجدیا"

سدرن انڈیا اینڈ ہر محمڈن انویڈرس (Southern India & her Mohammedan Invaders.) کا مصنف ڈاکٹر ایس۔ کرشنا سامی اینگار لکھتا ہے :-

"مدورا کے راجہ کے دو بیٹے تھے۔ جن کا نام ویرا پانڈے اور سندرا پانڈے تھا۔ باپ بڑے بیٹے کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے اس کو ولی عہد بنایا۔ باپ کی اس کارروائی سے چھوٹا بیٹا سندرا پانڈے ناراض تھا۔ اور موقع ملنے پر اس نے سلطان علاؤالدین سے مدد چاہی" (صفحہ ۹۶)

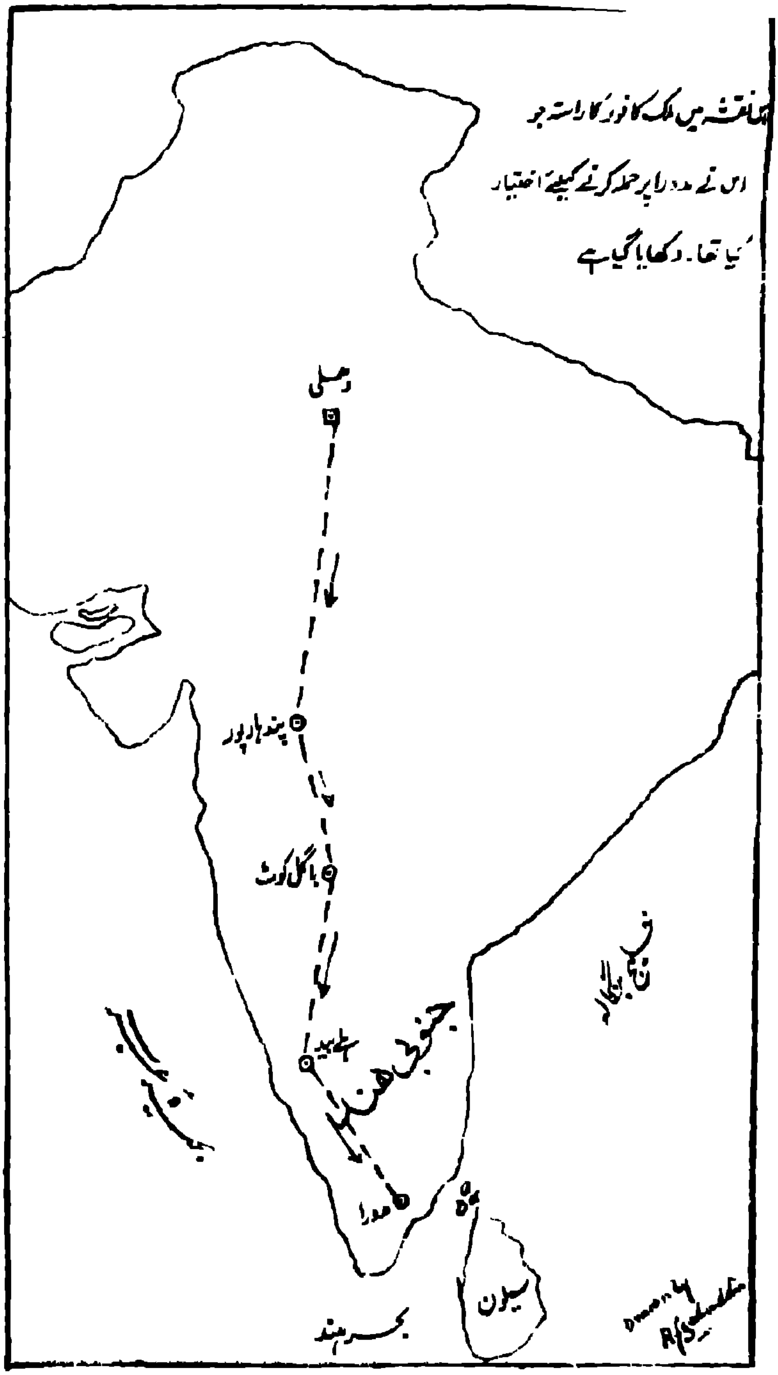
مذکورۂ بالا تمام روایتوں پر ایک ساتھ نظر ڈالی جائے تو نتیجہ نکلتا ہے کہ :-

"ہندوؤں کی آپس کی نااتفاقی نے مسلمانوں کو جنوب پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس وقت تمام جنوبی ہند میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ مدورا کی قدیم راجدھانی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ ایک حصہ بڑے بھائی ویرا پانڈے کی حمایت پر تھا۔ تو دوسرا حصہ چھوٹے بھائی سندرا پانڈے کی تائید پر۔ دونوں بھائیوں میں ایک عرصہ تک لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر تنگ آکر بڑے بھائی ویرا پانڈے نے ہمسایہ سلطنت دوارسمندرم کے راجہ سے مدد مانگی۔ اب چھوٹے بھائی سندرا پانڈے پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگا۔ جنوب میں کوئی اور سلطنت نہیں تھی۔ جو اس کی تائید کرسکتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے سفیر کو دہلی بھیجا۔ اور مسلمانوں سے تائید چاہی۔

علاؤالدین نے تائید وینی قبول کرلی۔ اور اپنے جنرل ملک کافور کو مدورا پر حملہ کرنیکا حکم دیا۔"

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دوارسمدرم پر حملہ کیوں کیا گیا۔ اگر جنوبی ہند کی جغرافیہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ دوارسمدرم کی سلطنت جنوبی ہند کے شمالی حصہ پر قابض تھی۔ اور بغیر اس سلطنت کے حدود میں سے گذرے کے جنوب میں مدورا تک رسائی ناممکن تھی اور اس کے ساتھ ہی کافور نے اپنی جنگی فراست سے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اگر دوارسمدرم پر حملہ کیا جائے تو راجہ بلالا اپنے پائے تخت کو بچانے کیلئے مدورا سے واپس آ جائیگا۔ اور اس طرح سندرا پانڈے کو وہاں مہلت مل جائیگی۔ اس کے علاوہ کافور کے زیر نظر یہ بات بھی تھی کہ اگر بغیر دوارسمدرم پر حملہ کرنے کے وہ مدورا پر بڑھ جائے تو ممکن ہے کہ بلالا سوم اس کی واپسی کا راستہ مسدود کردے ان دونوں امور کا لحاظ کرتے ہوئے کافور نے دوارسمدرم پر حملہ کیا۔ اب رہی اس حملہ کی نوعیت۔ اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ مسلمانوں کا یہ حملہ برق سرعت سے ہوا۔ ملک کافور ایک تجربہ کار جنرل تھا۔ وہ اپنے دشمن کو اس قدر مہلت دینا ہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ طاقت جمع کرسکے۔ کافور بندھار پور سے نکل کر بارہ دن کے عرصہ میں دوارسمدرم کو پہونچا۔ جنگ کا نتیجہ پہلے لکھا جاچکا ہے۔

کافور نے راجہ بلالا سوم کو دہلی بھیجدیا۔ صرف اس لئے کہ بلالا سوم کہیں موقع پاکر اس کی واپسی کا راستہ مسدود نہ کردے یہ ایک نہایت ضروری جنگی احتیاط تھی۔ جو کافور نے اختیار کی۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لئے مدورا تک راستہ صاف تھا۔ اور ان کو یہ بھی اطمینان تھا کہ ان کی واپسی کا راستہ سلامت اور بے خطر ہے۔


اس نقشہ میں ملک کافور کا راستہ جو
اس نے مدورا پر حملہ کرنے کیلئے اختیار
کیا تھا۔ دکھایا گیا ہے
دہلی
پنڈھارپور
باگل کوٹ
ہلے بید
مدورا
جنوبی ہند
خلیج بنگالہ
بحیرہ عرب
سیلون
بحر ہند

دوار سمندرم (ہلے بید) پر مسلمانوں کا قبضہ

گذشتہ باب میں امیر خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کافور بند ہار پور سے نکل کر دوار سمندرم کو بارہ دن میں پہونچا۔ اس نے دوار سمندرم کو پہونچنے کیلئے جس راستے کو اختیار کیا وہ بند ہار پور سے بیجا پور اور یہاں سے ہری ہر، ہر پور، ورنا نا وار پر سے ہوتا ہوا دوار سمندرم پہونچتا ہے۔

اس زمانے میں جب ذرائع حمل ونقل اور رسل ورسائل اس قدر وسیع اور آسان نہیں تھے۔ اتنی بڑی مسافت کا اس قدر جلد طے کر لینا یقیناً حیرت انگیز ہے۔ ملک کافور نے دوار سمندرم پہونچکر راجہ کے آگے تین شرائط پیش کیں۔

(۱) اسلام قبول کر لیا جائے۔ یا

(۲) ذمی بنکر جزیہ دینا قبول کرے۔ یا

(۳) جنگ کے لئے آمادہ ہو جائے۔

امیر خسرو نے لکھا ہے کہ راجہ نے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے اطاعت قبول کر لی۔ وہ لکھتے ہیں کہ بلال سوم نے سوائے مقدس جنیو (دھاگے) کے باقی تمام دولت کافور کے حوالے کر دی۔ چھٹویں شوال کے دن تین سفیروں کے ذریعہ چھ ہاتھی بھیجے گئے۔ اور اتوار کا دن راجہ نے خود اپنے آپ کو کافور کے حوالے کر دیا۔ اس سے پیشتر رات کو تمام خزانے کافور کی خدمت میں بھیجے جا چکے تھے۔ اگر امیر خسرو کے بیان کو مان لیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دوار سمندرم میں کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ لیکن اس بیان کے خلاف جنوبی ہند کے جس قدر مورخین نے یہاں

کے حالات لکھے ہیں۔ اور مقامی طور پر جو روایات مشہور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دوارسمندرم میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایک نہایت خونریز جنگ ہوئی۔ قرین قیاس بھی یہی ہے۔ کہ ایک خود مختار و زبردست ہندو راجہ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ بغیر مقابلہ کئے کافور کی شرائط کو تسلیم کرلے۔ کافور نے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ ہر روز ہندو فوج قلعہ سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتی تھی۔ لیکن مسلمان سواروں کی تیراندازی سے مجبور ہوکر پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ بارہ دن کے محاصرہ کے بعد مسلمان فصیل قلعہ کو توڑ کر شہر پر قابض ہوگئے۔ شاہی محلات کا محاصرہ کرلیا گیا۔ بلالاسو نے اس وقت مجبور ہوکر صلح مانگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے تفصیلات کو چھوڑ کر صرف نتیجہ لکھدیا ہے۔

مورخین کو حیرت ہے کہ ایک زبردست قدیم راجدھانی جہاں مدافعت کا تمام ضروری سامان موجود اور تمام اطراف، کا ملک ہندوؤں سے بھرا ہوا تھا کس طرح بارہ دن کے عرصہ میں فتح ہوگئی۔ اس حیرت کو رفع کرنے کے لئے مورخ رئیس وصاف کی روایت کو لے کر اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"۱۳۱۱ء میں ملک کافور برق اور آندھی کی طرح آیا۔ راستہ میں حائل ہونیوالی تمام قوتیں اس کے آگے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔"

کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں کا یہ حملہ کوہ آتش فشاں کے اس سیال مادہ کے مانند تھا۔ جو اپنے راستہ میں حائل ہونے والی ہر چیز کو فنا کردیتا ہے۔"

ان تحریروں کے ساتھ اگر مقامی کتبوں اور روایتوں پر بھی نظر کی جائے تو اس میں کچھ شک نہیں رہتا کہ دوارسمندرم کا شہر ایک خونریز جنگ کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

مسلمان جب فصیل قلعہ اور مندر پر قابض ہوکر محل کا محاصرہ کرچکے تو بلال دیو سوم نے اطاعت کرلی۔ اور اپنا تمام خزانہ اور ہاتھی وغیرہ ملک کافور کے حوالے کردیا۔

"سدرن انڈیا انڈ ہر محامڈن انویڈرس" کا مصنف صفحہ ۹۴ پر لکھتا ہے :۔

"بلالا سوم نے دن میں ملک کافور سے ملاقات کی۔ واپس ہوکر وہ شب بھر محل میں اپنے خزانے نکالنے میں مصروف رہا۔ دوسرے دن اس نے تمام دولت اور ہاتھیوں کو اسلامی سپہ سالار کے حوالے کردیا۔ کافور نے یہ تمام دولت اور راجہ کو علاؤ الدین کے پاس بھیج دیا۔"

تاریخ نیورٹولی فرگاٹن ایمپائر (Never to be forgotten Empire) کا مصنف پی۔ سوری نارائن راؤ لکھتا ہے :۔

"کافور نے جس قدر دولت دوار سمندرم سے دہلی کو روانہ کی۔ اس کی مالیت موجودہ شرح سے ۱۵۰ پچاس کروڑ روپیہ کی ہوتی ہے۔ بلاشبہ ایک غلام کے لئے یہ ایک بڑی دولت تھی۔"

دوار سمندرم کے فتح ہونے کے بعد اپنے تحفظ کے خیال سے کہ کہیں واپسی کا راستہ مسدود نہ ہوجائے۔ کافور نے راجہ بلال دیو کو دہلی بھیجدیا۔ جہاں سلطان علاؤ الدین نے اس کو کافور کے واپس آنے تک نہایت عزت و احترام سے رکھا۔ اور کافور کی واپسی کے بعد باجگذاری کا عہد لیکر اس کو دوار سمندرم واپس بھیجدیا۔

(نوٹ :۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلالا سوم ۱۳۱۳ء میں دہلی سے واپس ہوا۔ دوار سمندرم بعض ایسے بید میں جو کتبے ملے ہیں۔ ان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ بلالا دیو نے اپنی واپسی کی خوشی میں مندر کو جاگیر دی تھی۔)

ملک کافور جنوبی ہند میں

ملک کافور دوار سمندرم کو فتح کرکے مدورا کی جانب بڑھا۔ راستہ کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ بعض لکھتے ہیں کہ کافور دوار سمندرم سے نکلکر مبتورا اور رلیبار کے راستے سے مدورا گیا۔ اور دوسرے کہتے ہیں کہ دوار سمندرم سے اس نے مشرقی راستہ اختیار کیا تھا۔ امیر خسرو نے اپنی تاریخ علائی میں اس راستہ کا تعین کیا ہے لیکن یہ نام آج اس قدر مسخ ہوگئے ہیں کہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مقامات کہاں تھے اور کہاں نہیں۔ تاریخ کی یہ کس قدر خوش نصیبی ہے کہ مدراس کے محکمۂ آثار قدیمہ نے چند ایسے قدیم کتبے دستیاب کئے ہیں جن سے امیر خسرو کے بتلائے ہوے راستے کی تصدیق ہوتی ہے۔ امیر خسرو لکھتے ہیں :۔

"ملک الاسلام (ملک کافور) دوار سمندرم سے ۱۰ر شوال بروز چہارشنبہ معبر کی طرف نکلا۔ پانچ دن کے بعد ان پہاڑوں پر پہونچا۔ جو ہوے سالا سلطنت کو معبر سے جدا کرتے ہیں۔ یہاں اس نے تبار اور تمرلی کے دروں سے نکل کر دریائے کنو باری کے ساحل پر شام کے وقت پڑاؤ ڈالا۔ دوسرے دن مسلمان حملہ آور بیر دہول کی مملکت پر بڑھے۔ اس خبر کو سن کر رائے نے کسی جزیرہ میں جان بچانی چاہی۔ لیکن امراء نے مشورہ دیا کہ خشکی میں کسی جگہ مقام کرے۔ وہ اپنے ساتھ تھوڑا سا خزانہ لیکر کندور کو گیا۔ لیکن اس کو بھی غیر محفوظ سمجھ کر اس نے دور جنگلوں میں پناہ لی۔ ملک کافور نے اس کا تعاقب کیا۔ کندور میں ایک جماعت جو اس راجہ کی رعایا تھی۔ اسلامی فوج میں مل جانا چاہتی

تھی۔ یہ لوگ نیم ہندو اور نیم مسلمان تھے۔ صرف کلمہ پڑھنا جانتے تھے۔ یہ لوگ
واجب القتل تھے۔ لیکن کافور نے ان کی جاں بخشی کی۔ یہاں سے ملک کافور
بیر دہول جا کر راجہ کی تلاش میں پھر کندور پہونچا۔ لیکن معلوم ہوا کہ وہ
جالکوٹ کو چلا گیا ہے۔ جو راجگان ویر (مدورا) کا قدیم شہر ہے۔ ملک کافور
یہاں بھی اس کے تعاقب میں نکلا۔ لیکن اس نے جنگلوں میں پناہ لے لی تھی۔
اس لئے ہاتھ نہ آیا۔ پس ملک کندور میں واپس آ گیا۔ یہاں اس کو معلوم
ہوا کہ برہمست پوری میں ایک طلائی بت اور بہت سے ہاتھی اور فوج ہے۔
ملک نے اس مقام پر شبخون مارا۔ صبح کو ۲۵۰ ہاتھی اس کے ہاتھ آئے۔
اس نے یہاں کے خوبصورت مندر کو ڈھا دینا چاہا۔ مندر کیا تھا؟ شداد
کی بہشت کا نمونہ تھا۔ جس کے گم ہونے پر شاید شیاطین نے یہاں بنا لیا تھا۔ یہی
رام لچھمن کا طلائی لنکا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مقام ہندوؤں کا مقدس تیرتھ تھا۔ ملک
نے اس کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیا۔ برہمنوں اور بت پرستوں کے سر رقص کرتے
ہوئے زمین پر گرے۔ اور لہو کا ایک دریا موجیں مارنے لگا۔ پتھر کے وہ تمام
بت جن کو مہادیو کا لنگ کہا جاتا ہے۔ توڑ دئے گئے۔ اس سے پہلے کبھی مسلمانوں
کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی اس جگہ رسائی نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے[1] بت جو
مضبوطی سے جمے ہوئے بیٹھے تھے اس قدر اونچے اڑے کہ ایک ہی جست میں
لنکا کے قلعے میں پہونچ گئے۔ اس موقع پر اگر لنگوں کو پر ہوتے تو شاید یہ بھی
اڑ جاتے۔ بے شمار سونا اور جواہرات مسلمانوں کے قبضہ میں آئے۔ بت شکنی کے

[1] امیر خسرو کی مراد برہمنوں سے ہے جو اس مندر میں جمع تھے۔ اور جنہوں نے فرار ہو کر لنکا میں پناہ لی تھی۔



سری رنگم (مندر کا ایک منظر)



رامیسورم - مندر کا اندرونی منظر

مقدس نقش کو [illegible] کر کے ۱۳ ذی قعدہ ۷۱۰ھ میں اسلامی فوج واپس ہوئی۔ شہر بتوں کے تمام [illegible] مسمار کر دیئے گئے۔ بے حد دولت مراد ملکت جواہرات اور مال غنیمت شاہی خزانہ میں داخل کیا گیا۔

پانچ دن کے بعد پنجشنبہ ۱۲ ذی قعدہ کے دن اسلامی فوج بیر دھول سے نکلکر ۱۸ ذی قعدہ کو کھام پر آئی اور اس کے پانچ دن بعد مدراس پہنچی۔ جہاں سندر پانڈے کا عالی ویرا پانڈے رہتا تھا۔ شہر خالی تھا۔ راجہ اپنی رانیاں لیکر فرار ہو چکا تھا۔ لیکن مسلمانوں کو جگنار کے مندر میں دو ہاتھی ملے۔ مندر جلا دیا گیا۔ یہاں سے اسلامی فوج سمندر پر بڑھی کہ لنکا کے ساحل پر پہونچ کر دین حق کو یہاں تک پہونچایا جائے۔ اس جگہ ایک برہمن پانڈے گرو حکومت کرتا تھا۔ اس کے قبضہ میں بہت سے شہر تھے۔ اس کا پایۂ تخت فتان تھا۔ جہاں ایک مرصع بت تھا۔

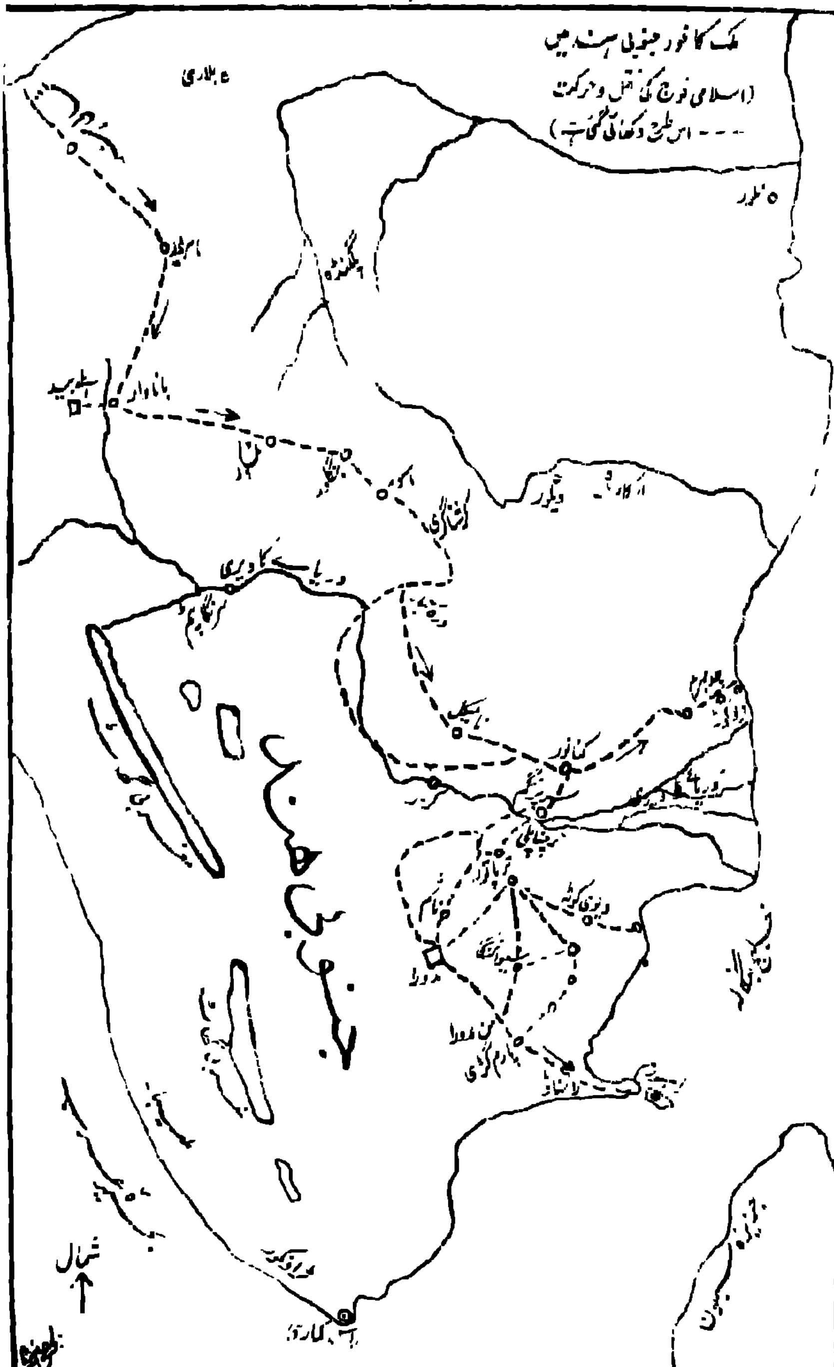
(سدرن انڈیا اینڈ ہر محمڈن انویڈرس صفحہ ۹۷، ۹۸، ۹۹)

امیر خسرو کے اس بیان سے اگر ان کتبوں کا موازنہ کیا جائے۔ جو مدراس کے محکمۂ آثار قدیمہ نے حال میں دستیاب کئے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ کافور دوار سمندر سے نکلکر باناوار واپس ہوا۔ اور اس سڑک پر ہو لیا جو ٹمکور سے مسور کو جاتی ہے۔ امیر خسرو نے لکھا ہے کہ پانچ دن بعد ملک کافور ان پہاڑیوں پر پہونچا جو میسور کو کرناٹک سے جدا کرتے ہیں۔ غالباً یہ مقام موجودہ مسور ہے۔ اس لئے کافور پہلے بیدسے باناوار، باناوار سے بکناٹک ہلی، یہاں سے ٹمکور اور ٹمکور سے بنگلور ہو کر مسور پہونچا۔ اگر ہم پہلے بیدسے کورومنڈل کا دوسرا راستہ اختیار کریں جو میسور سے ہوتا ہوا ستی منگل کے پاس پہاڑوں کو عبور کر کے ضلع کوئمتور

میں داخل ہوتا ہے۔ تو یہ مسافت پانچ دن میں طے نہیں ہو سکتی۔ اور اس راستہ میں امیر خسرو کے بیان کردہ پہاڑی درّے تبار اور سرّمی بھی نہیں ملتے۔ ہاں میس گری نامی ایک درہ ملتا ہے۔ لیکن تلفظ بالکل جدا ہے۔ اس لئے ہستور پہونچ کر اس نے اس مشہور درے کو عبور کیا۔ جس کو آج بھی درّہ توپار (Topar Pass) کہا جاتا ہے (اسی درّہ توپار کو امیر خسرو نے تبار لکھا ہے) اور جو ہسور سے قریب ہے۔ اس درہ سے پار ہو کر کافور نے دریائے کاویری کے کنارے قیام کیا (اسی دریا کو امیر خسرو نے کنزباری لکھا ہے۔)
یہاں سے معلوم نہیں ہوتا کہ اسلامی فوج کس جگہ سے دریا پار ہوی۔ لیکن چونکہ خسرو نے منزل مقصود بیر دہول بتلایا ہے۔ اور کہیں دریا کو دوبارہ عبور کرنے کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہے کہ اسلامی فوج دریا کے کنارے کنارے چل کر کنذور اور سری رنگم پہونچی اور یہیں دریا کو عبور کیا۔ ملک میں جس قتل وغارت کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ تمام اسی نواح میں ہوی تھی (مدراس کے محکمۂ آثار قدیمہ نے کتبوں کی مدد سے اس راستہ کا ایک نقشہ تیار کیا ہے۔ جس کو صفحہ ۸۲ پر کتاب سدرن انڈیا سے یہاں دیا جاتا ہے)

(نوٹ ۱۔ کنذور سے مراد کنذاپور (یعنے موجودہ "کنانور" ہے) جو سری رنگم کے قریب ہے۔ اور بیر دہول سے مراد "دیواپٹن" ہے یا عام معنی میں تمام مملکت مدورا)

خسرو نے اس کے بعد "برہمست پوری" کے مندر اور طلائی بتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کو بہشت شداد کا نام دیا ہے۔ اس لئے اس میں کچھ بھی شک نہیں رہتا۔ کہ یہ مندر "سری رنگم" کا مشہور مندر ہے۔ اور یہاں اس زمانے کا ایک کتبہ بھی دستیاب ہوا ہے جس میں لکھا ہے کہ مسلمانوں نے یہاں کے بتوں کو توڑ ڈالا۔ دوسرا شہر جو اس نواح میں مندروں کے لئے مشہور ہے۔ وہ "چدمبرم" ہے۔ اور یہاں بھی آثار بتلا رہے ہیں کہ یہاں کے بت بھی اس



(یہ نقشہ مدراس کے تذکرہ آثار قدیمہ کے ریکارڈوں سے مرتب کیا گیا ہے۔)

وقت مسلمانوں کے ہاتھوں سے محفوظ نہیں رہے۔ بہر طور رسمی رنگم کی تاخت کے بعد ملک کافور مدورا پر اس راستے سے بڑھا جو سرو ملے پہاڑوں سے گذرتا ہے۔ غالباً یہی وہ درہ ہے۔ جس کو خسرو نے تربلی لکھا ہے۔

مدورا کی فتح کے بعد کافور رامیسورم پہونچا۔ امیر خسرو نے اپنے بیان میں جس طلائی مندر کا ذکر کیا ہے۔ اس سے مراد رامیسورم کا مندر ہے۔ جس کو ملک کافور نے تباہ کر دیا۔ ان فتوحات کے بعد ملک کافور نے مندرا پانڈے کو تخت نشین کر کے دہلی واپس ہوا۔

جنوبی ہندوستان پر ملک کافور کے حملے کے نتائج

جس طرح ایک نامعلوم زمانے سے مختلف قومیں اس ملک پر حملے کرتی رہی ہیں۔ اسی طرح ۱۳۱۰ء میں مسلمانوں نے بھی اس ملک پر حملے کیئے۔ دوسری قومیں جب ملک میں آتی تھیں۔ تو یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ لیکن مسلمان اس حملہ کے بعد جلدی ہی شمال کو واپس چلے گئے۔ اگر وہ چاہتے تو نہایت آسانی سے مستقل حکمرانی کی داغ بیل اس مفتوحہ علاقہ میں ڈال سکتے تھے۔ مگر سلطان علاؤالدین کی مصلحتوں نے کافور کو واپس بلا لیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب مورخین نے یہ لکھا ہے کہ علاؤالدین کو شمال میں مغلوں کے حملوں کا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ بہر طور مسلمان واپس ہوئے۔ لیکن ملک کی سیاسی حالت میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب تک جنوبی ہند کی دونوں حکومتیں یعنے مدورا اور دوار سمندرم جو آزاد تھیں۔ مسلمانوں کی باجگذار بن گئیں۔

مورخ اسمتھ اور دوسرے انگریزی مورخین لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ تمام ملک ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک ایک شہنشاہ کے زیرنگین آگیا۔"

واقعاتِ دہلی

ملک کافور کے دہلی پہونچنے کے بعد سلطان علاؤالدین کا انتقال ہوگیا۔ ملک کافور نے بادشاہ کے انتقال پر سلطان علاؤالدین کے بڑے بیٹوں کو قید کرکے سب سے چھوٹے کو تخت پر بٹھایا۔ اور آپ بہ حیثیت نائب حکمرانی کرنے لگا۔ اس سے امراء میں ناراضگی پھیل گئی۔ انہوں نے ۳۵ دن بعد کافور کو قتل کرکے علاؤالدین کے تیسرے بیٹے قطب الدین مبارک کو نائب بنایا جو رفتہ رفتہ خود بادشاہ بن گیا۔

دکن پر مسلمانوں کا چوتھا حملہ

سلطان علاؤالدین کی وفات پر دہلی میں جو انقلاب آیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر راجہ ہرپال دیو والیٔ دیوگیری نے خراج بھیجنا بند کردیا۔ اس لئے مبارک شاہ خلجی نے دکن پر فوج کشی کی۔ یہ مسلمانوں کا چوتھا حملہ تھا۔ جو دکن پر ہوا۔ شہنشاہ کی آمد کی خبر سن کر ہرپال دیو فرار ہوا۔ لیکن بہت جلد گرفتار کرلیا گیا۔ مبارک نے اس کی کھال کھنچوالی اور اس کے سر کو دیوگیری کے دروازہ پر لٹکا دیا۔ دیوگیری کی سلطنت کا دہلی سے الحاق کرلیا گیا۔ اس طرح ۱۳۱۸ء میں دکن کے قدیم یڈوا خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ اس فتح کی خوشی میں مبارک نے دیوگیری میں

ایک جامع مسجد تعمیر کرائی۔ یہاں سے اس نے کئی مہمیں بھیجیں۔ جنہوں نے تمام ملک مہاراشترا پر قبضہ کرلیا۔

ملک مہاراشترا کے انتظامات سے فارغ ہوکر مبارک نے جنوب میں ساز شوں کا دروازہ بند کرنے کیلئے گلبرگہ، ساگرا اور دوار سمندرم میں فوجی چھاؤنیاں قایم کیں۔ اور یہاں اپنے نمائندے مقرر کئے۔ (جس طرح آج کل انگریزی حکومت میں پولیٹکل ایجنٹ اور چھاؤنیاں قایم کی جاتی ہیں)

اس کے بعد مبارک نے مملکت ورنگل پر توجہ کی۔ جنہوں نے دیوگیری والوں کی دیکھا دیکھی خراج بھیجنا بند کردیا تھا۔

الیٹ اپنی تاریخ ہند میں امیر خسرو کے حوالے سے لکھتا ہے :۔

"بادشاہ نے دیوگیری کی تسخیر کے بعد خسرو خاں کو ورنگل بھیجا۔ خسرو نے ورنگل کا محاصرہ کرلیا۔ پرتاب رودرا دیو نے عاجز ہوکر پناہ مانگی۔ خسرو نے اس کے آگے وہی تین شرائط پیش کیں۔ جو کافور نے دوار سمندرم کے راجہ کے آگے پیش کی تھیں۔ راجہ نے اطاعت قبول کی۔ اور ورنگل کے پانچ اضلاع مسلمانوں کے حوالے کردئے گئے۔ سونا، چاندی۔ بارہ ہزار گھوڑے۔ سونا اور جواہرات دینے کے علاوہ سالانہ خراج دینا بھی قبول کرلیا گیا۔ خسرو نے راجہ کی اس اطاعت پر اس کو تخت پر بیٹھنے اور سفید چتر پکڑنے کی اجازت دیدی اور پھر واپس چلا گیا۔ خسرو کی واپسی پر مبارک نے اس کو ملیبار پر فوج کشی کا حکم دیا۔"

جنوبی ہند پر مسلمانوں کا دوسرا حملہ

جس وقت علاؤالدین کی وفات، کافور کے قتل، اور دہلی میں انقلابات کی خبریں جنوبی ہند میں پہونچیں تو اپنا اثر کئے بغیر نہ رہیں۔ یہ لکھا جا چکا ہے کہ کافور نے سندرا پانڈے کو مدورا میں تخت نشین کرکے واپس ہوا تھا۔ لیکن کافور کی واپسی کے بعد ملک میں پھر خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ لیکن دوارسمندرم کے راجہ بلالا سوم نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ "وہ اپنے گم شدہ رسوخ کو حاصل کرنے اور اپنے اجڑے ہوئے پایۂ تخت کو دوبارہ تعمیر کرنے میں مصروف ہوگیا۔ (سدرن انڈیا انڈ ہر محاٹن انویڈرس)

لیکن ایک دوسری ہندو طاقت یعنے ٹراونکور والوں نے راجہ راوی ورما کلسیکرا کی ماتحت ملیبار اور مدورا پر چڑھائی کردی۔ اور اس جنگ کا اثر اس وقت ان مسلمانوں پر بھی پڑا۔ جو ملیبار میں مقیم تھے۔ اس سے پہلے ہندؤں نے مسلمانوں سے کبھی تعرض نہیں کیا تھا اس لئے کہ مسلمان صرف تاجروں کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ملک کافور کے حملے کے بعد انہیں ملک میں ایک سیاسی حیثیت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ مسلمانوں پر ظلم وستم کی خبریں جب مبارک کو پہونچیں جو اس وقت دکن میں تھا تو اس نے اپنے نومسلم غلام خسرو کو ملیبار فتح کرنے کیلئے بھیجا۔

خسرو دیوگیری سے نکلکر دوارسمندرم میں پہونچا۔ راجہ بلالا سوم نے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ دوارسمندرم سے خسرو جنوب طرف بڑھا۔ یہ خبر سن کر راجہ راوی ورما ٹراونکور کو واپس ہوگیا۔ خسرو کی کسی جگہ بھی مزاحمت نہیں ہوئی۔

مورخ برنی لکھتا ہے :-

"خسرو کو جنوبی ممالک پر چڑھائی کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر ہی راجہ فرار ہو گیا۔ مسلمانوں نے دو شہروں پر قبضہ کر لیا۔ جہاں ان کو دو سو ہاتھی مال غنیمت میں ملے"

خسرو ملیبار ہی میں تھا کہ بارشوں کا موسم شروع ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اسکو ایک سال تک جنوب میں ٹھہرنا پڑا۔

مسلمانوں کے خلاف سازش

انگریزی مورخ ایلیٹ لکھتا ہے :-

"خسرو نے یہیں یعنے جنوبی ہند میں اپنی وہ اسکیم تیار کی جس کے ذریعہ وہ دہلی کے تخت پر قابض ہونا چاہتا تھا"

برنی لکھتا ہے :-

"خسرو ایک نیچ ذات کا نومسلم ہندو غلام تھا۔ جس کو اوائل عمری میں مبارک نے خرید کر لیا تھا۔ مبارک کی محفلوں میں خسرو ساقی گری کرتا تھا۔ مبارک اس پر عاشق تھا اور بغیر اس کے مبارک کو چین نہیں آتا تھا۔"

خسرو نے جنوب کے ہندوؤں کے مشورہ سے دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کی تجویزیں شروع کیں۔ اس تجویز کی اطلاع ایک مسلمان تاجر تغلق خاں کو مل گئی۔ جس کو خسرو نے پکڑ کر قتل کروا دیا۔ (برنی)

جب یہ خبر دہلی میں پہونچی تو امرائے دہلی خسرو کے خلاف ہوگئے۔ لیکن مبارک شاہ کے عشق نے خسرو کو نہ صرف بچا لیا۔ بلکہ اس کے اعزاز کو بڑھا کر اس کو امیر الامراء کا خطاب دیا۔ لیکن خسرو اپنی تجویز سے غافل نہیں تھا۔ اس نے دہلی میں بھی سازش شروع کردی۔ قاضی خاں صدر جہاں نے بادشاہ کو اس فتنۂ خوابیدہ سے آگاہ بھی کیا۔ مگر اس کے سر پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر وہی ہوا جس کا کہ اندیشہ تھا۔ خسرو نے ایک روز موقع پاکر مبارک کو قتل کردیا۔ اور خود تخت نشین ہوا۔ لیکن امراء اس کے خلاف ہوگئے۔ تخت نشینی سے دو ماہ کے بعد خسرو کو قتل کردیا گیا۔ اور خاندان تغلق کا پہلا بادشاہ غیاث الدین تغلق سریر آرائے سلطنت ہوا۔

سدرن انڈیا انڈ ہر محاٹن انویڈرس کا مصنف لکھتا ہے :-

"مورخین کا خیال ہے کہ خسرو نے یہ سازش ہندوستان میں دوبارہ ہندو سلطنت قایم کرنے کیلئے کی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ تمام مسلمان امراء اسکے خلاف ہوگئے تھے" (صفحہ ۱۳)

جنوبی ہندوستان میں ہندوؤں کی نشاۃ ثانیہ خسرو ہی کی رہین منت ہے۔ خسرو ہی نے جنوب کے ہندوؤں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی ایک زبردست سلطنت قایم کریں۔ جو مسلمانوں کو ملک سے باہر نکال دے۔ اس کی تجویز بظاہر یہ تھی۔ کہ وہ شمال میں دہلی کے تخت پر قبضہ کرکے مسلمانوں کو ملک سے باہر کرے۔ اور اسی وقت جنوب کے ہندو بھی اشتراک عمل کرکے مسلمانوں سے بغاوت کریں۔

خسرو کا دہلی میں خاتمہ ہوگیا۔ جس کی وجہ سے جنوب کے ہندوؤں کی ان تمام توقعات کا بظاہر خاتمہ ہوگیا۔ لیکن وہ ان تجاویز سے غافل نہیں رہے جو خسرو نے اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے متعلق ان کے دماغوں پر نقش کرگیا تھا۔ آئندہ صفحات بتائیں گے کہ ہندو

اپنی تجاویز میں کہاں تک کامیاب ہوئے اور ہندوستان سے اسلامی سلطنتوں کے نیست و نابود کرنے میں انہوں نے کس قدر سرگرمی اور جد و جہد سے کام لیا۔

مسلمانوں کا دکن پر پانچواں حملہ

مبارک کے قتل اور خسرو کی تخت نشینی کی خبر جب دکن میں پہونچی تو ورنگل کے راجہ پرتاب رودرا دیوا نے ان تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ جو اس نے مبارک کے حوالے کر دئے تھے۔ اس کی یہ کارروائی اس اسکیم کے ماتحت تھی جو خسرو نے مسلمانوں کے خلاف تجویز کی تھی۔ لیکن خسرو کے قتل اور غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی نے واقعات کو پلٹ کر رکھدیا۔ غیاث الدین تغلق نے تخت نشین ہوتے ہی دکن کے معاملات پر توجہ کی اور اپنے بیٹے محمد کو دکن میں بھیجدیا۔

۱۳۲۱ء میں محمد تغلق نے دکن پہونچ کر ورنگل کا محاصرہ کر لیا۔ چند دن کے بعد پرتاب رودرا دیوا کو اضلاع سے مدد پہونچی۔ تو اس نے قلعہ سے باہر نکلکر تغلق کا مقابلہ کیا۔ لیکن اس کو شکست ہوئی۔ اور اس نے قلعہ بند ہو کر صلح چاہی۔ محمد تغلق نے کہلا بھیجا کہ بغیر کسی شرط کے ورنگل حوالے کر دیا جائے۔ راجہ کے انکار کرنے پر شہر کا دوبارہ سختی سے محاصرہ کر لیا گیا۔ لیکن چند دن کے بعد خود تغلق کو محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔ کیونکہ اس تمام عرصہ میں جب وہ ورنگل کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ دہلی سے اس کو اپنے باپ کی جانب سے کوئی خط نہیں ملا تھا۔ اس سے وہ گھبرا گیا کہ کہیں پائے تخت میں پھر انقلاب نہ ہوا ہو۔ امرائے دہلی جو ساتھ تھے وہ بھی جنگ کی طویل صعوبات سے اکتا چکے تھے۔ انہوں نے اس موقع پر مشہور کر دیا کہ دہلی میں غیاث الدین تغلق کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اور ایک سازش

یہ بھی کی گئی کہ ان امراء کو جو خلجی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سمجھا دیا گیا کہ محمد تغلق ان کے قتل کے درپے ہے۔ سازش کامیاب ہو گئی۔ خلجی امراء اپنی اپنی فوجوں کو لیکر چلے گئے۔ اب صرف وہ فوج باقی رہ گئی جو براہ راست تغلق کے ماتحت تھی۔ یہ دیکھکر محمد تغلق محاصرہ اٹھا کر دیوگیری کو واپس ہوا۔ ورنگل کی ہندو فوج نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور راستہ بھر مسلمانوں کو پریشان کرتی رہی۔ ان کا سامان رسد لوٹ لیا گیا۔ اسلامی فوج کے دو[۲] تین امیر مارے گئے۔ ہندوؤں نے صرف اسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے محمد تغلق کو مرعوب کرنے کیلئے جو مسلمان سپاہی بھی ان کے ہاتھ لگ جاتے تھے۔ ان کے ناک کان کاٹ کر واپس بھیجدیتے تھے۔ ہندوؤں کی چیرہ دستی یہاں تک بڑھ گئی کہ انہوں نے دیوگیری کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن محمد تغلق نہایت استقلال سے دیوگیری میں بیٹھا رہا۔ دیوگیری واپس آنے کے چار ماہ بعد دہلی سے نئی فوج پہونچی اور ساتھ ہی بادشاہ کا حکم لائی کہ ورنگل پر دوبارہ چڑھائی کی جائے۔ وہ امراء جو چلے گئے تھے۔ پھر آکر شامل ہوئے۔ یہ دیکھ کر ہندو پیچھے ہٹ گئے
۱۳۲۳ء میں محمد تغلق نے ورنگل پر دوسری دفعہ چڑھائی کی۔ اور مسلمان ایک سخت جنگ کے بعد فصیل شہر پر قابض ہو گئے۔ پرتاب رودر دیوا اسکی رانیاں، بچے اور تمام امراء کو قید کر کے دہلی بھیجدیا گیا۔ لیکن سلطان غیاث الدین نے پھر اس کو اس کی سلطنت واپس دیکر ورنگل کو واپس بھیجدیا۔ جہاں یہ اپنی وفات تک وفادار رہا۔

مولوی محمد حسین صاحب ایم۔ اے سفرنامہ ابن بطوطہ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:۔

"۱۳۲۱ء میں غیاث الدین تغلق نے اپنے بیٹے جونا خان عرف الغ خان کو ورنگل فتح کرنے بھیجا۔ قلعہ فتح ہونے کو تھا کہ کسی نے افواہ اڑا دی کہ بادشاہ مر گیا۔ قلعہ والوں کو بھی یہ خبر مل گئی۔ انہوں نے محاصرین پر حملہ کیا۔ اور وہ

واپس ہوئے۔ لیکن ۱۳۲۳ء میں پھر الغ خاں نے ورنگل پر چڑھائی کی۔ راجہ پرتاب رودرا دیو کو پکڑ کر جونا خان دہلی بھیجا۔ اس کا بیٹا تھوڑے علاقہ پر حاکم رہا۔"

اس فتح کے بعد محمد تغلق دہلی کو واپس ہوا۔ اور اس کے دوسرے سال یعنے ۱۳۲۴ء میں باپ کی وفات پر تخت نشین ہوا۔

جنوبی ہند پر مسلمانوں کا تیسرا حملہ

محمد تغلق کے تخت نشین ہوتے ہی دکن میں اس کے چچیرے بھائی بہاؤالدین گرشاسپ نے باغی ہو کر خود مختاری کا اعلان کیا۔ بادشاہ نے خواجہ جہاں کو فوج دیکر اس کے مقابلہ کو بھیجا۔ بہاؤالدین کو شکست ہوئی اور وہ فرار ہو کر کمپیلا (جو اناگندی کے بالکل قریب ہے) میں پناہ لی۔ خواجہ جہاں نے اناگندی کا محاصرہ کرلیا۔ لیکن راجہ نے بہاوالدین کو جنوب میں دوارسمندرم کے راجہ کے پاس بھیجدیا۔ اور قلعہ سے نکلکر خواجہ جہاں کے مقابلہ میں صف آرا ہوا۔ اس جنگ میں راجہ اور اس کے تمام سپاہی مارے گئے۔ خواجہ جہاں نے اناگندی پر قبضہ کرلیا۔ اور راجہ کے گیارہ بیٹے اور باقی امراء کو قید کرکے دہلی بھیجدیا۔ جہاں انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔

(نوٹ :۔ ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ اس نے کمپیلا کے راجہ کے تین لڑکوں کو دہلی میں دیکھا۔ ان کے نام "ناصر۔ بختیار اور مہروار تھے۔)

خواجہ جہاں یہاں سے دوارسمندرم پر بڑھا۔ یہاں ایک خونریز جنگ کے بعد مسلمانوں

نے شہر پر قبضہ کر کے اس کو کامل طور پر تباہ کر دیا۔ راجہ بلالا سوم نے تونور (ضلع میسور) میں پناہ لی۔ اور بہاؤالدین کو خواجہ جہاں کے حوالہ کر دیا۔ یہاں سے مسلمان جنوب کی طرف بڑھے۔ اور تلیبار و مدورا پر ۱۳۲۸ء میں قبضہ کر لیا۔ اور ان کو سلطنت دہلی کے صوبے بنا کر صوبہ داریاں قایم کیں۔

اس طرح تمام جنوبی ہند پر پھر ایک بار دہلی کی سیادت و بالا دستی تسلیم کر لی گئی۔ اسی لئے مورخین نے لکھا ہے کہ محمد تغلق کے زمانے میں مسلمانوں کی سلطنت اس قدر وسعت حاصل کی تھی کہ کسی دوسرے مسلمان بادشاہ کو اتنی بڑی سلطنت نہیں ملی۔

شہنشاہ محمد تغلق

جب کل ہندوستان میں ہمالیہ سے لیکر راس کماری تک سلطان محمد تغلق کی شہنشاہیت تسلیم کر لی گئی تو اس نے مفاد سلطنت کا لحاظ کرتے ہوئے پایۂ تخت کو دہلی سے دولت آباد (دیوگیری) بدلنا چاہا۔

گو مورخین بعد میں آنے والے واقعات کے لحاظ سے سلطان محمد تغلق کو پایۂ تخت کے بدلنے پر ہزار الزام دیں۔ لیکن سلطان نے دولت آباد کو اس لئے دہلی پر ترجیح دی کہ یہ شہر ہندوستان کے وسط میں تھا۔ پایۂ تخت بدلنے کے بعد جو ناگوار واقعات پیش آئے۔ وہ اگر وقوع پذیر نہ ہوتے تو شاید ملکی مفاد کے لحاظ سے اس سے بہتر انتخاب ناممکن تھا۔ محمد تغلق کے امراء اگر باغی نہ ہوتے اور اس کی یہ تجویز کامیاب ہو جاتی تو تمام جنوبی ہند کا نقشہ ہی بدل جاتا اور شاید مورخین اس وقت لکھتے کہ محمد تغلق جیسا تجربہ کار اور مدبر بادشاہ

ہندوستان میں اور کوئی نہیں ہوا۔ لیکن قدرت مسلمانوں کے لئے عبرت اور ہندوؤں کے لئے ایک اور مہلت دینا چاہتی تھی۔ اسی لئے تغلق کے عیش پسند امرا نے بغاوت کی۔ اور جنوب میں ہندوؤں کو ایک نئی زبردست سلطنت قائم کرنے میں کامیابی ہوگئی۔ جو آئندہ حملہ آور مسلمانوں کے راستے میں تین سو سال تک آہنی دیوار بنی رہی۔

محمد تغلق یہ دیکھ چکا تھا کہ علاؤالدین مبارک خلجی اور خود اسکے باپ غیاث الدین تغلق کے عہد میں دکن اور جنوبی ہند کی ہندو سلطنتیں کس طرح بار بار مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور ان سے بڑھکر خاص اسکے چچیرے بھائی بہاؤالدین کی بغاوت جنوب میں اور ہندو سلطنتوں کا اس کو پناہ دینا غالباً بادشاہ کو اس فیصلہ کے لئے آمادہ کیا کہ پایۂ تخت دہلی کی بجائے دولت آباد (دیوگیری) میں قائم کیا جائے۔ لیکن امراء جو دہلی کی رہائش سے مانوس ہوچکے تھے۔ انہیں دیوگیری پسند نہ آیا۔ اور سازشیں ہونی شروع ہوئیں۔ بہاؤالدین کے قتل سے بھی (جس کا سر ابن بطوطہ نے ملتان میں سنہ ۱۳۳۳،۳۴ء میں دیکھا تھا) امرا مشتعل تھے۔ سب سے پہلی بغاوت سندھ میں کشلو خاں نے کی۔ اس کے بعد ہی جنوب میں مدورا کے حاکم جلال الدین احسن اور ملیبار کے حاکم سید حسن نے سنہ ۱۳۳۶ء میں بغاوت کی۔ بادشاہ جنوب کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن بیدر کے قریب پہنچکر بیمار ہوگیا۔ اس عرصہ میں ملتان کے گورنر کی بغاوت کی خبر پہونچی۔ بادشاہ بیدر سے واپس ہوگیا۔ بیدر سے واپس ہوکر محمد تغلق کو پھر جنوب میں آنا نصیب نہیں ہوا۔ شہنشاہ کے بیدر سے واپس ہوتے ہی دکن کے مسلمان امرا نے بھی بغاوت کردی۔ اور ایک عرصہ تک آپس کی خانہ جنگی کے بعد متحد ہوکر ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی

مسلمانوں کی اس خانہ جنگی اور خصوصاً دکن کے مسلمان امرا کی شہنشاہ سے بغاوت

اور ان کی آپس کی نا اتفاقی نے جنوب کے ہندوؤں کے لئے خود بخود ایک نادر موقع فراہم کر دیا۔ اس سے بہتر موقع انہیں مل بھی نہیں سکتا تھا۔ گو خسرو زندہ نہیں تھا اور وہ اپنی تجویز میں (کہ مسلمانوں کو ملک سے نکال دیا جائے) کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن اس کی تجویز جنوب میں برابر کام کرتی رہی۔ ہندوؤں نے سمجھ لیا کہ جب تک ان میں اتحاد نہ ہوگا وہ اپنی تجویز میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے انہوں نے اتحاد کی بنیاد ڈالی۔

فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"اس وقت کشنا نایک پسر لدر دیو والیٔ ورنگل میں رہتا تھا۔ جریدہ بلال دیو کے پاس جو راۓ عظیم الشان کرناٹک کا تھا جا کر کہا کہ مسلمان لوگ دیار تلنگ اور کرناٹک میں داخل ہوتے اور عزیمت رکھتے ہیں کہ ہمیں ایک بار مستاصل کریں۔ اس بارے میں ایک فکر کرنا چاہیئے۔ بلال دیو نے جمیع اعیان مملکت کو حاضر کر کے مشورہ کیا۔ اور بعد تفکر اور امعان نظر کر کے قرار پایا کہ بلال دیو جمیع ممالک اپنے کو عقب چھوڑ کر خود سرحد راہ سپاہ اسلام میں تخت گاہ بناوے اور معبر اور دہور سمند اور کنبیلہ کو مسلمانوں کے تصرف سے برآوردہ کرے۔ اور کرشنا نایک صرف ہمت کر کے ورنگل کو بھی کہ اس ایام میں فرصت ہے۔ عوزہ دیوان دہلی سے برآوردہ کرے۔ اور بلال دیو۔۔ کوہستان اپنی سرحد کی جائے صعب میں ایک شہر بنام اپنے فرزند بیجن راۓ کے بنا کیا۔ کہ مشہور بیجن نگر ہوا۔ اور رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے بیجانگر ہوا۔"

(ترجمہ فرشتہ اردو مطبوعہ نولکشور)

فرشتہ نے ورنگل کے راجہ لدر دیو کو اس اتحاد کا بانی بنایا ہے۔ لیکن جنوبی ہند کی

تاریخ اور کتبے اس کا سہرا ہلال دیوسوم کے سر باندھتے ہیں۔ اور اب تک جس قدر لٹریچر اس موضوع پر مدراس۔ میسور۔ بنگلور اور دھاڑواڑ میں شایع ہو چکا ہے۔ وہ ہلال دیوسوم کو ہی اس اتحاد کا بانی بتاتا ہے۔

لیکن مورخ بھٹا چاریہ لکھتا ہے :-

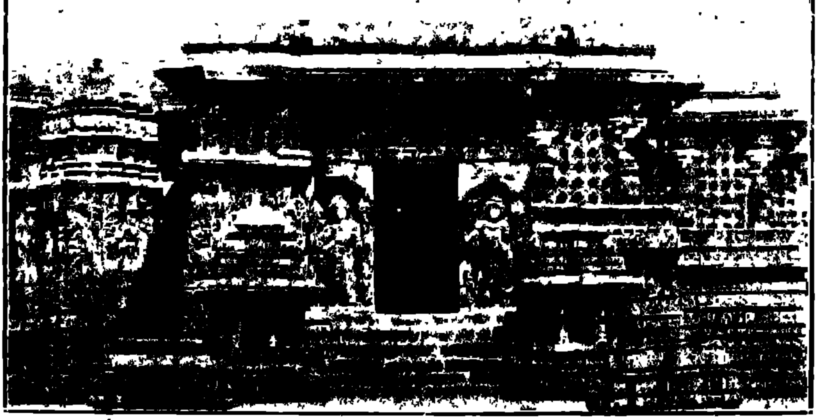
"ہندو مذہب، ہندو کلچر، ہندو تہذیب و تمدن اور خود ہندو کی ہستی خطرے میں ہے۔ یہ وہ الفاظ تھے جو سرینگری کے مشہور تیرتھ کے جگت گرو مہادیوپا کی زبان سے نکلے۔ اور تمام جنوبی ہند میں گونج گئے"

حقیقت بھی یہی تھی۔ کہ مسلمانوں کے پے در پے حملوں نے جنوبی ہند کو اس قدر غیر محفوظ بنا دیا تھا کہ اگر یہ اتحاد نہ ہوتا تو جنوبی ہند کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ جگت گرو کی آواز پر ہر ہندو ریاست، ہر مندر اور ہر ہندو کے گھر سے مال وزر کی ایک گنگا بہہ نکلی۔ جو کہ ایک نئی سلطنت کے قایم کرنے میں کام آئی۔ سرینگری۔ سری رنگم اور ترپتی کے مشہور تیرتھوں کے خزانے بھی اس کام کیلئے وقف ہو گئے۔ ہندوؤں کے اس اتحاد کا سہرا چاہے ورنگل کے سر ہو یا دوار سمندرم کے راجہ بلالا سوم کے سر۔ لیکن اسقدر تو یقینی امر ہے کہ انہوں نے اس اتحاد کی بنیاد خالص مذہب پر رکھی۔ اور شاید جب تک مذہب کی سیادت نہ ہوتی تو یہ تحریک کامیاب بھی نہ ہو سکتی تھی (سرینگری ملک میسور میں جنوبی ہند کا ایک مشہور و مقدس تیرتھ ہے اور اس کا اثر واقتدار تمام جنوبی ہند پر چھایا ہوا ہے۔ یہاں کے بڑے گرو نے اپنے مذہبی تقدس واثر سے کام لیکر اس اتحاد کو مضبوط بنایا۔ اور یہ اسی کارروائی کا نتیجہ تھا کہ جنوب کی کل ہندو آبادی اس اتحاد میں شریک ہو گئی۔ یہ کام بالکل خموشی اور رازداری سے کیا گیا۔ اور ایک عرصہ تک شمال یا دکن کے مسلمانوں کو یہ معلوم تک نہ ہو سکا کہ ایک نئی طاقت انکے مقابلہ میں ابھر رہی ہے۔

سرینگری (میسور)



دوارسمدرم (موجودہ ہلے بید) مندر



ہندو اتحاد کی اصلی غرض و غایت

جگت گرو مہا دیویا کے یہ الفاظ (جو گذشتہ باب میں لکھے گئے ہیں)

"ہندو مذہب، ہندو کلچر، ہندو تہذیب و تمدن، اور خود ہندو کی ہستی خطرہ میں ہے"

اپنے اندر جس قدر حقائق رکھتے تھے۔ وہ ایک سرسری نظر سے سمجھ میں نہیں آسکتے۔

جگت گرو مہا دیویا نے جس خطرہ کو محسوس کیا وہ مسلمان حملہ آوروں سے نہیں۔ بلکہ ان کے مذہب اور کلچر کی وجہ سے محسوس کیا تھا۔ کیونکہ ان حملہ آوروں کا مذہب (اسلام) ہندو مذہب کا بالکل ضد تھا۔

ہندو مذہب و سوسائٹی کی بنیاد تناسخ، چھوت چھات، ذات و خون اور اعلےٰ و ادنیٰ کے امتیاز پر رکھی گئی تھی۔ بخلاف اس کے اسلام ان اصولوں کا مخالف اور مساوات کا حامی تھا۔

کل ہندوستان پر قبضہ پانے کے بعد برہمنوں نے ہندو مذہب کے لئے مدافعانہ پالیسی اختیار کر لی تھی۔ کہ چھوت چھات، ذات و خون اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز باقی رہے۔ اس کے خلاف اسلام جارحانہ پالیسی کو اپنے ساتھ لایا کہ تبلیغ کے ذریعہ اپنے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ کرے۔

یہی وہ اسلام کے اصول تھے جن سے جگت گرو مہا دیویا نے ہندو مذہب کے لئے خطرہ محسوس کیا۔ یہاں ہندو مذہب سے مراد برہمن اور اعلےٰ ذات کے ہندو ہیں۔ یہ لوگ

کسی حالت میں بھی اپنے اقتدار سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اور نہ یہ اقتدار ان سے کوئی چھین سکتا تھا۔

یہ تو ان ہندوؤں کو معلوم تھا کہ مسلمان بھی بہ جبر ان کے اس اقتدار کو نہیں چھینیں گے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ مسلمان جس مذہب کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کے اصول ہر پہلو سے ہندو اصول کے مخالف تھے۔ مقابلہ شخصیتوں کے درمیان نہیں۔ بلکہ مذہب اور مذہب! کلچر اور کلچر کے درمیان تھا۔ اور اسی مقابلہ کے لئے جگت گرو مہا دیو یا نے ہندوؤں کو تیار کیا اور سلطنت وجیا نگر کی بنیاد رکھی گئی۔

کہا جائیگا کہ محمد تغلق اور ملک کافور کے حملوں سے صدہا سال پیشتر سے بھی مسلمان اس ملک میں آباد تھے۔ یعنی اوائل اسلام ہی سے مسلمان تاجروں کی آمد و رفت اس ملک میں شروع ہوگئی تھی۔ اور ہندوؤں نے ان سے کبھی تعرض نہیں کیا۔ لیکن ان مسلمانوں کی حیثیت کچھ اور تھی۔ وہ صرف تجارت کے لئے آئے تھے اور بہ حیثیت رعایا کے رہتے تھے۔ اس لئے انہیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ اگر ان مسلمانوں نے یہاں شادیاں کیں یا انہیں دیکھ کر چند لوگ مسلمان ہوگئے تھے تو انہیں قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مگر شہنشاہ محمد تغلق کے حملے نے مسلمانوں کو اب ایک سیاسی اہمیت دیدی تھی۔ مسلمان رعایا نہیں بلکہ ملک کے حاکم بن گئے تھے۔ انکی شخصیت بہ حیثیت حکمران قوم ہونے کے اب کچھ اور ہوگئی تھی۔ اور یہ لازمی بات تھی کہ ان سے دوسری قومیں اثر پذیر ہوتیں۔

اسلام کے اصول، مساوات اور تبلیغ یہ وہ چیزیں تھیں جن سے خوفزدہ ہوکر اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے اتحاد کی تحریک کی اور سلطنت وجیا نگر کی بنیاد رکھی۔

بہمنی سلطنت

محمد تغلق سے اس کے مسلمان امراء کی بغاوت اسلامی تاریخی نقطۂ نظر سے حد درجہ افسوسناک ہے مسلمانوں کی قوت اس بغاوت کی وجہ سے منتشر ہو کر رہ گئی۔ اور پھر ان کو سنبھلنے تک عرصہ لگ گیا۔ اور یہی وہ عرصۂ مہلت ہے جس سے جنوب کے ہندوؤں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور جس وقت مسلمانوں نے اپنے اندرونی معاملات سے فارغ ہو کر جنوب کی طرف نظر اٹھائی تو ان کے مقابل ایک زبردست سلطنت قایم ہو چکی تھی۔ جو نہ صرف مسلمانوں کے حملوں کا جواب دے سکتی تھی۔ بلکہ مسلمانوں کی باہمی آویزش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اگر چاہتی تو بڑھ کر دکن میں مسلمانوں کا خاتمہ بھی کر سکتی تھی۔ یہ دکن کے مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے اندرونی تنازعات ختم ہونے کے بعد ان کی جو سلطنت قایم ہوئی۔ وہ ہر حیثیت سے جنوب کی ہندو سلطنت کے مدِ مقابل تھی۔ ورنہ ان کا خاتمہ اسی وقت نہ ہوتا تو چند سال بعد یقینی تھا۔ چاہے اس کو ہندوؤں کی غلطی سے تعبیر کیا جائے یا فرزانگی سے۔ انہوں نے بھی اپنی تمام جد و جہد کو دریائے کرشنا سے نیچے صرف جنوبی ہند میں محدود رکھا۔ ممکن تھا کہ اگر وہ دریائے کرشنا سے آگے بڑھ کر دکن کے معاملات میں دخل دیتے تو مسلمان دکن مشکلات میں گرفتار ہو جاتے۔ یا یہ بھی ممکن تھا کہ اس دخل دہی سے خود ہندوؤں کو وہ کامیابی نصیب نہ ہوتی جو انہوں نے جنوبی ہندوستان میں حاصل کی۔

تاریخ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے نہایت احتیاط سے کام لیا۔ دکن کے مسلمانوں کے معاملات میں دخل نہ دیکر وہ خاموشی سے اپنی قوت بڑھانا چاہتے

تھے۔ جس وقت انہیں یہ قوت حاصل ہو چکی تو انہوں نے دکن کی طرف نظر اٹھائی۔ لیکن اس وقت تک مسلمان بھی اپنی خانہ جنگی کو ختم کر کے ایک نئی زبردست سلطنت قائم کر چکے تھے، جس کو تاریخ میں بہمنی سلطنت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلطنت کا بانی ظفر خاں تھا۔ جس نے تخت نشین ہونے پر علاؤالدین کانگو بہمنی کا خطاب اختیار کیا۔ اس سلطنت کا پایۂ تخت گلبرگہ تھا۔ اور جنوب میں ہندوؤں نے جو سلطنت قائم کی تھی۔ اس کا نام سلطنت وجیانگر تھا۔ (ظفر خاں کا دوسرا نام تاریخوں میں حسن لکھا ہوا ہے)

(**نوٹ** :- بہمنی کے نام پر اکثر مورخین کو دھوکہ ہوا ہے وہ لکھتے ہیں :- حسن بچپن میں ایک برہمن کے ہاں ملازم تھا۔ اس برہمن نے پیش گوئی کی تھی کہ بڑا ہونے پر وہ کسی دن بادشاہ ہوگا۔ حسن جب بادشاہ ہوا تو اس کو وہ بات یاد آئی اور اس نے شکر گذاری کے طور پر اپنے نام کے ساتھ بہمنی کا اضافہ کیا اور اس کا خاندان اسی نام سے مشہور ہوا۔)

یہ امر ابھی تک مشتبہ ہے کہ آیا حسن کسی برہمن کے پاس ملازم تھا یا نہیں۔ اور گنگو سے مراد کیا ہے۔ ممکن ہے کہ حسن کسی برہمن کے پاس ملازم رہا ہو۔ اور اس برہمن کا نام گنگو ہو۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ اس نے صرف اس برہمن کے خیال سے اپنے خاندان کو بہمنی کا نام دیا تھا حسن دراصل ایرانی النسل اور تاریخ ایران کے مشہور ہیرو بہمن اسفندیار کی اولاد سے تھا۔ اسی لئے اس کا خاندان بھی بہمنی کہلایا۔

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل مورخہ ۱۹۰۴ء میں اس کے متعلق ایک مضمون چھپ چکا ہے۔ اور اس میں بھی یہی لکھا ہے کہ حسن ایران کے سپہ سالار بہمن اسفندیار کی اولاد سے تھا۔ اور یوں بھی دیکھا جائے تو صحیح لفظ برہمن سے بہمن نہیں۔ اگر حسن اپنے خاندان کو برہمن کے لحاظ سے نام دینا چاہتا تو وہ نام برہمنی ہوتا نہ کہ بہمنی۔

شجرے

مسلمانوں کی بہمنی سلطنت اور ہندوؤں کی وجیانگر سلطنت اپنی مدۃ العمر تک ایک دوسرے کی رقیب رہی ہیں۔ اس لئے تاریخی واقعات کو سمجھنے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ چند ایسے شجرے دئے جائیں۔ جن سے بآسانی یہ معلوم ہو کہ ایک دوسرے کا ہم عصر کون تھا

(پہلا شجرہ :- سلاطین بہمنی کے نام اور انکی مدت حکومت

دوسرا شجرہ :- شجرۂ خاندان عادل شاہی " "

تیسرا شجرہ :- شجرۂ خاندان قطب شاہی " "

چوتھا شجرہ :- خاندان نظام شاہی " "

پانچواں شجرہ :- راجگان وجیانگر " "

چھٹاں شجرہ :- سلاطین ہم عہد " "

(نوٹ :- بہمنی خاندان کے زوال پر دکن میں مسلمانوں کی دوسری پانچ سلطنتیں قائم ہوگئیں یعنے بیجاپور، احمدنگر، گولکنڈہ، بیدر اور برار۔ ان پانچ سلطنتوں میں اول الذکر تین سلطنتوں کو راجگان وجیانگر سے واسطہ رہا ہے۔ اس لئے ان تینوں سلطنتوں کے سلاطین کے شجرے بھی دئے گئے ہیں)

شجرۂ سلاطین خاندان بہمنیہ

(پائے تخت گلبرگہ)

علاؤالدین حسن کانگو (ظفر خان)	۱۳۴۷ء	سے	۱۳۵۸ء	تک
محمد شاہ اول	۱۳۵۸	"	۱۳۷۵	"
مجاہد شاہ	۱۳۷۵	"	۱۳۷۸	"
داؤد شاہ		۱۳۷۸		
محمود شاہ	۱۳۷۸	"	۱۳۹۷	"
غیاث الدین		۱۳۹۷		
شمس الدین		۱۳۹۷		
فیروز شاہ	۱۳۹۷	"	۱۴۲۲	"
احمد شاہ ولی اول	۱۴۲۲	"	۱۴۳۵	"
علاؤالدین احمد ثانی	۱۴۳۵	"	۱۴۵۸	"
ہمایوں شاہ ظالم	۱۴۵۸	"	۱۴۶۱	"
نظام شاہ	۱۴۶۱	"	۱۴۶۳	"
محمد شاہ لشکری ثانی	۱۴۶۳	"	۱۴۸۲	"
محمود شاہ ثانی	۱۴۸۲	"	۱۵۱۸	"
احمد شاہ ثانی	۱۵۱۸	"	۱۵۲۱	"
علاؤالدین سوم		۱۵۲۱		
ولی اللہ شاہ	۱۵۲۱	"	۱۵۲۳	"
کلیم اللہ شاہ	۱۵۲۳	"	۱۵۲۹	"

(احمد شاہ ثانی کے بعد جو تین بادشاہ ہوئے ہیں وہ برائے نام تھے۔)

شجرۂ خاندان عادل شاہی

پائے تخت: بیجاپور

یوسف عادل شاہ	۱۴۸۹ء	سے	۱۵۱۰ء تک	
اسماعیل عادل شاہ	۱۵۱۰	"	۱۵۳۴	"
ملو عادل شاہ	۱۵۳۴	"	۱۵۳۵	"
ابراہیم عادل شاہ اول	۱۵۳۵	"	۱۵۵۷	"
علی عادل شاہ اول	۱۵۵۷	"	۱۵۸۰	"
ابراہیم عادل شاہ ثانی	۱۵۸۰	"	۱۶۲۷	"
محمد عادل شاہ	۱۶۲۷	"	۱۶۵۶	"
علی عادل شاہ ثانی	۱۶۵۶	"	۱۶۷۲	"
سکندر عادل شاہ	۱۶۷۲	"	۱۶۸۶	"

۱۶۸۶ء میں شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے بیجاپور پر قبضہ کر کے خاندان عادل شاہی کا خاتمہ کر دیا۔

شجرۂ خاندانِ قطب شاہی

پائے تخت گولکنڈہ

قلی قطب شاہ	۱۵۱۲ء	سے	۱۵۴۳ء	تک
جمشید قطب شاہ	۱۵۴۳	سے	۱۵۵۰	"
سبحان قلی قطب شاہ	۱۵۵۰			
ابراہیم قلی قطب شاہ	۱۵۵۰	سے	۱۵۸۰	"
محمد قلی قطب شاہ	۱۵۸۰	"	۱۶۱۲	"
محمد قطب شاہ	۱۶۱۲	"	۱۶۲۶	"
عبداللہ قطب شاہ	۱۶۲۶	"	۱۶۷۲	"
ابوالحسن تانا شاہ	۱۶۷۲	"	۱۶۸۷	"

۱۶۸۷ء میں شہنشاہ اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر قبضہ کر کے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔

شجرۂ خاندانِ نظام شاہی

(پائے تخت احمد نگر)

احمد نظام شاہ	۱۴۹۰ء	سے	۱۵۰۸ء تک	
برہان نظام شاہ اول	۱۵۱۸	"	۱۵۵۴	"
حسین نظام شاہ	۱۵۵۴	"	۱۵۶۵	"
مرتضیٰ نظام شاہ	۱۵۶۵	"	۱۵۸۶	"
میراں نظام شاہ	۱۵۸۶	"	۱۵۸۹	"
اسماعیل نظام شاہ ثانی	۱۵۸۹	"	۱۵۹۰	"
برہان نظام شاہ ثانی	۱۵۹۰	"	۱۵۹۴	"
ابراہیم نظام شاہ	۱۵۹۴	"	۱۵۹۵	"
احمد شاہ ابن شاہ طاہر	غاصب۔ چند ماہ تک قبضہ کر لیا تھا۔			
بہادر نظام شاہ	۱۵۹۵	سے	۱۶۰۳ تک	
مرتضیٰ نظام شاہ	۱۶۰۳	"	۱۶۳۰	"
حسین نظام شاہ	۱۶۳۰	"	۱۶۳۳	"

(۱۶۳۳ء میں مغلوں نے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا)

شجرۂ راجگان وجیانگر

سنگما خاندان

(راجگان وجیانگر کا پہلا خاندان)

ہری ہر اول	۱۳۳۶ء	سے	۱۳۴۶ء تک
بکا رایا اول	۱۳۴۹	"	۱۳۷۹ "
ہری ہر دوم	۱۳۷۹	"	۱۴۰۴ "
دیورائے اول	۱۴۰۴	"	۱۴۲۲ "
وجے رایا	۱۴۲۲	"	۱۴۲۴ "
دیورایا دوم	۱۴۲۴	"	۱۴۴۹ "
ملکارجنا	۱۴۴۹	"	۱۴۶۵ "
ویروپکشا	۱۴۶۵	"	۱۴۷۹ "

سنہ ۱۴۷۹ء سے سنہ ۱۴۸۲ء تک ویروپکشا کے دو لڑکوں کو یکے بعد دیگرے تخت نشین کیا گیا۔ لیکن ان کے نا قابل ہونے کی وجہ سے امراء نے نرسمہا کو تخت نشین کیا۔ جو اس وقت فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔

سلووا خاندان

(راجگان وجیانگر کا دوسرا خاندان)

نرسمہا اول	۱۴۷۹ء	سے	۱۴۸۹ء تک
نرسمہا دوم	۱۴۸۹	سے	۱۴۹۳ "
نرسا نایک۔ ریجنٹ	۱۴۹۳	سے	۱۴۹۷ "

تلووا خاندان

(راجگانِ وجیانگر کا تیسرا خاندان)

نرسا نایک	۱۴۹۹ء	سے	۱۵۰۳ء تک
ویرا نرسمہا	۱۵۰۳	"	۱۵۰۹ "
کرشنا دیورایا	۱۵۰۹	"	۱۵۳۰ "
اچوت رایا	۱۵۳۰	"	۱۵۴۲ "
سداسیو رایا	۱۵۴۲	"	۱۵۶۰ "

(راجہ سداسیو رایا برائے نام تھا۔ تمام اختیارات رام راج اور اس کے دو بھائی وینکٹ دری اور ترملا کے ہاتھ میں تھے)

۱۵۶۵ء میں سلطنت وجیانگر کا تالیکوٹہ کی جنگ میں خاتمہ ہوگیا۔ اور ترملا نے سداسیو رایا کو لیکر پلگنڈہ چلا گیا۔ جہاں چار سال بعد اس کو زہر دیکر ختم کردیا۔ اور آپ راجہ بن بیٹھا۔

ترملا کے بعد اور چند راجہ اس کے خاندان میں گذرے ہیں۔ لیکن انکی حیثیت پالیگاروں سے زیادہ نہیں تھی۔ اس لئے یہاں شجرہ نہیں دیا گیا۔ لیکن کتاب میں ان کا بیان آگیا ہے۔

شجرۂ سلاطین ہم عہد

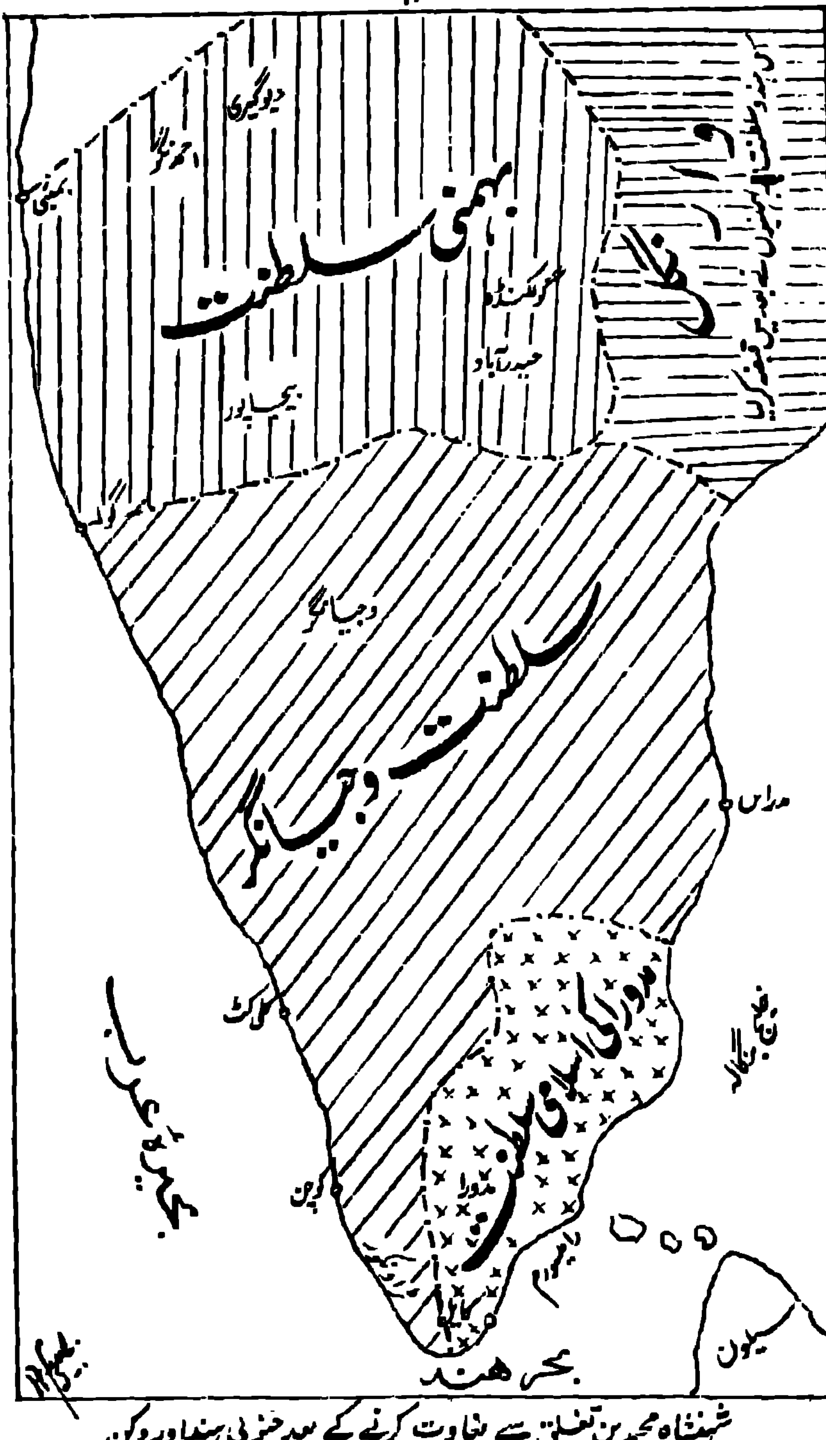
(سلاطین بہمنیہ، بیجاپور، احمدنگر، گولکنڈہ اور راجگان وجیانگر میں ایک دوسرے کا معاصر کون تھا۔)

راجگانِ وجیانگر	شاہانِ دہلی	سلاطینِ بہمنیہ
(۱) خاندان سنگما		
ہری ہر اول	سلطان محمد تغلق	
بکا رایا اول		علاؤالدین حسن کانگو بہمنی۔ محمد شاہ اول۔ مجاہد شاہ بہمنی۔ داؤد شاہ بہمنی۔ محمود شاہ بہمنی
ہری ہر دوم		غیاث الدین بہمنی۔ شمس الدین بہمنی۔ فیروز شاہ بہمنی
دیورا یا اول		فیروز شاہ بہمنی
وجے رایا		احمد شاہ اول بہمنی
دیورایا دوم		احمد شاہ بہمنی اول۔ علاؤالدین احمد شاہ ثانی بہمنی
ملیکارجنا		علاؤالدین احمد شاہ ثانی بہمنی۔ ہمایوں شاہ بہمنی
		نظام شاہ بہمنی۔ محمد شاہ ثانی بہمنی
ویروپکشا		محمد شاہ ثانی بہمنی

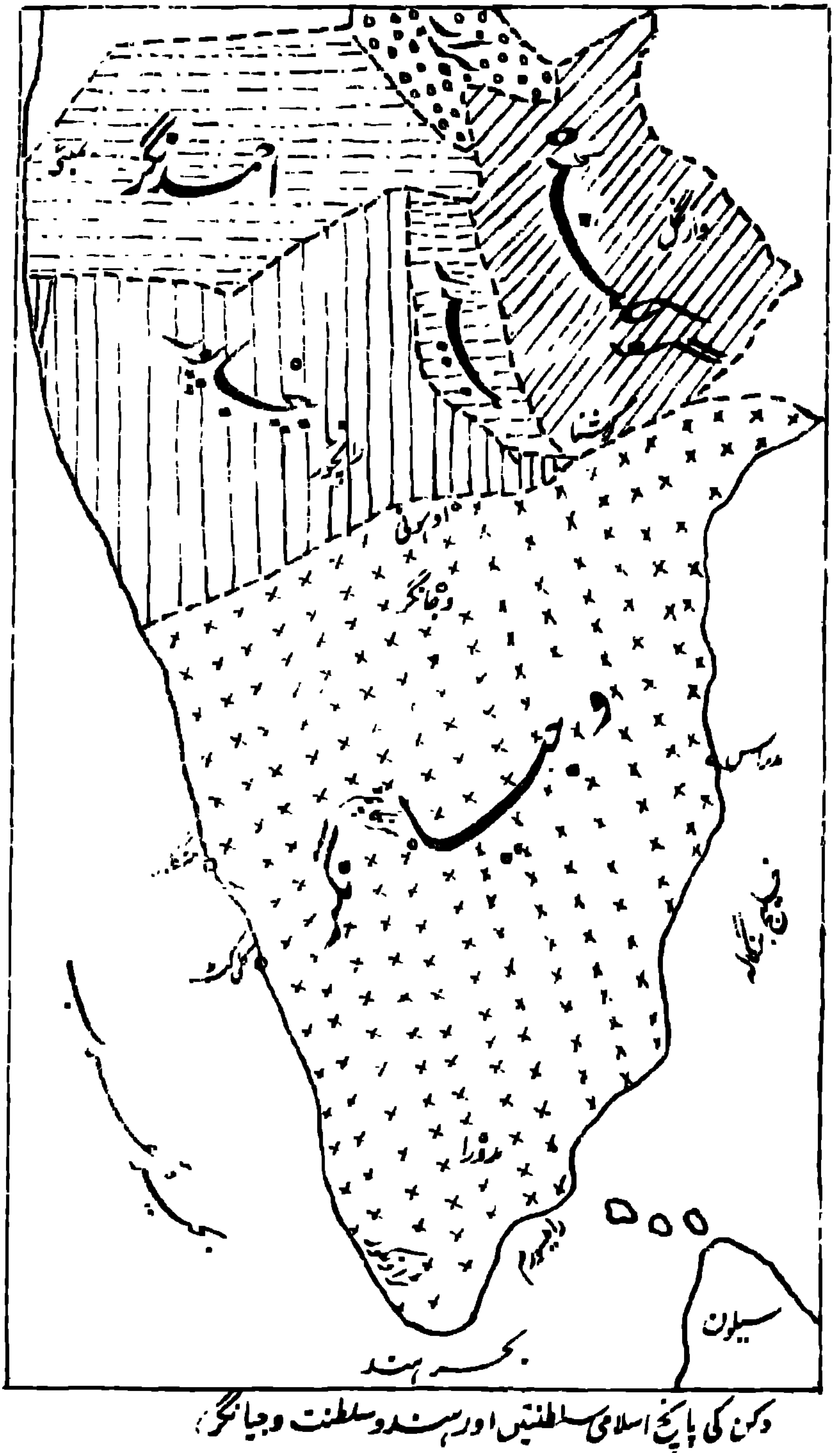
(نوٹ:- سلطان محمد تغلق کے بعد شاہان دہلی کا دکن اور جنوبی ہند سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا اس لئے انکے نام حذف کر دئے گئے ہیں۔)

(۲) خاندان سلووا		
نرسمہا اول		محمود شاہ ثانی بہمنی۔ یوسف عادل شاہ بیجاپور احمد نظام شاہ احمد نگر
نرسمہا دوم		یوسف عادل شاہ بیجاپور۔ احمد نظام شاہ احمد نگر
نرسا نایک۔ ریجنٹ		(محمود شاہ ثانی کے بعد بہمنی سلطنت بالکل کمزور ہو گئی۔ اور دکن کی دوسری اسلامی سلطنتیں بیجانگر کے مقابلہ میں آگئیں۔ اس لئے بہمنی سلاطین کے نام نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ م)

(۳) خاندان تلووا	سلاطین بیجاپور	سلاطین گولکنڈہ	سلاطین احمد نگر
نرسا نایک	یوسف عادل شاہ		احمد نظام شاہ
ویرا نرسمہا	"		"
کرشنا دیورایا	یوسف عادل شاہ۔ اسمٰعیل عادل شاہ	سلطان قلی قطب شاہ علی برید والی بیدر	احمد نظام شاہ۔ برہان نظام شاہ
اچیوت رایا	اسمٰعیل عادل۔ ابراہیم عادل شاہ	" "	برہان نظام شاہ
سدا سیورایا	ابراہیم عادل شاہ۔ علی عادل شاہ	سلطان قلی قطب شاہ جمشید قطب۔ سبحان قطب ابراہیم قطب	برہان نظام شاہ۔ حسین نظام شاہ علی برید۔ والی بیدر



شہنشاہ محمد بن تغلق سے بغاوت کرنے کے بعد جنوبی ہند اور دکن



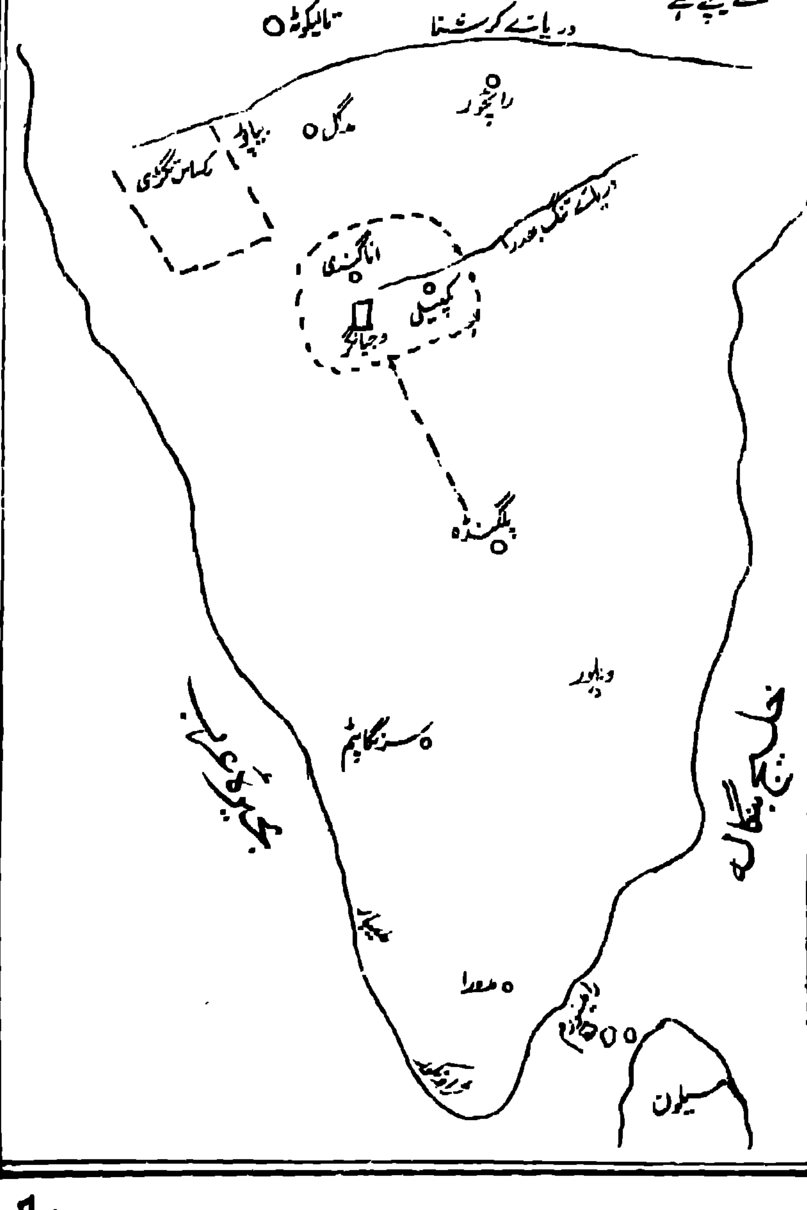
دکن کی پانچ اسلامی سلطنتیں اور ہندو سلطنت وجیانگر

نقشہ جس میں وجیانگر، اناگندی اور کپیلی کے شہروں کا جائے وقوع دکھلایا گیا ہے۔

اس نقشہ میں تالیکوٹہ کا میدان جنگ بھی دکھلایا گیا ہے

یہ جنگ بیجاپور اور رکساس تگڑی کے میدان میں ہوئی جو دریائے کرشنا سے نیچے ہے

بیجاپور O



تاریخ وجیانگر

وجیانگر کی بنیاد

سنہ ۱۳۱۰ء کے بعد سے مسلمانوں کے پے در پے حملے جنوب کے ہندوؤں کو خائف کر چکے تھے۔ انہیں نظر آ رہا تھا کہ اگر کوئی تدارک نہ کیا گیا تو جس طرح شمالی ہند مستقل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں آ چکا ہے۔ جنوب کی حالت بھی یہی ہو جائیگی۔ انتہائے جنوب میں مدورا کی پانڈیا سلطنت دم توڑ چکی تھی۔ اور وہاں مسلمان دہلی سے باغی ہو کر ایک نئی سلطنت قایم کر رہے تھے۔ ہوسے سالا سلطنت بھی قریب المرگ تھی۔ راجہ بلالا سوم کا ملک پر وہ اثر و رسوخ باقی نہیں تھا۔ جو مسلمانوں کے حملے سے بیشتر قایم تھا۔ لیکن اس نے فرزانگی سے کام لیکر ہندوؤں میں اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ

(۱) مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا ایک متحدہ محاذ بنائے۔

(۲) ہوسے سالا سلطنت کی عظمت رفتہ کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔

(۳) انتہائے جنوب میں مدورا کے مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ کہ پورا جنوبی ہندوستان ہندوؤں کے قبضہ میں رہے۔

اس مقصد کو لیکر اس نے سب سے اول پایۂ تخت کو محفوظ بنانا چاہا۔ ملک کافور کے ہاتھوں دواسمندرم کی پہلی تباہی کے بعد اس نے اس کو دوبارہ تعمیر کیا۔ ابھی یہ تعمیر ہو رہا تھا کہ محمد تغلق کی فوجوں نے اس کو پھر تباہ کر دیا۔ راجہ بلالا نے اب اس کو غیر محفوظ سمجھ کر سرنگاپٹم کے شمال میں تنوز کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اور اپنی شمالی سرحد پر دریائے تنگ بھدرا کے جنوبی کنارے پر اپنے بیٹے کے نام پر ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی۔ (جس کا ذکر فرشتے کے حوالے سے آگے آچکا ہے) اس نئے شہر کی تعمیر سے اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان حملہ آوروں کو سرحد ہی پر روک دیا جائے۔ ہندو مورخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کا نام سرنگری کے گرو مہا دیو یا کے خیال پر ودیارانیا پر ودیا رائے نگر یا ودیا نگر رکھا گیا۔ جو رفتہ رفتہ وجیا نگر بن گیا (ودرایانا مہا دیویا ہی وہ گرو ہے جس نے ہندوؤں کے اتحاد کو مذہبی رنگ دیکر کامیاب بنایا)

راجہ بلالا سوم نے جس جگہ کو انتخاب کیا تھا اس کے متعلق مورخ بھٹا چاری لکھتا ہے :-

"دریائے تنگ بھدرا کے جنوبی ساحل پر ایک چٹیل میدان میں جو تین طرف سیاہ ہیبت ناک پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اور جس کے شمال میں دریائے تنگ بھدرا اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ وجیانگر کی بنیاد رکھی گئی"

لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ہندوؤں کے اس اتحاد سے فائدہ اٹھانا راجہ بلالا سوم کے نصیب میں نہیں بلکہ کسی اور کے نصیب میں تھا۔ جس طرح مسلمان دکن میں خانہ جنگی کی وجہ سے منتشر تھے۔ اسی طرح جنوب میں بھی کوئی زبردست سلطنت نہ ہونے کے باعث ہندو بھی پراگندہ تھے۔ ہر سردار یا رئیس اپنی اپنی جگہ پر خود مختار بن بیٹھا تھا راجہ بلالا سوم کے حالات گذشتہ سطور میں آچکے ہیں کہ کس طرح مسلمانوں کے دو حملوں

نے اس کو کمزور بنا دیا تھا۔ اس کی اس کمزوری سے جس شخص نے فائدہ اٹھایا وہ بلالا سوم کا ایک سردار تھا۔ جس کا نام ہری ہر تھا۔ اس نے اپنی طاقت کو مضبوط بنانا شروع کیا۔ اور اس کام میں اس کے دوسرے چار بھائی بکا کپنا۔ مرپی اپا اور مدپا نے بھی تائید کی۔ جو مختلف مقامات میں بلالا سوم کے گورنر تھے۔ ہری ہر نے باوجود طاقتور ہونے کے اپنے آقا بلالا سوم سے سرتابی نہیں کی۔ بلکہ وہ خاموشی سے اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ اس کے اس کام میں جس شخص نے سب سے بڑھکر تائید کی وہ گرو مہادیوا تھا۔ جس کی دوربین نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ راجہ بلالا اور اس کی ہوسے سالا سلطنت پنپنے والی نہیں ہے۔ اور ہوا بھی یہی کہ چند دن کے بعد راجہ بلالا سوم جس نے اپنے تیسرے مقصد کی تکمیل کیلئے مدورا کے مسلمانوں پر چڑھائی کی تھی۔ جنگ میں مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہوسے سالا سلطنت کا بھی ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ اور ہری ہر کا خاندان برسر حکومت آ گیا۔ ہری ہر نے اپنے گرو کے مشورے سے وجیانگر کو اپنا پائے تخت بنایا۔ جس کا ثبوت اس کتبے سے ملتا ہے جو ابھی حال میں مدراس کے محکمۂ آثار قدیمہ کو ملا ہے۔ اس پر یہ الفاظ کندہ ہیں :۔

"اس کی فصیل ہیما کوٹ۔ اس کی خندق مقدس تنگ بھدرا۔ اس کا محافظ ویرو پکشا ہے جو تمام دنیا کا محافظ ہے۔ اور اس کا حکمران ہری ہر ہے جو بادشاہوں کا بڑا بادشاہ ہے۔"

وجیانگر کے متعلق تمام ہندو مورخین کو اتفاق ہے کہ اس کی بنیاد اسی جگہ رکھی گئی تھی۔ جہاں پر ڈھائی ہزار سال پیشتر شہر کشکندہ آباد تھا (کشکندہ کے متعلق اگلے صفحات میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ سگریو نامی راجہ کا پایۂ تخت تھا۔ جس نے رام چندر جی کو راون کے مقابلہ میں مدد دی تھی۔)

بھی اس کا تعاقب کیا۔ تنگ آکر راجہ نے اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا۔ اور قلعہ سے نکلکر جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ شہر میں صرف چند بڑے آدمی باقی رکھے تھے۔ ان میں ایک تو راجہ کا وزیر تھا۔ اور دوسرا خزانچی۔ محمد تغلق دو سال تک اناگندی میں رہا۔ جب شمالی ہند میں بغاوت ہوئی تو وہ یہاں اپنے ایک نائب ملک نبی کو چھوڑ کر دہلی چلا گیا۔ سلطان کے جانے کے بعد تمام ملک میں بغاوت پھیل گئی۔ ملک نبی اس بغاوت کو فرو نہ کر سکا۔ اور مجبوراً دولت آباد چلا گیا۔ اس وقت سلطان تغلق نے اپنے امراء سے مشورہ کر کے اناگندی کی حکومت راجہ کے وزیر کو بخش دی۔ ہری ہر اور بکا اسی وزیر کے خاندان سے تھے۔"

(۴) فرشتہ لکھتا ہے :-

" راجہ جنگ میں مارا گیا۔ اس کے گیارہ بیٹے تھے۔ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ محمد تغلق نے انہیں حکومت سپرد کی۔ لیکن ان کے تبدیل مذہب کی وجہ سے ہندوؤں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ اور بوڑھے وزیر کو راجہ بنا لیا۔ ہری ہر اور بکا اسی خاندان سے ہیں۔"

(۵) سدرن انڈیا انڈر محاڈن انویڈرس کا مصنف لکھتا ہے :-

" ہری ہر اور اس کے بھائی ہوئے سالا سلطنت کے ملازم اور گورنر تھے۔ دوار سمندرم کو مسلمانوں نے جس وقت فتح کر لیا تو راجہ نے وجیانگر کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس سلطنت کے زوال پر وجیانگر ان بھائیوں کے قبضہ میں آگیا۔"

(۶) قدیم تحریروں اور کتبوں سے جو اناگندی کے قریب ملے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے

کہ سنگما نامی ایک شخص اناگندی کے راجہ کا وزیر تھا۔ راجہ کے مارے جانے پر یہ یہاں کا راجہ بن گیا۔ اور ہری ہر اور بکا اس کے لڑکے تھے۔

ان تمام روایات پر اگر گہری نظر ڈالی جائے۔ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اناگندی کے راجہ کے مارے جانے کے بعد یہاں کی حکومت محمد تغلق نے وزیر کو بخش دی۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ ان میں سے دو ورنگل کے راجہ کی ملازمت میں تھے۔ ورنگل پر جب مسلمانوں کا پہلا حملہ ہوا تو یہ اناگندی کو واپس آئے۔ اور ہوے سالا سلطنت کی ملازمت میں داخل ہو کر مختلف صوبوں کے گورنر بن گئے۔ جب بلالا سوم کی سلطنت پر بھی مسلمانوں کے حملوں کے بعد زوال آنا شروع ہوا تو جگت گرو شنکراچاریہ مہا دیو یا کی مدد سے انہوں نے اپنی سلطنت قایم کر لی۔ جگت گرو مہا دیو یا جس طرح ہری ہر اور اس کے بھائیوں کا گرو تھا۔ اسی طرح وہ ہوے سالا سلطنت کا بھی گرو تھا۔ بلالا سوم نے اسی کی تائید سے اتحاد کی بنیاد ڈالی تھی۔ لیکن مہا دیو یا کی دور بین نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں کے حملوں سے ہوے سالا سلطنت پنپ نہیں سکتی۔ اس لئے اس نے وجیانگر کو اپنا مرکز بنا لیا۔ اور فرمانروائی کے لئے ہری ہر کو منتخب کیا۔ جو پہلے سے یہاں کا مقامی راجہ ہونے کے علاوہ بلالا سوم کا گورنر بھی تھا۔

ہری ہر اول

۱۳۳۶ء سے ۱۳۴۶ء

(مسلمان معاصرین۔ سلطان محمد تغلق)

(نوٹ:۔ معاصرین میں محمد تغلق کے بعد سلاطین دہلی کے نام عمداً نظر انداز کر دئے گئے۔ اسلئے کہ انکا سلاطین وجیانگر سے کوئی تعلق نہیں تھا)

ہری ہر کے عہد کو مورخین نے ۱۳۳۶ء سے شروع کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطنتِ

دہلی کے خلاف تمام ہندوستان میں بغاوتیں پھیل رہی تھیں۔ اور سلطان محمد تغلق مدورا کی بغاوت فرو کرنے کیلئے دکن آیا۔ اور بیدر سے واپس ہوگیا۔ اور شمالی ہند کی بغاوتوں کے باعث پھر جنوب میں اس کے آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اور یہی وہ زمانہ تھا کہ دکن میں اس کے امرا اس سے باغی ہوکر آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ اس لئے جنوب کے ہندوؤں کو اپنی آزادی کے لئے اس سے بہتر موقع مل نہیں سکتا تھا۔ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ ہندوؤں میں ایک عرصہ سے خفیہ طور پر اتحاد کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لیکن ہوے سالا سلطنت مسلمانوں کے متعدد حملوں سے اس قدر کمزور ہو چکی تھی۔ کہ اس کا حکمران بلالا سوم گو اتحاد کے بانیوں میں سے تھا۔ لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ اور اس کی اس کمزور حالت کو دیکھ کر جگت گرو مہا دیویا نے ہری ہراول کو اس نئی سلطنت کی حکمرانی کیلئے منتخب کیا۔ اور یہ گمان بیجا نہیں ہے۔ کہ گرو نے ہری ہر کا انتخاب اس لئے کیا کہ ہری ہر اور اس کے چار بھائی ملک کے بہت بڑے حصہ پر حکمران تھے۔ شاید ان پانچ بھائیوں کی متفقہ طاقت جنوبی ہند میں اس وقت سب سے زبردست تھی۔ لیکن کسی تاریخ سے بھی یہ عقدہ حل نہیں ہوتا۔ کہ ہری ہر کے انتخاب کو اس کے آقا بلالا سوم نے کس طرح گوارا کیا؟

(۱) ممکن ہے کہ اس وقت ہری ہر کی تخت نشینی بطور ایک خراج گذار راجہ کے ہوئی ہو۔

(۲) یہ بھی ممکن ہے کہ مدورا کے مسلمانوں سے جنگ میں مصروفیت نے راجہ بلالا سوم کو مہلت نہیں دی کہ اس طرف توجہ کرے۔

(۳) اپنی کمزور حالت کے احساس نے اس کو ہری ہر کے خلاف کچھ کرنے نہیں دیا۔

(۴) یا اس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ ہری ہر اگر مضبوط ہو جائے تو اس کی اپنی سلطنت مسلمانوں کے حملے سے محفوظ رہے گی۔

بہرطور ان مذکورۂ بالا وجوہات میں سے کوئی ایک وجہ ہے کہ بلا لاسوم نے اپنے گورنر ہری ہر کی تخت نشینی کو گوارا کر لیا تھا۔

ہری ہر اول سنگما وزیر کا پہلا بیٹا تھا۔ اور اس سے چھوٹے اس کے چار بھائی تھے۔ کتاب "ہیوروٹوبی فرگاٹن ایمپائر" کا مصنف لکھتا ہے :-

"ہری ہر نہایت خوش قسمت تھا کہ اس کے چاروں بھائی اس کے نہایت وفادار ومطیع تھے۔ بکارایا جو اس سے چھوٹا تھا۔ اس کو اس نے یوراج یا ولی عہد بناکر فوجوں کی کمان اس کے سپرد کر دی۔ تیسرے بھائی کمپا کو اس نے لڈیہ اور نطوبلہ کے اضلاع کا گورنر بنایا۔ چوتھے بھائی ماریا کو میسور کے مغربی علاقہ کا حکمران بنایا گیا۔ پانچویں بھائی مدپا کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔"

اس نئی سلطنت کا وزیر خود جگت گرو مہا دیویا بنا۔ اور اس قابلیت سے اس کا انتظام کیا کہ یہ سلطنت تھوڑے ہی عرصہ میں جنوب کی سب سے زبردست بن گئی۔ دکن کے مسلمان امراء اپنی اپنی لڑائیوں میں مصروف تھے۔ اس لئے کسی نے بھی ادہر توجہ نہیں کی۔ اور جب ان خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہو کر بہمنی سلطنت کو استقلال نصیب ہوا تو اس وقت سلاطین بہمنیہ (مسلمانوں) کو معلوم ہوا کہ اس عرصہ میں ایک نئی زبردست سلطنت" ان کی حریف" پیدا ہو گئی ہے۔

ہری ہر کے عہد میں مسلمانوں سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے بھی عمداً مسلمانوں سے کوئی چھیڑ نہیں کی۔ یا تو یہ ایک گہری سیاست تھی۔ جس پر ہر ڈھب کار بند ہوا۔ یا دکن کے مسلمان امراء اپنی خانہ جنگی میں اس قدر مصروف تھے کہ ادہر متوجہ نہیں ہو سکے۔ لیکن قرین قیاس یہ بات ہے کہ مسلمان امراء باوجود خانہ جنگیوں کے اس قدر طاقتور

تھے کہ اگر ہندوؤں سے چھیڑ ہوتی تو وہ ادھر متوجہ ہو جاتے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ہری ہر نے نہایت دانشمندی سے اس کا موقع آنے ہی نہیں دیا۔ اور اس طرح خاموشی سے سلطنت کی تنظیم اور اس کے مستحکم کرنے میں مصروف رہا۔

ہری ہر کے عہد میں مختلف جنگوں کا ذکر آیا ہے اور یہ زیادہ تر کڑپہ اور نلور ضلع سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں کے ہندو سرداروں نے اس نئی سلطنت کی سیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جنوب کے تمام مندروں اور راجاؤں سے اس نئی سلطنت کے قیام کے لئے مدد ملی تھی۔ مگر وہ اس کی سیادت تسلیم کرنے کیلئے کسی طرح راضی نہیں تھے۔ اس لئے ہری ہر اور اس کے بھائیوں نے ان مقامی سرداروں کی سرکوبی کی۔ اور انہیں اپنا مطیع اور باجگذار بنا لیا۔

نیور ٹوپی فارگاٹن ایمپائر کا ہندو مصنف لکھتا ہے:۔

"ہری ہر جب اس قدر طاقتور ہو گیا کہ مسلمانوں سے مقابلہ کر سکے۔ تو خود بخود ایک موقع اس کے ہاتھ آ گیا۔ ورنگل کے راجہ پرتاب ردرا دیو کے بیٹے کرشنا دیو نے مسلمانوں کے خلاف اس سے مدد مانگی۔ اس وقت جنوب کی ریاستیں بھی ان کے ساتھ مل گئیں۔ اور انہوں نے اس وقت یہ ارادہ کر لیا کہ مسلمانوں کو بندھیاچل کے ادھر نکالدیں۔ اور ان کو اس میں اس قدر کامیابی ہوئی کہ سوائے دولت آباد کے باقی تمام ملک انکے ہاتھ آ گیا۔"

لیکن تاریخی واقعات اس کے خلاف ہیں۔ اگر دولت آباد تک کا حصہ ہندوؤں کے ہاتھ آ جاتا تو مسلمانوں کی وہ مشہور سلطنت جس کا نام دولت بہمنیہ تھا وجود میں نہ آتی۔ ہری ہر کے عہد کے چند کتبے ملے ہیں۔ جن میں کندہ ہے کہ ہری ہر کو مسلمانوں پر فتوحات حاصل ہوئیں۔

بیسو گرافیئر کا مصنف (میوون لاڈ) نے ان سے نتیجہ نکالا ہے کہ دوار سمندرم اور اناگندی کے چھاؤنیوں سے مسلمانوں کو نکال دیا گیا۔ اور بغیر جنگ کے یہ ممکن نہیں تھا۔ مسلمانوں پر فتوحات سے یہی مراد ہے۔

واقعات بھی یہی ثابت کرتے ہیں۔ یعنے یہ کہ شاہ خلجی کے عہد میں مسلمانوں کی جو چھاؤنیاں مختلف مقامات میں قایم ہوئی تھیں۔ عہد تغلق کے بعد پھر ان کا کہیں ذکر نہیں آتا اس لئے ممکن ہے کہ مسلمانوں کو ان چھاؤنیوں سے نکال دیا گیا ہو۔ اس وقت ہندوؤں کو معلوم تھا کہ ان مسلمانوں کو دہلی یا دکن سے کوئی مدد مل نہیں سکتی۔

ہری ہر کی تعمیرات میں پمپاپتی کا مشہور مندر ہے۔ جس کو اس نے اپنی تخت نشینی کے پہلے سال میں تعمیر کیا۔ (اس مندر کو ہمپی کا مندر بھی کہتے ہیں)

ہری ہر ۱۳۴۶ء میں فوت ہوا۔ اس کے فوت ہونے کے وقت سلطنت دریائے تنگ بھدرا سے نیچے دوار سمندرم تک اور مشرق میں ضلع نلور سے لیکر جنوب میں بحیرۂ عرب تک پھیل گئی تھی اور ان ممالک کے تمام مقامی راجاؤں نے اسکی سیادت کو تسلیم کر لیا تھا۔ ہری ہر کی تخت نشینی کے ۷ سال بعد یعنے ۱۳۴۳ء میں ہوئے سالا سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ راجہ بلالا سوم کو مدورا کے مسلمانوں نے قتل کر دیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ہری ہر نے تمام ہوئے سالا سلطنت کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔

سیاسی پہلو سے ہری ہر کا عہد نہایت کامیاب عہد کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے نہایت ہوشیاری سے اپنے ہمسایہ مسلمانوں کی نظر سے بچا کر ایک نہایت مضبوط سلطنت قایم کر لی تھی۔ سیویل اپنی تاریخ میں سیاح نونز کے حوالے سے لکھتا ہے:-

"ہری ہر کا عہد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ نہایت رازداری سے کام لیکر سلطنت کی تنظیم میں مصروف رہا۔ ہری ہر کے عہد میں ہی مشہور سیاح ابن بطوطہ جنوب میں آیا تھا اور اس نے کوکن کے حالات میں لکھا ہے کہ سلطان جمال الدین اس راجہ کا باجگذار تھا۔" (ابن بطوطہ نے راجہ ہری ہر کو ہریب لکھا ہے)

بکارایا۔ اول

۱۳۴۶ء۔ ۱۳۷۹ء

(معاصرین :۔ علاؤالدین حسن کانگو بہمنی ۱۳۴۷ء سے ۱۳۵۸ء۔ محمد شاہ بہمنی اول ۱۳۵۸ء سے ۱۳۷۵ء۔ مجاہد شاہ بہمنی ۱۳۷۵ء سے ۱۳۷۸ء۔ داؤد شاہ بہمنی ۱۳۷۸ء۔ محمود شاہ بہمنی ۱۳۷۸ء سے ۱۳۹۷ء تک)

اپنے بھائی ہری ہر کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ لیکن سیول اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

"ہری ہر کے بعد اس کا دوسرا بھائی سنگما تخت پر بیٹھا۔ اور اس کی وفات ۱۳۵۲ء میں ہوئی۔ اس کا دور بھی نہایت خاموشی اور امن سے گذر رہا۔ اس عرصہ میں سلطنت خوب مضبوط ہو گئی تھی۔ اور جنوبی ہند میں اسے کافی وسعت حاصل ہو گئی تھی۔"

مگر ہندو مورخین نے جس قدر کتابیں لکھی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہری ہر کے بعد بکارایا تخت پر بیٹھا۔ اور کسی شجرہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سنگما نامی کوئی بھائی تھا۔

بکارایا ایک سیاست دان اور تجربہ کار جنرل تھا۔ اس نے جنوبی ہند کی ان تمام

ریاستوں پر قبضہ کرلیا جو ہوئے سالا سلطنت کی باجگذار تھیں۔ اس طرح اب وجیا نگر کی سلطنت کے حدود ملیبار اور مدورا تک پھیل گئے۔ دوار سمندر کا راجہ بلال سوم جب تک زندہ رہا۔ مدورا کے مسلمانوں سے ہمیشہ جنگ میں مصروف رہا۔ اس کے بعد اب وجیا نگر کی سلطنت ان مسلمانوں کے مدمقابل ہوگئی۔ اور ایک عرصہ تک ہندو اور مسلمان لڑتے رہے

ادھر جنوب میں یہ چھوٹی چھوٹی جنگیں ہوتی رہیں۔ بکارا یا کا بھائی کمپا فوجوں کی کمان پر تھا۔ اور ادھر پایہ تخت میں بیٹھے ہوئے بکارا یا سلطنت کی تنظیم اور فوجوں کی تیاری میں مصروف رہا۔ اور جب اس کو یہ یقین ہوگیا کہ وہ دکن کی اسلامی سلطنتوں سے برابر مقابلہ کرسکتا ہے۔ تو اس نے پہلے سلطان محمد تغلق کو اور بعد میں سلطان فیروز کو لکھا کہ اگر وہ کمک دیں تو دکن کے مسلمان امراء پر وہ چڑھائی کریگا۔ اس کا جواب دونوں موقعوں پر دہلی سے کچھ نہیں ملا۔

یہ دکن کے مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان محمد تغلق یا اس کے جانشین فیروز نے دکن کے معاملات پر کوئی توجہ نہیں کی۔ اگر اس وقت دہلی کے مسلمان ذرا سی جنگ کے لئے حرکت کرتے تو دکن کے مسلمانوں کا خاتمہ یقینی تھا۔ اس لئے کہ بکارا یا کا ارادہ تھا کہ مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر دکن پر خود قبضہ کرلے۔

نیو رڈوبل فرگاٹن ایمپائر کا مصنف لکھتا ہے :-

"بکارا یا نے شہنشاہ دہلی کو پیام بھیجا کہ اگر شہنشاہ حکم دے تو وہ دکن کے مسلمان باغی امراء سے جنگ کرنے کو تیار ہے۔ لیکن دہلی سے اس کو کوئی جواب نہیں ملا۔ اس لئے کہ دہلی میں بھی تغلق کے بعد انقلابات آرہے تھے۔"

کسی اور جگہ شروع میں لکھا گیا ہے کہ دکن میں بھی ایک اسلامی سلطنت قائم ہو چکی

تھی۔ دکن کے مسلمان امراء نے سلطان محمد تغلق سے بغاوت کر کے اسماعیل فتح خان کو ناصرالدین شاہ کا خطاب دیکر تخت نشین کر دیا تھا۔ سلطان محمد تغلق کے مقابلے میں جب اس کو شکست ہوئی تو وہ ظفر خاں کے حق میں تخت سے دست بردار ہوگیا۔ یہ وہی ظفر خاں ہے جس نے ۱۳۴۷ء میں گلبرگہ کو پایۂ تخت بنا کر علاؤالدین حسن کانگو بہمنی کے خطاب سے تخت پر بیٹھا۔ اور بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

جس طرح وجیانگر کے حکمرانوں نے اپنے ابتدائی سال نہایت خاموشی سے اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے میں گذارے۔ اسی طرح علاؤالدین حسن کانگو بہمنی بھی اپنی سلطنت کو طاقتور بنانے میں مصروف رہا۔ اس لئے دونوں سلطنتوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بہمنی سلطنت کا قائم ہو جانا انکی ہستی کے لیئے نیک فال ثابت ہوا۔ ورنہ اگر مسلمان امراء منتشر رہتے تو ممکن تھا کہ بکارایا سا اولوالعزم حکمران انہیں دکن سے ضرور نکال دیتا۔

دہلی سے جواب نہ آنے کے بعد بکارایا نے اپنی اولین فرصت میں جب دکن پر نظر ڈالی تو اس وقت تک دکن کی اسلامی سلطنت خوب مضبوط ہو چکی تھی۔ اس لئے اس نے مناسب سمجھا کہ مسلمانوں سے لڑنے کے لئے کسی حلیف کو پیدا کرے۔ اور وہ حلیف ورنگل کا راجہ ونایک دیوا تھا۔

۱۳۵۸ء میں علاؤالدین حسن کانگو بہمنی کی وفات پر محمد شاہ اول تخت نشین ہوا۔ اس وقت بکارایا اور ورنگل کے راجہ ونایک دیوانے محمد شاہ کو لکھا کہ بعض سرحدی اضلاع جو مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے ہیں۔ پھر ہندوؤں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ محمد شاہ نے اس کے جواب میں ورنگل پر حملہ کر دیا۔ ہندوؤں کو شکست ہوئی۔ اس کے چند دن بعد ہی ونایک دیوا

نے پھر محمد شاہ کی توہین کی۔ محمد شاہ نے دوبارہ ورنگل پر چڑھائی کرکے ونایک دیوا کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ اس فتح کے بعد جب اسلامی فوج واپس ہو رہی تھی تو اس وقت بکارایا کی فوج پہونچی۔ جس نے گلبرگہ تک مسلمانوں کا تعاقب کیا۔

فرشتہ لکھتا ہے:۔

"ورنگل کی فتح کے بعد موسم کی خرابی کی وجہ سے اسلامی فوج زیادہ دنوں تک اس ملک میں ٹھہر نہ سکی۔ فوج میں سپاہی روزانہ مر رہے تھے۔ اس لئے محمد شاہ نے ہندوؤں کے تعاقب کرنے والی فوج پر توجہ نہیں کی۔ وہ خود بھی اس جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔"

بکارایا نے اگرچہ مسلمانوں کا گلبرگہ تک تعاقب کیا۔ لیکن اس کو گلبرگہ پر چڑھائی کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس لئے اس نے وجیانگر کو واپس ہو کر شہنشاہ فیروز تغلق کو خط لکھا کہ اگر وہ تائید کرے تو گلبرگہ پر چڑھائی ہو سکتی ہے۔ لیکن فیروز نے اس خط کا جواب نہیں دیا۔

محمد شاہ بہمنی گلبرگہ میں کچھ عرصہ ستانے کے بعد ورنگل پر پھر حملہ آور ہوا۔ جس کے نتیجہ میں گولکنڈہ کا مشہور قلعہ اور ورنگل مسلمانوں کے قبضہ میں مستقل طور پر آ گئے۔ ورنگل کی ہندو سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ جس کی وجہ سے بہمنی سلطنت کے حدود جنوب میں سلطنت وجیانگر کے حدود سے مل گئے۔ اب محمد شاہ نے وجیانگر سے اس کی اگلی بدسلوکی کا انتقام لینا چاہا۔ وجیانگر والوں نے بغیر کسی سبب کے ورنگل والوں کو مدد دیکر مسلمان فوجوں کو پریشان کیا تھا۔

وجیانگر سے انتقام لینے کے لئے محمد شاہ بہمنی نے ورنگل کی فتوحات کا جشن اعلیٰ پیمانہ پر منایا۔ اس جشن میں چند ناچنے والیاں حاضر ہوئیں۔ ان کے کمالات سے بادشاہ اس قدر

خوش ہوا کہ اس نے اپنے وزیر سیف الدین غوری کو حکم دیا کہ وجیا نگر کے راجہ بکارا یا کو لکھا جائے کہ "اس طائفہ کو اپنے خزانہ سے انعام دیا جائے"۔ ملک سیف الدین نے سمجھا کہ بادشاہ شراب کی مستی میں یہ الفاظ کہہ رہا ہے۔ اس لئے اس نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی۔ دوسری صبح کو بادشاہ نے ملک سیف الدین سے دستخط کرنے کے لئے حکم نامہ طلب کیا۔ اس نے عذر خواہی کی۔ محمد شاہ نے کہا:۔

"خدا کی قسم میں اپنی زبان سے بیکار الفاظ نہیں نکالتا۔ میرا حکم شراب کی مستی کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ ایک خاص مقصد کے لئے ہے"

سیف الدین نے حکم نامہ لکھ کر بکارا یا کے پاس بھیج دیا۔ بکارا یا نے اس حکم کو اپنی توہین سمجھی۔ اور قاصد کو گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں گشت کرانے کے بعد باہر نکال دیا۔ اور ساتھ ہی فوج کو تیاری کا حکم دیا۔

ہسٹورک لینڈ مارکس آف دی دکن (Historic Landmarks of the Deccan) کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰۰ پر لکھتا ہے:۔

"۱۳۶۵ء میں تین ہزار ہاتھی۔ تیس ہزار سوار اور نو لاکھ پیادہ فوج سے بکارا یا نے بہمنی سلطنت کے جنوبی اضلاع پر حملہ آور ہوا۔ محمد شاہ کو جب یہ خبر پہونچی تو اس نے بھی فوجی تیاری کا حکم دیا۔ لیکن ان فوجوں کے تیار ہونے تک ہندو ملک کے بڑے حصہ پر قابض ہو چکے تھے۔ اور اسی وقت مدگل کا محاصرہ کیئے ہوئے تھے۔ مدگل میں آٹھ سو سے زیادہ مسلمان نہیں تھے۔ اور وہ بھی اس ناگہانی افتاد سے بے خبر تھے۔ قلعہ فتح ہو گیا۔ بکارا یا نے حکم دیا کہ تمام مردوں عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ مرد اور بچے تو اسی وقت قتل کر دئیے

گئے۔ لیکن عورتوں کو ان کی عصمت دری کے بعد قتل کیا گیا۔ ہندو فوج کی اس چیرہ دستی کی خبر جب محمد شاہ کو پہونچی تو اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس نے اسی وقت قسم کھائی کہ جب تک اس کے بدلے میں ایک لاکھ ہندو تہ تیغ نہ کئے جائیں، تلوار میان میں نہیں ڈالی جائے گی۔ یہ کہکر اس نے اسی وقت نو ہزار منتخب اور جانباز سواروں کو لیکر دریائے کرشنا کو عبور کیا۔ باقی اسلامی فوج پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ محمد شاہ کے آمد کی خبر سنتے ہی بکارایا اور اسکی سوار فوج فرار ہو گئی۔ محمد شاہ کی فوج ہندوؤں کے کیمپ میں اس قدر تباہی لائی کہ ستر ہزار ہندو مارے گئے۔ ان مقتولوں میں دس ہزار سے زیادہ برہمن تھے۔

محمد شاہ نے یہاں سے بڑھکر وجیانگر کا محاصرہ کر لیا۔ راستہ میں بے حساب ہندو مرد عورتیں اور بچے قتل ہوئے۔ محمد شاہ نے اس طرح اپنی قسم پوری کی۔ بکارایا نے مجبور ہو کر صلح طلب کی۔ اور اس شرط پر صلح ہوئی کہ بکارایا اپنے خزانہ سے طائفہ کو انعام دے۔ طوائفوں کو انعام اسی وقت دیدیا گیا۔ اور دونوں حکمرانوں نے عہد کیا کہ آئندہ قیدیوں، عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کیا جائیگا۔

سلطان محمد تغلق کے بعد یہ پہلی دفعہ تھی کہ دکن کے مسلمان دریائے کرشنا و تنگ بھدرا کو عبور کر کے جنوب میں پہونچے۔

میسور گزیٹیر کا مصنف ہیوول راؤ صفحہ ۱۴۷۱ پر لکھا ہے،

"وجیانگر کی بنیاد کے بعد تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک مسلمان بادشاہ

وجیانگر پہونچا۔ محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا۔ سلطان کی واپسی پر ہندوؤں نے پھر مسلمانوں کا تعاقب شروع کیا۔ محمد شاہ نے طرح دینی شروع کی۔ لیکن جب ہندو باز نہ آئے تو اس نے ایک جگہ ہندوؤں کو گھیر کر ایسا شبخون مارا کہ بے حساب ہندو مارے گئے۔"

اس کے بعد اس تاریخ کا مصنف لکھتا ہے اور یہی اس کا مقصد ہے کہ :۔

"باوجود صلح کرنے کے بکارایا عاجز نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے واپس ہونے والی فوج سے برابر چھیڑ جاری رکھی۔"

اس جنگ کے بعد بکارایا کے عہد کے نو سال نہایت امن سے گذرے۔ اس عرصہ میں اس نے اپنی شکست کی تلافی کے لئے فوج کی از سر نو تنظیم شروع کی۔ لیکن جزیرہ نما کے جنوب میں اس کی فوج برابر لڑائیوں میں مصروف رہی۔ اور ان چھوٹے چھوٹے راجاؤں اور پالیگاروں کو مطیع کر لیا گیا۔ جو وجیانگر کی سیادت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں جنوب کے مسلمانوں سے بھی جن کی حکومتیں ملیبار اور مدورا میں تھیں۔ برابر جنگ جاری رہی۔ ان جنگوں میں کبھی ہندو غالب آتے تھے اور کبھی مسلمان۔ اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ مدورا کی تاریخ میں ان جنگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

بہر طور ہندوؤں نے مدورا کو فتح کر لیا۔ اور اس کے بعد ہی ملیبار بھی فتح ہو گیا۔ ملیبار کے حالات میں سدرن انڈیا انڈر محامڈن انویڈرس کا مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حوالے سے لکھتا ہے :۔

"ہمسایہ سلطنت کا سردار باکن (بکارایا) ہاتھیوں اور فوجوں کو لیکر حملہ آور ہوا اور مسلمانوں کے تمام ملک پر قبضہ کر لیا۔ مردوں کے قتل کے بعد ہندوؤں

نے مسلمان عورتوں کی عصمت ریزی کی۔ اور انہیں اسیر بنا کر لے گئے"۔

ملیبار اور مدورا کی حکومتوں کا خاتمہ ہوتے ہی جنوب سے مسلمانوں کا نام مٹ گیا اور اس طرح مٹا کہ پھر ڈھائی سو سال تک انہیں اس ملک میں آنا نصیب نہ ہوا۔ ظلم و ستم سے تنگ آکر جو مسلمان دشوار گذار پہاڑیوں اور جنگلوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ وہ بھی ہندوؤں کے خوف سے اپنے مذہب کو پوشیدہ رکھنے لگے۔ بہرطور مدورا اور ملیبار کی اسلامی حکومتوں کے خاتمہ کے ساتھ ہی سلطنت وجیانگر کو راس کماری تک وسعت مل گئی۔ اور پورا جنوبی ہند صحیح معنوں میں ہندوؤں کا ملک بن گیا۔ جلال سوم ہریا جگت گرو مہادیو یا جس بات کی آرزو رکھتے تھے۔ وہ وہ بکارایا کے عہد میں پوری ہوئی۔

اسی سال کے خاتمہ پر یعنی ۱۳۶۷ء میں گلبرگہ میں محمد شاہ بہمنی کی وفات ہوئی۔ اور اس کا نوجوان بیٹا مجاہد تخت نشین ہوا۔ مجاہد کی عمر اس وقت انیس۱۹ سال کی تھی۔ بکارایا نے اس وقت تنگ بھدرا سے بڑھکر چند متصل مقامات پر قبضہ کر لیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ نوجوان مجاہد ادھر توجہ نہیں کریگا۔ لیکن اسکی توقع کے خلاف مجاہد نے لکھا:۔

"ہندو فوج چیرہ دست ہو کر اسلامی مقبوضات پر قبضہ کر رہی ہے۔ بہتر ہے۔ کہ اس فوج کو تنگ بھدرا کے پار واپس بلا لیا جائے۔ اور اگر دریائے تنگ بھدرا کو سرحد قرار دیا جائے تو آئندہ بہمنی سلطنت وجیانگر والوں سے کوئی تعرض نہیں کریگی۔ تنگ بھدرا سے نیچے تمام جنوبی ہند پر اس کی سیادت کو تسلیم کر لیا جائے گا"

بکارایا نے اس کے جواب میں لکھا:۔

"سلطنت وجیانگر کی شمالی سرحد عرصۂ قدیم سے دریائے کرشنا تک رہی ہے۔ اس لئے دوآبہ پر وجیانگر کا حق ہے۔ بہتر ہے کہ اسلامی فوجوں کو یہاں سے واپس

بلا کر رائچور اور مدگل کے قلعے ہندوؤں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اور ساتھ

ہی وہ تمام ہاتھی جو نو سال پیشتر محمد شاہ نے بہ جبر حاصل کئے تھے۔ واپس

کئے جائیں۔ (ہسٹارک لینڈ مارکس آف دی دکن صفحہ ۱۰۹)

مجاہد کے پاس جب یہ جواب پہونچا تو اس نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اور اسی سال دریائے کرشنا کو عبور کر کے کچھ ایسی برق سرعت سے بڑھا کہ قلعہ ادھونی میں پہونچکر اس کا محاصرہ کر لیا۔ نوجوان مجاہد کو شوق تھا کہ قلعہ اسی کے ہاتھ سے فوراً فتح ہو جائے۔ لیکن جب اس میں دیر ہوی تو اس نے صفدر خاں سیستانی کو محاصرہ پر چھوڑ کر وجیانگر کی طرف رخ کیا۔ بکا رایا اپنی فوج لیکر تنگ بھدرا کے دوسرے کنارے پر اس کا منتظر تھا۔ لیکن جنگ کا فیصلہ قدرت نے کسی اور ہی طرح مقدر رکھا تھا۔ یوروپین مورخ میگ اور گریبل وغیرہ فرشتہ کے حوالے سے حیرت سے لکھتے ہیں کہ مشرق میں جنگوں کا فیصلہ کس قدر آسانی سے صرف سپہ سالاروں کی ہمت و جرأت پر ہو جاتا ہے ا۔

"مجاہد نے آتے ہوے راستے میں ایک خونخوار شیر کو ایک ہی تیر سے مار دیا۔ ہندو

فوج میں جب یہ خبر پہونچی تو ان پر مجاہد کا رعب چھا گیا۔ بکا رایا نے یہ دیکھکر

جنگلوں میں پناہ لی۔" (ہسٹارک لینڈ مارکس آف دی دکن صفحہ ۱۰۹)

لیکن زمانہ حال کے ہندو مورخین اس واقعہ کو جھٹلاتے ہیں۔ تاہم انہیں اس سے انکار نہیں کہ بکا رایا نے جنگلوں میں پناہ لی۔ اور مجاہد اسکے تعاقب میں نکلا تھا۔

ممکن ہے کہ ہندو جو ہر بات میں اچھا اور برا شگون نکالنے کے عادی ہیں۔ شیر کی موت کو برے شگون سے تعبیر کرتے ہوئے جنگلوں میں پناہ لینے چلے گئے ہوں اور ممکن ہے کہ فرشتہ نے اسلامی فوج کی برتری دکھلانے کے خیال سے یہ لکھا ہو کہ مجاہد کا رعب ہندوؤں پر چھا گیا

لیکن یہ تو صحیح ہے کہ خواہ ڈر کر یا شگون لیکر بکارایانے جنگلوں میں پناہ لی۔ بہر طور مجاہد نے بکا کے تعاقب میں آٹھ مہینے گذار دئے۔ اس عرصہ میں اس کو اس قدر فتوحات ہوئیں کہ ہندوں کی فوج پر عرصۂ عافیت تنگ ہوگیا۔

فرشتہ لکھتا ہے :-

"جنوب میں مجاہد بندرگاہ رامیسورم تک پہونچ گیا۔ اور اس نے ملک کافور کی بنائی ہوئی مسجد جو شکستہ ہورہی تھی از سر نو تعمیر کی"

مورخ سیول اپنی تاریخ میں رامیسورم کے واقعہ کو ناممکن قرار دیتا ہے۔ تاریخی واقعات بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ کہ فرشتہ نے یہاں سخت غلطی کی ہے۔ اگر اس سال مجاہد یہاں تک پہونچ جاتا تو مدورا کی سلطنت کا خاتمہ دوسرے سال میں ہرگز نہ ہوتا۔ اور ملیبار میں بھی مسلمانوں کی حکومت مستحکم ہوجاتی۔ لیکن واقعات بتارہے ہیں کہ مدورا اور ملیبار میں اس سال اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ممکن ہے کہ رامیسور کوئی اور جگہ ہو اور یہاں کوئی مسجد تھی جس کو مجاہد نے از سر نو تعمیر کیا ہو۔

(نوٹ :- اضلاع بلاری و اننت پور میں رامیسورم اور رامپورم کے ناموں کی کوئی کمی نہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی تعلقہ میں کئی کئی رامیسورم اور رامپورم ہیں۔)

آٹھ ماہ تک جنگلوں میں زندگی بسر کرنے سے ہندو فوج میں وبا پھیل گئی۔ جس سے مجبور ہوکر بکارایا اپنے پایۂ تخت کو واپس ہوا۔ مجاہد کو جس وقت اس کی خبر پہونچی تو اس نے بڑھکر وجیانگر کا محاصرہ کرلیا۔ وجیانگر کا محاصرہ کرنے کیلئے دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک بڑا راستہ تھا۔ جس پر فوج آسانی سے گذر سکتی تھی۔ لیکن یہاں قدم قدم پر مدافعت کا سامان تھا۔ دوسرا ایک خاردار جنگلی راستہ تھا جو نہایت ہی دشوار گذار تھا۔ مجاہد نے اسی دوسرے راستہ کو

ترجیح دی۔

اس دوسرے راستے کو طے کرکے مجاہد کے یکایک آجانے سے وجیانگر میں اضطراب پیدا ہوگیا۔ مسلمانوں نے آتے ہی شہر پر حملہ کر دیا اور شہر کی فصیل پر قابض ہوگئے۔ بعض بعض مقامات پر ان کی رسائی یہاں تک ہوئی کہ اگر درمیان میں فصیلیں اور دوسرے موانعات نہ ہوتیں تو شاہی محل پر ان کا قبضہ ہو جاتا۔ مجاہد نے ہنمان کے مندر پر قبضہ کر لیا۔ یہاں کے بتوں کو توڑ کر مندر کو زیر زمین کر دیا۔

نیورٹوبی فرگاٹن ایمپائر کا مصنف اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔

"میں نے اس مندر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جس کو مجاہد نے تباہ کر دیا تھا شاہی محل یہاں سے بالکل قریب ہے"

مجاہد کے اس قدر قریب آجانے سے شہر میں ایک ہنگامہ پیدا ہوگیا۔ اس وقت بکارایا فوج لیکر مجاہد کے مقابلہ کو نکلا۔ اور اتفاقاً اسی وقت میسور سے ایک بڑی فوج اسکی تائید کو آگئی۔

شہر پر حملہ کرنے سے پیشتر مجاہد نے اپنے چچا داؤد خاں کو فوج دیکر قریب کی ایک پہاڑی پر مستعد رہنے کیلئے حکم دیا تھا اور شاہی علم اسی فوج کے پاس تھا۔ اس وقت جب بکارایا کی مدد کے لئے میسوری فوج آگئی۔ تو داؤد خاں مجاہد کو خطرہ میں دیکھ کر اپنی جگہ چھوڑ کر نیچے آگیا۔ اس طرح اسلامی علم اس فوج کی نظروں سے پنہاں ہوگیا جو مجاہد کے ساتھ تھی۔ اسلامی علم کے نظر سے غائب ہوتے ہی مسلمانوں میں پریشانی پھیل گئی۔ مجاہد نے کل فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ داؤد خاں کو ملامت کی۔ اور وجیانگر کا محاصرہ اٹھا کر ادھونی پر بڑھا۔ اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ صفدر خاں سیستانی پہلے سے یہاں محاصرہ کر رکھا تھا۔ نو ماہ تک محاصرہ رہا۔ لیکن ادھونی کا قلعہ فتح نہیں ہوا۔ ادھر بکارایا میں بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ وجیانگر سے باہر نکل کر ادھونی والوں کو مدد

دے یا مجاہد کا مقابلہ کرے۔ ادھونی کا محاصرہ جاری ہی تھا۔ کہ ملک میں قحط کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور فوج میں بیماری پھیل گئی۔ مجاہد بغیر قلعہ فتح کئے واپس ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ لیکن ملک نائب سیف الدین غوری کے سمجھانے پر محاصرہ اٹھاکر واپس ہوا۔

راستے میں اس کے چچا داؤد خاں نے سازش کرکے اس کو قتل کر دیا۔ کیونکہ وجیانگر میں اس نے اس کی توہین کی تھی۔

(نوٹ :- مجاہد کی شہادت کے بعد جب داؤد خاں گلبرگہ پہنچ کر تخت نشین ہوا تو مجاہد کی بہن نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کیلئے داؤد خاں کو قتل کرا دیا۔)

اس جنگ میں ہندوؤں کے چالیس ہزار سپاہی مارے گئے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کی ہیبت ہندوؤں پر بیٹھ گئی تھی۔ اور انہوں نے واپس ہونے والے مسلمانوں سے کوئی چھیڑ نہیں کی۔ بلکہ آئندہ چالیس سال تک وہ دوآبہ رائچور کی طرف نظر اٹھاکر بھی نہیں دیکھ سکے۔ ان میں اس قدر ہمت نہیں تھی کہ دریائے تنگ بھدرا سے آگے بڑھیں۔

مجاہد کے اس ہولناک طوفانی معرکہ نے آخری عمر میں بکارایا پر بہت اثر کیا۔ اس حملے کے چند ماہ بعد ہی یعنی ۱۳۷۵ء میں اس کی وفات ہوگئی۔

ہندو مورخین جیسے ہیودن راؤ، سوری نارائن راؤ وغیرہ بکارایا کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"فرشتہ کی تحریر نے بکارایا کو بالکل ہی بزدل دکھایا ہے۔ لیکن اس کے خلاف وجیانگر میں جو کتبے ملے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نہایت جری اور مرد میدان تھا۔ مسلمان اس کی ہیبت سے کانپتے تھے۔ لیکن تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ جس طرح بڑے بڑے فوجی جنرل اور سلاطین کسی عمدہ موقع پر ایک ناقابل فہم غلطی یا

کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں - اسی طرح بکارا یا میں بھی یہ کمزوری تھی - جس کی وجہ سے اس نے بہترین موقعوں کو کھو دیا۔"

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سلطنت وجیانگر کی وسعت بکارا یا کی رہین منت ہے - اس نے جنوبی ہند کو ڈیڑھ سو سال کیلئے ہندوؤں کے لئے محفوظ کر دیا - اس کی جنگی قابلیت سے بھی انکار نہیں - لیکن بکارا یا کو شروع میں جو فتوحات حاصل ہوئی تھیں - وہ سب جنوب کے چھوٹے چھوٹے ہندو راجاؤں پر تھیں - کسی طاقتور اور جنگ آزمودہ فوج سے اس کو سابقہ نہیں پڑا تھا - ملیبار اور مدورا کے مسلمان گو حکومت کے مالک تھے - مگر اس قدر اقلیت میں تھے کہ ملک میں ان کا ہونا نہ ہونے کے برابر تھا - یہ اسی وقت تک محفوظ تھے - جب تک دہلی سے انکا تعلق رہا ۔ ۱۳۳۶ء میں اس تعلق کے منقطع ہوتے ہی یہ ہندوؤں کے نرغے میں گھر گئے - دہلی یا دکن کے مسلمانوں کی ان تک رسائی دشوار اور ناممکن تھی - سلطنت وجیانگر راستے میں حائل ہو چکی تھی - لیکن ان مٹھی بھر مسلمانوں نے تیس سال تک کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا - اس تیس سال کے عرصہ میں کوئی سال بھی ایسا نہیں گذرا کہ انہوں نے امن و راحت کی زندگی بسر کی ہو - ۱۳۴۳ء تک انہیں دو دشمنوں سے سابقہ رہا - یعنے ٹراونکور اور دوار سمندرم کے ہندوؤں سے - اور اس کے بعد ۲۳ سال تک وجیانگر جیسی زبردست سلطنت کا مقابلہ کرتے رہے - اور مٹ گئے - انہیں فتوحات سے سرشار ہو کر بکارا یا نے اپنی طاقت کا غلط اندازہ کرتے ہوئے دکن کے مسلمانوں سے جنگ چھیڑ دی تھی - اگر بکارا یا ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں سے سبق حاصل کرتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ جب ملیبار اور مدورا کے مٹھی بھر مسلمان تیس سال تک کامیابی سے مقابلہ کرتے رہے ہیں تو دکن کے مسلمانوں سے وہ کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے - بہمنی سلطان محمد شاہ کی جنگ سے بھی اس نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا - تاریخ گواہ

ہے کہ محمد شاہ بہمنی کی فوج کی آمد کی خبر سنکر ہی ہندو فوج فرار ہوگئی تھی۔ بات یہ تھی کہ ملک کافور اور تغلق کی ہیبت ان کے دلوں سے محو نہیں ہوئی تھی۔ سب سے آخیر حملہ تغلق کا تھا جو ترک تھا اس حملے نے اناگندی۔ دوار سمندر، رم اور مدورا کی سلطنتوں کا چراغ گل کر دیا تھا۔ اور مسلمانوں کی ہیبت دلوں پر اس درجہ چھا گئی تھی کہ ہندو ترک کے نام سے لرزتے تھے (اور اسی وجہ سے آج بھی جنوبی ہند میں مسلمانوں کو ترک کہا جاتا ہے۔)

ان اسلامی حملوں کا اثر جلد زائل ہونا ناممکن تھا۔ اسی لئے ہندو فوج باوجود اس کثرت کے جس کا ذکر آگے آ چکا ہے۔ محمد شاہ اور مجاہد کے نام ہی سے گھبرا کر میدان جنگ چھوڑ کر فرار ہوگئی یہاں سوال موقع کو دنے کا نہیں۔ بلکہ ہندوؤں کی ذہنیت کا تھا۔ بہر طور جنگ میں مجاہد سے شکست کھانے کے بعد بکارایا کا دل ٹوٹ گیا۔ چنانچہ اس کے چھ ماہ بعد ہی یعنی ۱۳۷۹ء میں اسکا انتقال ہوگیا۔ بکا کے عہد میں ملک کے اندر خوب ترقی ہوئی۔

بکارایا کے عہد کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے :۔

"بہمنی سلطانوں کو اگر وجیانگر پر کوئی فوقیت حاصل تھی تو یہ ان کی جنگی طاقت سے تھی۔ ورنہ رایان وجیانگر مال و دولت میں ان سے ٹکر تھے۔ گوا اور ملیبار کے زرخیز بندرگاہیں ان کے قبضہ میں تھیں۔ رعایا وفادار تھی۔ اور ملک خوب آباد تھا۔ سیلون اور ٹراونکور کے راجہ ان کے درباروں میں سفیر رکھتے۔ اور ہرسال ان کے ذریعہ قیمتی نذرانے گذرانتے تھے"

بکا کے عہد کے ایک کتبے پر جو ابھی حال میں چنرایا پٹن (ریاست میسور) کے قریب دستیاب ہوا ہے۔ یہ الفاظ کندہ ہیں :۔

"بکارایا تمام ماضی و مستقبل کے بادشاہوں میں سب سے جری اور بہادر ہے

اس کے عہد حکومت میں رعایا نہایت خوش و خرم ہے اور مال و دولت کی
فراوانی ہے۔ اس نے تمام دنیا کو فتح کرنے کے بعد اپنے پائے تخت کو اس قدر
خوبصورت بنایا ہے کہ وہ ہو بہو کنول کا ایک پھول معلوم ہوتا ہے"!

اس کتبے کی شاعرانہ تعلیوں کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بکارایا کے عہد میں سلطنت کی ترقی کے ساتھ ساتھ شہر وجیانگر کو بھی خوب ترقی ہوئی تھی۔

بکا کے عہد میں نئے نئے بہت سے شہر اور دیہات آباد کئے گئے۔ رفاہِ عام کے کاموں میں مندر اور نہریں بنائی گئیں۔ بکارایا علم دوست تھا۔ اور فنون لطیفہ (Fine Arts) کی بھی سرپرستی کرتا تھا۔ اس کے زمانے میں مشہور شاعر گنگا دیوی گذرا ہے۔ جس نے اپنی نظم میں وجیانگر کی بہت تعریف کی ہے۔

ہندوؤں کے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی بکارایا کا عہد نہایت اہم ہے۔ ایک عرصہ سے وشنو اور جین مذہب والوں میں اختلاف چلا آتا تھا۔ جس کی وجہ سے ہر جگہ خونریزی ہوتی تھی۔ بکارایا نے اس اختلاف کا خاتمہ کرتے ہوئے دونوں مذہبوں کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا۔

ہری ہر دوم

۱۳۷۹ء سے ۱۴۰۴ء

(معاصرین:- غیاث الدین بہمنی ۱۳۹۷ء شمس الدین بہمنی ۱۳۹۷ء۔ فیروز شاہ بہمنی ۱۳۹۷ء سے ۱۴۲۲ء)

بکارایا کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہری ہر دوم تخت نشین ہوا۔ ماچگان وجیانگر میں

یہی پہلا راجہ ہے جس نے شہنشاہ یعنے مہاراج ادھیراج کا خطاب اختیار کیا۔ اس کا طویل عہد حکومت سوائے آخری چند سالوں کے بالکل امن سے گذرا۔ اور اس عرصہ میں اس نے سلطنت کو خوب مستحکم و مضبوط بنایا۔ کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے بے شمار مندر تعمیر کرائے۔ اور برہمنوں پر زر و جواہر کی بارش ہوتی رہی۔ اس کی تخت نشینی کے بعد کوکن اور جنوب کے راجاؤں نے خراج بھیجنا بند کر دیا تو اس نے ان پر فوج کشی کر کے انہیں پھر مطیع بنایا۔ سنہ ۱۳۹۱ء میں ملکی مصالح کے لحاظ سے اس نے ان چند مسلمانوں کو بھی خارج کر دیا جو تجارت کی غرض سے گوا میں رہتے تھے۔ اس طرح اس کا عہد حکومت ۲۲ سال تک نہایت امن سے گذرا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے خارج کرنے سے ہری ہر کا مقصد یہ تھا کہ اسکی جنگی تیاریوں کی اطلاع اس کی ہمسایہ مسلمان سلطنت کو نہ ملے۔ اس نے اسکے بعد آٹھ سال اپنی فوج کی تنظیم میں گذارے۔ اور جب اس کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ محمد شاہ اور مجاہد کے حملوں کا انتقام لے سکتا ہے تو سنہ ۱۳۹۹ء میں اس نے یکایک دریائے تنگ بھدرا کو عبور کر کے دوآبہ دکن کے علاقوں پر قبضہ کرتے ہوئے رائچور کا محاصرہ کر لیا۔

ہسٹورک لینڈ مارکس آف دی دکن میں مورخ ہیگ لکھتا ہے :۔ (صفحہ ۱۱۱)

"اس وقت دکن میں فیروز شاہ بہمنی حکمران تھا۔ جس وقت اس کو ہری ہر کی اس چیرہ دستی کی خبر پہنچی تو اس نے گلبرگہ جاکر نظام آباد میں فوج جمع کرنی شروع کر دی۔ اور وہاں کے مقامی ہندو زمیندار کو جو ہری ہر سے سازش کر کے باغی ہو گیا تھا۔ میدان جنگ میں شکست دیکر قتل کر ڈالا۔ لیکن اس سلسلہ میں اس کو معلوم ہوا کہ اس سازش میں صرف یہی ایک ہندو زمیندار نہیں۔ بلکہ یہ سازش مسلمانوں کے خلاف ایک وسیع پیمانہ پر ہوئی ہے۔ جس میں دکن کے بہت

سے ہندو سردار شامل ہیں۔ کھرلا کا حکمران نرسنگھ دیو بھی اس میں شامل ہے۔
اور ملک کی شمالی سرحد پر حملہ کر رہا ہے۔ فیروز نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے بیدر
اور دولت آباد کی مقیم فوجوں کو کھرلا پر بڑھنے کا حکم دیا۔ اور خود بھی جس قدر
فوج جمع ہو چکی تھی لیکر آگے بڑھا۔ اس وقت اس کے زیر کمان بارہ ۱۲ ہزار
فوج تھی۔ فیروز جس وقت دریائے کرشنا پر پہونچا تو دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا
اور دوسرے ساحل پر ہری ہر دوم تیس ۳۰ ہزار سوار اور نو ۹ ہزار فوج سے
اس کے انتظار میں تھا۔ فیروز دریا کی یہ حالت دیکھکر پیچ و تاب کھانے لگا۔ امرا
اور وزراء سے مشورہ کیا۔ لیکن دریا پار ہونیکا کوئی ذریعہ نہیں مل سکتا تھا۔ اور
دوسری مشکل یہ تھی کہ اس حالت میں بھی دریا کو عبور کیا جاتا تو دوسرے
ساحل پر تمام اہم مقامات پر ہندو فوج قابض تھی۔ اس حالت کو دیکھکر قاضی
سراج نے جو فوج میں ایک سو سواروں کا حاکم تھا۔ اپنی تجویز اس کے آگے
پیش کی۔ فیروز نے اس کو منظور کر لیا۔ قاضی سراج اور اس کے سات دوست
ہندو فقیروں کا بھیس بدل کر ہندوؤں کے لشکر میں پہونچے۔ اور یہاں یہ
لوگ شراب خانوں میں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے طوائفوں سے دوستی
بڑھائی۔ اور ان کے ناچ گانوں میں شامل ہونے لگے۔ قاضی سراج نے ایک
طوائف سے محبت بڑھائی۔ حالت یہاں تک پہونچی کہ بغیر اس کو دیکھے اس کو
چین نہیں آتا تھا۔ یہ طوائف شاہی دربار میں رسائی رکھتی تھی۔ اور قاضی کو
معلوم تھا کہ اس کے ذریعہ سے وہ وہاں تک پہونچ سکتا ہے۔

چند دن بعد اس طوائف کی شاہی دربار میں طلبی ہوئی۔ اور جس وقت

وہ جانے لگی تو قاضی نے اس کا دامن تھام لیا۔ کہنے لگا۔ یا تو میرا خاتمہ کرتی جاؤ یا ساتھ لے چلو۔ طوائف نے کہا کہ دربار میں سوائے ناچنے، گانے والوں کے کسی دوسرے کو لے جانا منع ہے۔ اس پر قاضی نے کہا کہ وہ بانسری بجا سکتا ہے۔ اور اس نے بانسری اٹھا کر اس خوبی سے بجائی اور ایسا ناچا کہ طوائف بھی دنگ رہ گئی۔ اس نے قاضی اور اس کے ساتھیوں کو زنانہ لباس پہنایا اور ساتھ لیکر دربار میں گئی۔ یہاں قاضی اور اس کے ایک ساتھی کو راجکمار کے آگے پیش کیا گیا۔ ناچ شروع ہوا۔ قاضی اور اس کے ساتھی نے تلوار کا ناچ جو دکن میں مشہور ہے۔ دکھایا۔ تمام دربار حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ ناچتے ہوئے کبھی اس قدر آگے بڑھ جاتے تھے کہ راج کمار کے قریب ہو جاتے تھے۔ اور کبھی بالکل دور۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب وہ راج کمار کے بالکل قریب تھے۔ یکایک دونوں نے اپنی تلواریں راج کمار کے سینے میں گھونپ دیں۔ اسی موقع پر قاضی کے دوسرے ساتھی جو باہر کھڑے تھے۔ قناتیں کاٹ کر خیمے میں گھس آئے اور ہندو امراء کو جو شراب کے نشہ میں مخمور تھے۔ قتل کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے ہندوؤں کے سنبھلنے تک کئی امیر مارے گئے۔ اسی وقت قاضی اور اس کے ساتھیوں نے چراغ گل کر دیا۔ اور اندھیرے میں بچکر نکل گئے۔ یہاں وہ اس جگہ پہونچے جو پہلے سے مقرر شدہ تھی۔ یہاں پہونچکر انہوں نے اسلامی فوج کو دریا عبور کرنے کیلئے مقررہ اشارے دئے۔

راج کمار اور امراء کے قتل سے ہندو فوج میں ایک اضطراب پھیل گیا تھوڑے سے وقت میں قسم قسم کی افواہیں اڑنے لگیں۔ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ راجہ

ہری ہر بھی قتل ہو گیا ہے۔ ہندو فوج کے سپاہی جدھر ان کا خیال آیا۔ قاتلوں کے تعاقب میں نکلے۔ اس اثنا میں کسی نے یہ افواہ بھی اڑا دی کہ مسلمان دریا پار ہو کر آ گئے ہیں۔ ادھر ہندو فوج اس طرح منتشر ہو رہی تھی تو دوسری طرف فیروز کے چار ہزار سپاہی ٹوکروں میں بیٹھکر رات کی اندھیری میں گھوڑوں کو ساتھ ساتھ تیراتے ہوئے دریا عبور کر کے ساحل پر آ گئے۔ ادھر جو چند محافظ ہندو تھے۔ مارے گئے۔ صبح ہونے لگی۔ اس وقت فیروز اپنی بقیہ فوج کو لیکر دریا کو عبور کیا۔ شب میں جو مسلمان سپاہی آ چکے تھے۔ وہ ساحل کی مفاظت کر رہے تھے۔ ہندوؤں میں اس قدر پریشانی پھیل چکی تھی کہ کسی جگہ بھی وہ جم کر فیروز کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ راجہ ہری ہر بڑی مشکل سے اپنے بیٹے کی لاش لیکر فرار ہوا۔ ہندو لشکر کا تمام مال و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ فیروز نے اب ہندوؤں کا تعاقب شروع کیا۔ اسکی فوج وجیانگر تک پہونچی اور اس کا محاصرہ کیا۔ فیروز نے اپنے بھائی احمد خاں خانخانان اور سردار میر فضل اللہ انجو کو حکم دیا کہ اطراف کے دیہات و شہر تباہ کر ڈالیں۔ قاضی سراج کو امیر کا خطاب دیا گیا۔ چند دنوں میں میر فضل اللہ اور خانخانان کی فوجوں نے دس ہزار برہمن مرد، عورات کو گرفتار کر لئے۔ فیروز نے حکم دیا کہ انہیں مسلمان بنا لیا جائے۔ یہ دیکھکر وجیانگر کے برہمنوں نے ہری ہر کو صلح کر لینے کا مشورہ دیا۔ فیروز کیلئے دس لاکھ طلائی ہن اور میر فضل اللہ کیلئے ایک لاکھ طلائی ہن، میر فضل اللہ کے پاس بھیجے گئے۔ کہ کسی طرح فیروز کو صلح پر رضامند کر لے۔ میر فضل اللہ نے پورے گیارہ لاکھ ہن سلطان کے آگے پیش کر دئے اور صلح ہو گئی

دوآبہ رائچور پر مسلمانوں کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ فیروز محاصرہ اٹھا کر واپس ہوا۔ اور جاتے ہوئے فولاد خاں کو رائچور کا حاکم مقرر کیا۔"

اس جنگ کے چار سال بعد ہری ہر کی وفات ہو گئی۔

ہری ہر کی تاریخ وفات کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ سیاح نیونز اپنے سفرنامہ میں اور سیول اپنی تاریخ میں ہری ہر کا سنہ وفات ۱۳۹۷ء دکھلاتے ہیں۔ مورخ رئیس ۱۴۰۵ء لکھتا ہے۔ لیکن وجیانگر کھنڈرات میں جو کتبے ملے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وفات ۱۴۰۴ء میں ہی ہوئی تھی

ہری ہر کے متعلق نیور لوپی فرگاٹن ایمپائر کا مصنف لکھتا ہے۔

"ہری ہر ایک بہترین ماہر سیاست تھا۔ لیکن وقت پر اس کی تدبیر الٹی پڑی۔ اس نے اس موقع پر جنگ شروع کی۔ جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ اس نے تیمور کو لکھا تھا کہ اگر وہ دکن پر حملہ کرے گا تو ہری ہر اپنی فوج سے مدد دیگا۔"

معلوم نہیں ہوا کہ اس سفارت کا کیا حشر ہوا۔ تیمور کے پاس سفارت بھیجنے کا مقصد صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکن کے مسلمانوں کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔

دیو رائے اول

۱۴۰۴ء — ۱۴۲۲ء

(معاصرین :- فیروز شاہ بہمنی ۱۳۹۷ء تا ۱۴۲۲ء)

دیورائے اول کا دوسرا نام بکا تھا۔ وہ اپنے بھائی ہری ہر دوم کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ فرشتہ نے اس کو نرسنگ لکھا ہے۔ اس کی تخت نشینی کے پہلے سال ہی میں مسلمانوں سے پھر جنگ چھڑ گئی۔ اس کا سبب اس وقت پرتھال نامی ایک سنار کی لڑکی تھی۔ مورخ رئیس اسکے بارے میں لکھتا ہے :-

"پرتھال ایک سنار کی لڑکی تھی، جو مدگل کے قریب ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ اگر شاعرانہ تعلیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس کو بے مثل حسین بنایا تھا۔ وہ صانع فطرت کی صناعی کی ایک زندہ مثال تھی۔ اتفاق سے اس گاؤں میں ایک برہمن کا آنا ہوا۔ جو شمالی ہند کی تیرتھوں سے واپس ہو رہا تھا۔ وہ پرتھال کے گھر میں مہمان ٹھہرا۔ برہمن موسیقی کا ماہر تھا۔ سنار نے اپنی بیٹی کو اس کی شاگردی میں دیدیا۔"

ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ برہمن اپنی اس شاگرد کو خود حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس نے اپنا عشق بھی لڑکی پر ظاہر کر دیا تھا۔ لیکن لڑکی نے اس کو ٹھکرا دیا۔ مایوس ہو کر برہمن وجیانگر کو چلا گیا۔ لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ برہمن نے اس کے حسن خداداد سے مالی فائدہ اٹھانے کی نیت سے وجیانگر کو جا کر دیورائے کے آگے پرتھال کے حسن وجمال کی اس قدر تعریف کی کہ دیورائے نے اسی برہمن کے ذریعہ قیمتی تحائف اور زیورات بھیجکر لڑکی کو طلب کیا۔ باپ

نے جب دیورایا کا پیام بیٹی کو سنایا تو اس نے وجیانگر کو اس بنا پر جانے سے انکار کر دیا۔ کہ پھر وہ تمام عمر محلات شاہی سے باہر نکل نہ سکے گی۔ دیورایا ماہ جبین پر تھال کا نادیدہ عاشق ہو چکا تھا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ پر تھال رضامند نہیں ہے تو اس نے پر تھال کو زبردستی حاصل کرنے کی تجویز کی۔

ہسٹورک لیانڈ مارکس آف دی دکن کا مصنف لکھتا ہے۔۔ (صفحہ ۱۱۲)

" ہندو فوج دریائے تنگ بھدرا کو عبور کر کے آگے بڑھی۔ اس کا منزل مقصود مدگل تھا۔ لیکن غلطی یہ ہوئی کہ بجائے خاموشی سے منزل پر پہونچنے کے راستہ بھر لوٹ مار اور قتل و غارت کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس فوج کی آمد کی خبر سن کر دیہات والے جان بچانے کیلئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پر تھال اور اس کا باپ بھی انہیں میں تھے۔ ہندو فوج جب اس گاؤں میں پہونچی تو سنارا ور اس کی بیٹی کا پتا نہیں تھا۔ اگر دیورایا اپنے ارادے سے پر تھال کے والدین کو آگاہ کر دیتا تو شاید وہ ٹھہرے رہتے۔ در مقصود حاصل نہ ہونے سے ہندو فوج مدگل سے واپس ہوئی۔ فولاد خاں حاکم رائچور کو جب ہندو فوج کی اس چیرہ دستی کی خبر پہونچی۔ تو اس نے ہندوؤں کا تعاقب کیا۔ لیکن تنگ بھدرا کے قریب اس کی فوج کو شکست ہوئی۔ اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔ یہاں اس نے پھر فوج جمع کر کے ہندوؤں پر چڑھائی کی۔ اس جنگ میں ہندو شکست کھا کر فرار ہوئے فولاد خاں ان کا تعاقب کرتا ہوا وجیانگر پہونچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔

یہ خبریں جب فیروز کو پہونچیں تو اس نے وجیانگر کو کامل طور پر فتح کرنے کیلئے دل میں ٹھانی۔ اور جلدی آکر فولاد خاں سے مل گیا۔ محاصرہ

جاری تھا۔ مسلمان کبھی کبھی فصیل قلعہ تک پہونچ جاتے تھے۔ اور پھر ہٹا دئے جاتے تھے۔ چند دن کے بعد حالت یہ ہوی کہ نہ مسلمانوں میں آگے بڑھنے کی ہمت تھی اور نہ ہندوؤں کو قلعہ سے باہر نکلنے کی جرأت۔ فیروز نے محاصرہ سے اکتا کر پھر وہی چال اختیار کی جو گذشتہ جنگ میں کارآمد ہوی تھی۔ اپنے سرداران فوج کو اطراف کے علاقوں کو تباہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ میر فضل اللہ کو وجیانگر کے محاصرہ پر چھوڑ کر آپ ادھونی پر بڑھا۔ ادھونی ایک جنگی مقام تھا۔ گویا وجیانگر اور تمام جنوبی ہندوستان کی کنجی یہی شہر تھا۔ دیورایا کو جب معلوم ہوا کہ فیروز ادھونی کی تسخیر کے لئے جارہا ہے۔ تو وہ گھبرا کر صلح کا طالب ہوا۔ فیروز اس وقت وجیانگر سے سات کوس کے فاصلہ پر تھا۔ کہ وجیانگر کے سفیر باریاب ہوے۔ فیروز نے اس وقت ان سے کہا کہلا بھیجا کی۔ بہو بیٹیاں بمنزلہ اپنی بہو بیٹیوں کے ہیں۔ دیورایا نے پرتھال پر نظر نہیں ڈالی۔ بلکہ میری بیٹی پر نظر ڈالی ہے) اب صلح اسی صورت میں ممکن ہے کہ دیورایا اپنی بیٹی کو میرے حرم میں داخل کردے۔ یہی اس کی سزا ہے۔ آخر بڑی مشکل سے یہ شرط طے ہوگئی اور فیروز نے دیورایا کی بیٹی سے شادی کی۔"

دونوں درباروں میں شادی کے جشن ہونے لگے۔ چالیس دن تک عیش ونشاط کے جلسے ہوتے رہے۔ جنوبی ہند کے تمام باکمال گوئیے، شعبدہ گر اور مداری جوہر دکھلانے کے لئے جمع ہوئے۔ سلطان نے دلہن کے لئے نہایت قیمتی تحائف بھیجا۔ اور دیورایا نے بھی اپنی بیٹی کو جہیز میں علاوہ زروجواہر کے بنکاپور کا قلعہ دیا۔

فرشتہ نے اس شادی کی کیفیت نہایت تفصیل سے دی ہے۔ لیکن مغربی مورخین لکھتے

میں کو مسلمانوں کی یہ ایک ایسی سنگین غلطی تھی۔ جس کی تلافی دو صدیوں تک ہو نہ سکی۔ ہندو بالکل پسپا ہو چکے تھے۔ جنوبی ہند پر مسلمانوں کا نہایت آسانی سے قبضہ ہو جاتا۔ لیکن فیروز نے اس موقع کو کھو دیا۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ فیروز کا مقصد اس شادی سے یہی تھا کہ بہمنی سلطنت اور وجیانگر کے درمیان جو طولانی جنگوں کا سلسلہ سالہا سال سے چلا آرہا تھا۔ اس رشتہ کے ذریعہ اس کا خاتمہ ہو کر ایک مستقل محبت و اتحاد کی بنیاد پڑ جائے۔

(نوٹ:۔ بعد میں مغلیہ شہنشاہ اکبر نے بھی یہی پالیسی اختیار کی)

مورخ سکاٹ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"وہ لڑکی جس کے لئے اس قدر خونریزی ہوئی تھی۔ اسکو فیروز نے اپنے دربار میں طلب کیا۔ پرتھال کے حسن خداداد کو دیکھکر اس پر حسرت چھا گئی۔ اس نے اس کی شادی اپنے بڑے بیٹے حسن سے کر دی۔"

اس جنگ کے بعد دیورایا کے عہد کے باقی سال نہایت امن و امان سے گذرے۔

گیارہویں سال کے خاتمہ پر پھر ہندو اور مسلمانوں میں جنگ چھڑ گئی۔

میسور گزیٹیر کے صفحہ ۱۵۴ پر یہ مرقوم ہے:۔

"۱۴۱۷ء میں فیروز نے پنگل پر چڑھائی کی۔ یہ راجہ معانی ادہونی سے ۸ میل شمال میں تھی۔ اور یہاں کا راجہ دیورایا کے عزیزوں میں تھا۔ پنگل کا محاصرہ دو سال تک رہا۔ اس عرصہ میں ملک میں دبا پھیل گئی۔ جس کی وجہ سے اسلامی فوج میں سپاہی مرنے لگے۔ لیکن فیروز نے محاصرہ نہیں اٹھایا۔ یہ دیکھکر اس کے اکثر امراء علیحدہ ہونے شروع ہو گئے۔ دیورایا موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے اس

وقت فیروز پر حملہ کر دیا۔ ایک سخت جنگ کے بعد فیروز کو شکست ہوی۔ سید فضل اللہ جو اس کا بہترین جنرل تھا۔ اس جنگ میں مارا گیا۔ یہ دیکھکر مسلمانوں کا دل ٹوٹ گیا۔ اور راہ فرار اختیار کی“

فرشتہ لکھتا ہے :-

”اس موقع پر ہندو فوج نے غازیوں کے سر تن نازنین سے اس قدر جدا کئے۔ کہ میدان جنگ میں ان کے سروں کا چبوترہ بن گیا“

ہندو فوج نے مسلمانوں کا تعاقب کیا۔ اور بہمنی سلطنت کا جنوبی علاقہ، دوآبہ رائچور اور تمام ملک دریائے کرشنا تک ہندوؤں کے قبضہ میں آ گیا۔ فیروز نے گجرات سے مدد طلب کی۔ لیکن یہ فوج وقت پر نہیں پہونچی۔ ہندو دریائے کرشنا پر رک گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دریا سے پار ہو کر مسلمانوں پر حملہ کریں۔ فیروز پایۂ تخت پہونچکر اس شکست کے صدمے سے مر گیا۔ یہ پہلی شدید شکست تھی جو مسلمانوں نے ہندوؤں کے ہاتھ سے اٹھائی۔ اور اس کا اثر بہت دور رس نکلا۔ اسی سال دیورایا کا بھی انتقال ہو گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ دیورایا نے رفاہ عام کے کاموں میں اس قدر دلچسپی نہیں لی۔ جسقدر اس کے پیشروؤں نے لی تھی۔ دریائے ہری درا پر اس کے عہد میں ایک پل باندھا گیا۔ یہی ایک کارنامہ ہے جو تاریخ میں اس کی یادگار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیورایا نے اپنی تمام کوشش فوج کی تنظیم اور اس کے ذریعہ اس توہین کا انتقام لینے میں صرف کی جو پہلے پرتھال کی وجہ سے اور بعد میں اپنی بیٹی کو ایک مسلمان کو دینے سے ہوی تھی۔ جنوبی ہند میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ ہندوؤں نے اپنی بیٹی مسلمانوں کو دی ہو۔ اور شاید یہی وہ جذبہ تھا جو وجیانگر کے آئندہ

راجاؤں کو بھی ہر وقت مسلمانوں کی توہین پر آمادہ کرتا رہتا تھا۔ اور عرصہ تک دوآبہ رائچور کی سرزمین خون سے گلریز رہی۔

ویرا وجے رایا (یا بکارایا سوم)

۱۴۲۲ء۔ ۱۴۲۴ء

(معاصرین:۔ احمد شاہ بہمنی ۱۴۲۲ء ۱۴۳۵ء)

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ادھر فیروز کا انتقال ہوا۔ اور ادھر اس کے خسر اور حریف دیورایا کا بھی اسی سال انتقال ہو گیا۔ فیروز نے پنگل پر چڑھائی کی تھی۔ اور اس کو اس کی امید نہیں تھی۔ کہ غیر متوقع طور پر دیورایا اس پر حملہ کریگا۔ اور خصوصاً ایسے وقت جبکہ فوج بیماری سے پریشان ہو۔ اور اس کے سردار اس کو چھوڑ چھوڑ کر جا رہے ہوں۔ مسلمانوں کے لئے جواب تک ہمیشہ فتحیاب ہوتے رہے تھے یہ شکست ناقابل برداشت تھی۔ اگر موت فیروز کا خاتمہ نہ کردیتی تو یہ یقینی تھا کہ وہ وجیانگر پر پھر حملہ کرتا۔ لیکن اس کو مہلت نہ ملی۔ اس کے بعد اس کا بھائی احمد شاہ بہمنی تخت پر بیٹھا۔ اور اس نے اپنے بھائی کی شکست کی تلافی کے لئے وجیانگر پر چڑھائی کردی۔ لیکن اس وقت وجیانگر میں دیورایا نہیں بلکہ اس کا بھائی وجے رایا تخت نشین تھا۔ قسمت نے اگلے دونوں حریفوں کے بھائیوں کو ہی ایک دوسرے کے مقابلہ میں ٹھہرایا۔

ہسٹورک لینڈ مارکس آف دی دکن کا مصنف لکھتا ہے:۔ (صفحہ ۱۱۵)

"احمد شاہ نے تخت نشینی کے فوراً ہی بعد چالیس ہزار سوار لیکر دوآبہ دکن پر حملہ کیا۔ اور دریائے تنگ بھدرا کے شمالی کنارے پر مقیم ہوا۔ وجے رایا جس نے اگلی جنگ میں جس میں فیروز کو شکست ہوئی تھی۔ حصہ لیا تھا۔ سمجھا کہ اس وقت بھی

مسلمانوں کو اسی آسانی سے شکست دی جاسکتی ہے۔ جس طرح پہلی بار دی گئی تھی۔ وہ دس لاکھ پیادہ فوج لیکر دریائے تنگ بھدرا کے دوسرے کنارے پر مقیم ہوا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل چالیس دن تک پڑی رہیں چالیسویں دن احمد شاہ نے اپنے امیروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے رائے دی کہ دریا کو عبور کیا جائے۔ جب یہ خبر ہندو لشکر میں پہونچی تو اڑیسہ کا راجہ گجپتی جو وجے رایا کی مدد کے لئے آیا تھا۔ اس سے علیحدہ ہوگیا۔ لیکن وجے رایا نے ہمت نہیں ہاری۔ اس عرصہ میں مسلمانوں کے دو پٹھان سردار عالم خاں اور لودھی خاں نے دس ہزار سواروں کی جمعیت لیکر رات کے وقت دریا کو ایک ایسی جگہ سے عبور کیا۔ جس کی ہندوؤں کو خبر نہیں تھی۔ دریا کو عبور کرکے انہوں نے ایک چکر دار راستہ سے ہندو فوج کے عقب میں پہونچکر اچانک اس جگہ حملہ کیا۔ جہاں دیوا وجے رایا کا کیمپ تھا۔ دیوا وجے رایا کو اس غیر متوقع حملے کا گمان تک نہ تھا۔ کیمپ سے قریب وہ ایک نیشکر کے کھیت کے پاس اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ آرام کر رہا تھا۔ مسلمانوں کے اس حملے کے ساتھ ہی محافظین تو بھاگ گئے۔ اور وجے رایا نے سمجھا کہ مسلمان خاص اسکی ذات پر حملہ کرنے کیلئے آئے ہیں۔ اس لئے وہ نیشکر کے کھیت میں گھس گیا۔

مسلمانوں نے بالکل اچانک طور پر یہ حملہ کیا تھا۔ اس سے ہندو فوج میں پریشانی پھیل گئی۔ اور ان کے سنبھلنے تک احمد شاہ دریا کو عبور کرکے مقابل میں آگیا جس سے انکی رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ اور وہ فرار ہونا شروع ہوگئے۔

نیشکر کے کھیت کے پاس جو چند مسلمان تھے۔ وہ محافظین کے فرار ہوتے ہی اپنی پیاس بجھانے کیلئے گھوڑوں سے اترے اور نیشکر کاٹنے لگے۔ یہاں وجے رایا جو چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ انہیں مل گیا۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ کھیت کا مالک ہے۔ اس لئے کہ اس وقت وہ بالکل سادہ لباس میں تھا۔ انہوں نے نیشکر کا ایک گٹھا اس کے سر پر لادکر لے چلنے کیلئے کہا۔ دوسری طرف ہندو فوج کے فرار ہو جانے سے مسلمانوں کے لشکر میں فتح کا غلغلہ بلند تھا۔ اس فتح کی نوید سنکر مسلمان نیشکر چھوڑ کر مال غنیمت لوٹنے کیلئے چلے گئے۔ وجے رایا کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اور جس وقت یہ اپنے امراء سے ملا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ منتشر فوج کو جمع کر کے مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔"

یہی مورخ لکھتا ہے ا۔

" نازوں کے پلے ہوئے راجہ کو کبھی اس قدر وزن اٹھانے کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ نیشکر کے بھاری بوجھ نے اس کے دماغی توازن کو خراب کر دیا تھا۔ اس نے بجائے مقابلہ کرنے کے یہی مناسب سمجھا کہ وجیانگر چلکر وہ قلعہ بند ہو جائے۔ احمد شاہ نے وجیانگر کا محاصرہ کرنے کے بجائے ملک کے اور حصوں میں قتل و غارت شروع کی۔ گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیئے گئے۔ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا بچہ جو کوئی ہاتھ آیا قتل کر دیا گیا۔ مندروں کو اجاڑ دیا گیا۔ احمد شاہ نے یہ معمول کر دیا کہ جب مقتولوں کی تعداد بیس ہزار تک پہونچتی تو تین دن تک جشن مناتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر جس طرح وجے رایا کی جان بچی یہ بھی بال بال بچ گیا۔

ایک دن احمد شاہ اپنے چند ساتھیوں کو لیکر شکار کے لئے جنگل میں گیا۔ اس کے ساتھ اس وقت پانچ سو سپاہی تھے۔ جب یہ شکار کھیل رہا تھا تو اچانک ہندوؤں کی ایک فوج آ گئی انہیں جب معلوم ہوا کہ ان کا دشمن احمد شاہ شکار کھیل رہا ہے۔ تو انہوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ محافظین نے نہایت سختی سے اسکی حفاظت کی۔ انہوں نے لڑتے ہوئے قریب کی ایک چار دیواری میں پناہ لی۔ جو عام طور پر مویشیوں کو بوقت ضرورت پناہ دینے کیلئے جنگلوں میں بنی رہتی ہے۔ احمد شاہ نے چار دیواری میں پناہ لی اور اس کے محافظین اس کو گھیرے ہوئے ہندوؤں کے حملے سے بچا رہے تھے۔ مسلمان کٹ کٹ کر مر رہے تھے لیکن ہندوؤں کو چار دیواری تک پہونچنے نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ احمد شاہ کے پانچ سو سپاہیوں میں قریب قریب کل رہ گئے۔ اور ہندوؤں نے چار دیواری تک پہونچکر دیواریں توڑنی شروع کر دیں۔

احمد شاہ صبح شکار کے لئے چلا تھا۔ اور جب اس کی واپسی کا وقت گذر گیا تو اسلامی لشکر کے ایک سردار عبدالقادر نے سمجھا کہ بادشاہ کسی آفت میں پھنس گیا ہے۔ اس لئے وہ سواروں کا ایک منتخب دستہ لیکر بادشاہ کی تلاش میں نکلا۔ اور عین وقت پر وہاں پہونچا۔ جب ہندو چار دیواری کو منہدم کر رہے تھے۔ عبدالقادر نے آتے ہی ہندوؤں پر حملہ کر دیا۔ ہندو فوج اس حملہ کی تاب نہ لا کر بھاگی۔ اس طرح احمد شاہ کی جان بچ گئی۔"

قدرت کی ستم ظریفی کہیئے یا اتفاق۔ اس جنگ میں دونوں حریف آفتوں میں پھنس کر بچ گئے۔ احمد شاہ نے اس کے بعد وجیانگر کا محاصرہ کر لیا۔ جس سے تنگ آ کر وجے رایا نے صلح

چاری اور دو آبہ رائچور پر مسلمانوں کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔

اس جنگ کے خاتمہ نے جس طرح فیروز پر اثر ڈالا تھا۔ وجے رایا پر بھی وہی اثر ڈالا۔ ادھر احمد شاہ کی واپسی ہوئی۔ اور ادھر وجے رایا انتقال کر گیا۔ اس کے عہد کے پورے دو دو سال اسی جنگ میں گذر گئے۔ اس کے بعد گیارہ سال تک ہندوؤں کو دو آبہ رائچور کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ احمد شاہ نے اس وقت وہ تمام خراج وصول کیا جو تغلق کے زمانے کے بعد سے ہندوؤں نے اب تک مسلمانوں کو ادا نہیں کیا تھا۔ اور آئندہ بھی خراج دینے کا وعدہ لیا گیا۔

دیورایا دوم

۱۴۲۴ء سے ۱۴۴۶ء

(معاصرین :- احمد شاہ ۱۴۲۲ء سے ۱۴۳۵ء۔ علاؤ الدین احمد شاہ ثانی ۱۴۳۵ء سے ۱۴۵۸ء)

وجے رایا کی وفات کے بعد اس کا دوسرا بھائی دیورایا دوم تخت نشین ہوا۔ تاریخوں میں اس کو مختلف ناموں سے لکھا گیا ہے۔ اماڈی دیورایا۔ پرتاپ دیورایا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے عہد کے گیارہ سال بالکل امن سے گذرے۔ اس زمانے میں اس نے بہت سے رفاہ عام کے لئے کام کئے۔ پائے تخت کو مضبوط بنایا گیا۔ بہت سی نئی عمارتیں اور منادر تعمیر ہوئے۔ فوج کی از سر نو تنظیم کی گئی۔ تاریخ سیلون مصنفہ ایچ ڈبلیو کارڈنگٹن میں لکھا ہے۔ کہ اس زمانے میں دیورایا نے سیلون پر ایک کامیاب حملہ کیا تھا۔ لیکن دوسرے مورخین لکھتے ہیں کہ یہ حملہ جنوبی ہند کے ان ساحلی مقامات پر ہوا تھا۔ جس پر سیلون والے قابض ہو گئے تھے۔

دیورایا کے عہد میں ہینڈر ذات کے ہندوؤں نے بغاوت کی جو کچل دی گئی۔

۱۴۳۵ء میں احمد شاہ کی وفات پر علاؤ الدین احمد اس کا جانشین ہوا۔ اور اسی سال دوآبہ رائچور میں اس کے خلاف بغاوت ہوی۔ ایک تو وجیا نگر نے پانچ سال سے خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔ اور دوسرے اب اس بغاوت نے یہ گمان پیدا کر دیا کہ اس کی تہ میں وجیا نگر والوں کا ہاتھ ہے۔ علاؤ الدین نے اپنے چھوٹے بھائی شاہزادہ محمد کو اس بغاوت کے فرو کرنے کو بھیجا۔ اور ساتھ ہی حکم دیا کہ وجیا نگر سے خراج وصول کیا جائے۔ محمد نے بغاوت فرو کرکے وجیا نگر کے علاقوں کو تباہ کرنا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر دیوراپا نے خراج ادا کر دیا اور مسلمان واپس ہو گئے۔ (میسور گزیٹیر)

مسلمانوں کے واپس ہونے کے بعد دیوراپا نے اپنے امیروں، مشیروں اور پنڈتوں کو بلا کر مشورت کی کہ مسلمان کس لئے ہمیشہ ہندوؤں پر جنگ میں غالب آتے ہیں۔ برہمنوں نے اپنے نمول کے مطابق کہا کہ قدرت نے تیس ہزار سال تک مسلمانوں کی قسمت میں حکومت لکھی ہے۔ لیکن سرداران فوج نے کہا کہ مسلمانوں کی فتح کا سارا راز ان کی سوار فوج اور ان کے تیر اندازوں کی قابلیت میں ہے۔ اور جب تک ہندو بھی تیر اندازی میں یہی کمال حاصل نہ کریں گے۔ اور ان کے گھوڑے بھی اسی قدر تیز رو نہ ہوں گے۔ ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دیوراپا کو یہ تجویز پسند آ گئی۔ اور اس نے اسی وقت حکم دیا کہ مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کیا جائے اور انکی عبادت کیلئے پایۂ تخت میں ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ (میسور گزیٹیر)

مسلمان تو فوج میں بھرتی ہوئے۔ لیکن اس کے آگے وہ سر نہیں جھکاتے تھے۔ یہ دیکھ کر اس نے حکم دیا کہ آئندہ تخت پر ایک قرآن مجید کا نسخہ رکھا جائے۔ کہ کم از کم مسلمانوں کا سر اس کی تعظیم کے لئے جھک جائے۔ مسلمانوں کو ہندو فوج کی اتالیقی پر مقرر کیا گیا۔ سوار فوج کی تنخواہ بڑھا دی گئی۔ کہ وہ ہمیشہ عمدہ اور تیز رو گھوڑے

رکھا کریں۔ (میسور گزیٹیر)

سات سال کی پیہم کوشش نے اب دیورایا کو یقین دلا دیا کہ اس کی فوج اب مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس حملہ کی محرک ایک اور بات بھی ہوی۔ دکن کے مسلمان اپنے شمالی علاقوں میں متواتر دو سال سے جنگ میں مصروف تھے۔ اس لئے دیورایا نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ اس نے ۸۴۳ھ کے آخر میں دوآبہ رائچور پر حملہ کرکے مدگل پر قبضہ کر لیا۔ اور اپنے دونوں بیٹوں کو بنکاپور اور رائچور کے قلعے فتح کرنے کے لئے بھیجا۔ اور آپ خود فوج لیکر دریائے کرشنا کی جانب بڑھا۔

مورخ ہیگ لکھتا ہے:۔

"علاؤالدین احمد کو جب اس حملے کی خبر پہونچی تو وہ خود فوج لیکر مقابلہ میں آیا دریائے کرشنا پر ایک معمولی جنگ کے بعد ہندو فوج پیچھے ہٹ کر مدگل میں مدافعت کیلئے ٹہری۔ علاؤالدین نے اپنے جنرل خلف حسن بصری کو رائچور اور بنکاپور پر روانہ کیا۔ اور آپ مدگل طرف بڑھا۔ خلف حسن بصری کی آمد سن کر دیورایا کے دونوں بیٹوں نے رائچور اور بنکاپور کا محاصرہ اٹھا کر باپ سے آکر مل گئے خلف حسن بصری بھی علاؤالدین احمد سے آکر ملا۔ مدگل میں تین جنگیں ہوئیں۔ پہلی جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوی۔ دوسری جنگ میں ہندو پسپا ہوئے۔ لیکن تیسری جنگ میں جو پہلی دو جنگوں سے زیادہ خونریز تھی مسلمان کامل طور پر فتح یاب ہوئے۔ دیورایا کا بیٹا جو رائچور کے محاصرہ پر گیا تھا۔ میدان جنگ میں مارا گیا۔ اس کے مرتے ہی ہندو فرار ہوئے۔ مسلمانوں نے تعاقب شروع کیا۔ اور یہ تعاقب اس تیزی سے ہوا کہ مسلمانوں کے دو سپہ سالار فخرالملک

دہلوی اور اس کا بھائی یہاں تک بڑھتے چلے گئے کہ مدگل کے قلعے میں ہندوؤں
کے ساتھ ہی داخل ہو گئے۔ ہندوؤں نے انہیں دیکھ کر دروازہ بند کر دیا۔ دونوں
مسلمان سردار جب دیورایا کے آگے پیش کئے گئے۔ تو اس نے حکم دیا کہ انہیں
زنجیریں پہنا دی جائیں "۔

علاؤالدین احمد کو جب یہ خبر پہونچی تو اس نے دیورایا کو کہلا بھیجا کہ ہر سردار کی قیمت ایک ہزار سوار کے برابر ہے۔ اور ہر ایک کے عوض دس ہزار ہندوؤں کو قتل کیا جائیگا۔ علاؤالدین نے مدگل کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔ دیورایا نے محاصرہ کی شدت دیکھ کر صلح طلب کی۔ سالانہ خراج دینے اور دوآبہ رائچور کے خالی کرنے کا وعدہ کیا۔ اور اس نے ان شرائط کی تعمیل بھی کی۔

اس جنگ کے بعد اس کا عہد بالکل امن سے گذرا۔ اسکی وفات ۱۴۴۶ء میں ہوی۔

دیورایا کا عہد کنڑی زبان کی ترقی کیلئے نہایت مشہور ہے۔ اس کے زمانے میں بہت سے نامور شاعر پیدا ہوئے۔ جن میں مہالنگ دیو، لکنا ڈنڈیسا، کمار بنکھنا بہت مشہور ہوے ہیں۔ کنڑی نثر میں بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ چراسا، کی اویاسا، گبیا ملنا وغیرہ اسی زمانے کے مصنف ہیں۔ ملنا اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔

" دیورایا کتابوں کی تصنیف پر بہت سا روپیہ خرچ کرتا تھا۔ وہ خود عالم و فاضل
تھا اور عالموں اور شاعروں کا قدر دان تھا "

دیورایا سیوا مذہب کا معتقد تھا۔ لیکن ہندوؤں کے دوسرے فرقوں سے بھی رواداری برتتا تھا۔ اسی نے پائے تخت میں جین فرقہ کے لئے ایک مندر تعمیر کیا۔ جینیوں کے لئے ملک میں اس وقت تک کوئی مندر نہیں تھا۔ سرنگا پٹم میں جو کتبہ دستیاب ہوا ہے۔ اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ اس نے یہاں کے برہمنوں کو ایک مرصع طلائی گائے بھی دی تھی ۔

مشہور ایرانی سیاح عبدالرزاق اور اطالوی سیاح نکولو اسی کے عہد میں وجیانگر آئے تھے۔ اورانہوں نے اپنے اپنے سفرناموں میں وجیانگر کی مال ودولت، راجہ کے کروفر، شہر کی وسعت اور عظمت وغیرہ ان تمام حالات کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے ۔ جن سے اس کی سلطنت کی عظمت معلوم ہوتی ہے ۔

ایرانی سیاح عبدالرزاق لکھتا ہے :-

" راجہ کی سلطنت سرحد سراندیب سے گلبرگہ تک تھی ۔ یعنے راس کماری سے رود کرشنا تک ۔ ہزاروں ہاتھی بلند قامت مثل پہاڑ کے دیووں کی سی ہیبت ناک شکل کے دکھلائی دیتے تھے ۔ گیارہ لاکھ فوج تھی ۔ تمام ملک ہندوستان میں اس سے بڑھکر کوئی سلطنت نہ تھی ۔ یہاں کا حکمران " رایا " کہلاتا تھا ۔ شہر بیجانگر ایسا ہے کہ لاعین رأت ولا اذن سمعت (نہ آنکھ نے دیکھا اور نہ کان نے سنا) اور سہ

اگر فردوس بر روئے زمیں است   ہمیں است وہمیں است وہمیں است

روئے زمین پر کوئی شہر اسکے برابر نہ ہوگا ۔ اس کی بنیاد ایسی ہے کہ سات گڑھیاں اور سات فصیلیں ایک کے اندر ایک ہیں ۔ راجہ کے محل کے پاس چار بازار ہیں ۔ جو مثل چوراہے کے چاروں طرف واقع ہیں ۔ بجانب شمال راجہ کے محل ستون دار ڈیوڑھی واقع ہے ۔ ہر بازار میں بلند محراب دار مکان مع برآمدے کے ہیں ۔ لیکن راجہ کا دربار ہال سب مکانوں سے بلند ہے ۔ بازار بے انتہا لمبے اور چوڑے ہیں ۔ بازار میں ہر قسم کے بیوپاریوں کی دوکانیں سلسلہ وار ایک

دوسرے کے برابر برابر ہیں۔ جوہری جواہرات سر بازار فروخت کیا کرتے ہیں۔

اس شہر میں عموماً اور محلات میں خصوصاً بہت سی نہریں واقع ہیں۔ راجہ کے ایوان کے بائیں طرف ایک بہت بڑا وسیع اور عالیشان دیوان خانہ ہے۔ جو فی نفسہ ایک عظیم الشان محل ہے۔ اس دیوان خانہ کے سامنے ایک ہال ہے۔ جس کی بلندی قد آدم سے زیادہ طول تیس گز اور عرض دس گز ہے۔ اس میں دفتر رکھا جاتا ہے۔ اور اہل عمل بیٹھتے ہیں۔ رانیاں اور راجہ کی بیبیوں کی تعداد سات سو ہے۔"

اسی ایرانی سیاح عبدالرزاق نے مہانومی کے تہوار کا حال اس طرح لکھا ہے:۔

"راۓ بیجانگر نے اپنی ریاست کے تمام امراء و روساء کے نام دعوت کے خطوط بھیجے۔ سب لوگ دارالسلطنت میں حاضر ہو گئے۔ امراء کے ہاتھیوں کی تعداد ایک ہزار ہو گی۔ ہر امیر اپنے اپنے ہاتھیوں کو عمدہ انباری اور ہودجوں اور جگمگاتے زیورات اور ہتھیاروں سے سجا کر لایا تھا۔ میدان جہاں میلہ ہوتا تھا۔ بہت عمدگی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اور تین دن تک برابر بڑی چہل پہل رہی۔ اس میدان میں یہ بڑے بڑے ہاتھی ایسے معلوم دیتے تھے کہ گویا سمندر کی بڑی بڑی اور کالی کالی موجیں لہرا رہی ہیں۔ اور آدمیوں کی ایسی بھیڑ تھی۔ کہ سوائے میدان حشر کے ہونا ناممکن ہے۔ اس وسیع میدان میں سینکڑوں منڈوے اور منڈپ سہ منزلہ، چہار منزلہ اور پانچ منزلہ تک ڈالے گئے تھے۔ ان منڈووں کو اوپر سے نیچے تک مجسم بتوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بعض منڈوے اس میں اس ترکیب سے بنائے گئے تھے۔ کہ ان کا رخ بدلتا رہتا تھا۔ ہر وقت ایک نیا

گرد یا برآمدہ چکر کھا کر سامنے آجاتا تھا۔ بس میدان کے سامنے ایک محل نو عظیم الشان اور آراستہ منڈووں کا بنایا گیا تھا۔ نویں منڈوے میں راجہ کا تخت تھا۔ راجہ کے منڈوے کے مقابل ایک خوبصورت پردے کے پیچھے طوائف مغرق لباس پہنے ناچ رہی تھیں۔ گارو ڑی اور دوسرے بے شمار تماشے اور کرتب والے اپنا اپنا کمال دکھلا رہے تھے۔ ان لوگوں نے ہاتھیوں کو خوب سدھایا تھا جو طرح طرح کے تماشے کرتے تھے۔ طلوع آفتاب سے غروب تک تین دن اسی طرح بڑی شان و شوکت کے تماشے رہے۔ آتش بازی۔ کھیل۔ تماشے ہر قسم کا سامان دلچسپی موجود تھا۔ راجہ ایک بہت بڑے تخت پر برآمد تھا۔ جو سونے کا بنا ہوا تھا اور اس پر بیش بہا جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ تخت کے سامنے ایک مربع گدی رکھی ہوئی تھی۔ جس کے اطراف میں تین قطاریں موتیوں کی ٹکی ہوئی تھیں۔ تین روز تک راجہ اسی گدی پر بیٹھتا تھا۔"

ملیکارجنا (وجے رایا دوم)

۱۴۴۶ء سے ۱۴۶۷ء

(معاصرین:۔ علاؤالدین احمد بہمنی ۱۴۳۶ء سے ۱۴۵۵ء۔ ہمایوں شاہ بہمنی ۱۴۵۵ء سے ۱۴۶۱ء۔ نظام شاہ بہمنی ۱۴۶۱ء سے ۱۴۶۳ء۔ محمد شاہ دوم بہمنی ۱۴۶۳ء سے ۱۴۸۲ء)

اپنے باپ دیورایا دوم کی وفات کے بعد ملیکارجنا تخت نشین ہوا۔ مورخوں نے اس کو وجے رایا دوم کا خطاب دیا ہے۔ اس کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال اڑیسہ کا راجہ گجپتی کپل سیوڑا نے وجیانگر کے مشرقی مقبوضات پر حملہ کیا۔ لیکن اس جنگ میں اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۶ سولہ

سال بعد پھر اس نے حملہ کیا۔ اور اس وقت بھی وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

ملیکارجنا کا عہد سوائے ان معمولی مہموں کے بالکل امن سے گذرا۔ اس کے عہد کا قابل قدر واقعہ یہ ہے کہ اس نے نذرانہ لینے کی رسم موقوف کر دی۔ تمام ملک میں قدیم زمانہ سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ سلطنت کے وزراء اور دوسرے عہدہ دار رعایا سے نذرانہ لیتے تھے۔ بعض بعض موقعوں پر اس نذرانہ کیلئے رعیت پر اس قدر ظلم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے ملکوں کو چلی جاتی تھیں۔ ملیکارجنا کے عہد میں اس ظلم وستم میں اور اضافہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ مندروں میں عبادت اور تہوار تک بند ہوگئے۔ ملیکارجنا نے ملک کی اس تباہ حالت کو دیکھ کر اس رسم کو سختی سے موقوف کر دیا۔

ملیکارجنا کی اخیر عمر حد درجہ عیاشی وشراب خواری میں بسر ہوی۔ اس کی غفلت کی وجہ سے ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔ اور اسی عیاشی وشراب خواری نے ۱۴۶۷ء میں اس کا خاتمہ کر دیا۔

ویراپکشا

۱۴۶۷ء سے ۱۴۷۹ء

(معاصرین :- محمد شاہ دوم بہمنی ۱۴۶۳ء سے ۱۴۸۲ء تک)

ملیکارجنا کے بعد اس کا چچا ویراپکشا تخت نشین ہوا۔ عیاشی اور شرابخواری میں یہ اپنے بھتیجے سے بڑھکر نکلا۔ اس کی تمام زندگی حرم سرا کی عورتوں میں بسر ہوئی۔

راجہ کی اس غفلت وعیاشی سے تمام ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔ مختلف راجہ اور سردار اپنی اپنی جگہ خود مختار بن بیٹھے۔ بھاویرن نایک پکھی میں راجہ بن بیٹھا۔ مدورا کے نایک خاندان نے

خراج بھیجنا بند کر دیا۔ ملیبار کے کلبہا خاندان نے آزادی کا دعویٰ کیا۔ اس طرح جنوبی ہند کی ریاستوں میں پھر ایک بار افتراق پھیل گیا۔ لیکن ویروپکشا نے کچھ توجہ نہیں کی بلکہ اس کا ظلم و ستم اور عیاشی و شرابخواری پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔

۱۴۷۹ء میں ویروپکشا کو معلوم ہوا کہ بھٹکل کے مسلمان تاجروں نے جس قدر گھوڑے درآمد کئے تھے۔ وہ سب کے سب بہمنی سلطان کے ہاتھ فروخت کر دئے ہیں۔ اور اس سال وجیانگر کے لئے کوئی گھوڑا باقی نہیں رہا۔ ان کی اس کارروائی نے ویروپکشا کو اس قدر برافروختہ کیا کہ اس نے یہاں کے تمام مسلمانوں کے قتل عام کا حکم دیدیا۔ اور ان تمام مسلمانوں کو جنہیں دیورایا نے فوج میں ملازم رکھا تھا۔ ملک سے نکالدیا گیا۔ روسی سیاح بیاروس جو اس زمانے میں سیاحت کے لئے وجیانگر آیا ہوا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے :-

"راجہ ویروپکشا کے حکم سے دس ہزار عرب تاجر قتل کر دئے گئے۔ جن عربوں نے بھاگ کر گوا اور عرب میں پناہ لی بچ گئے۔ لیکن ہندوؤں نے گوا کا بھی محاصرہ کر لیا۔"

مسٹر رگنیشر ہندو مصنف لکھتا ہے :-

"عربوں کا یہ قتل ویروپکشا کی عادت سے بعید نہیں تھا۔"

سیول اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"مسلمانوں کے اس قتل کی خبر جب گلبرگہ میں پہونچی تو بہمنی سلطان کے وزیر ملک التجار محمود گاوان نے گوا پر فوج کشی کر کے مسلمانوں کو ان مظالم سے نجات دلائی۔"

اس کے تین سال بعد ویروپکشا نے پھر گوا پر مسلمانوں کے خلاف فوج کشی کا حکم دیا۔ لیکن مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر یہ حملہ رک گیا۔ لیکن دوسری طرف ۱۴۷۰ء میں مسلمان اس کے مشرقی مقبوضات پر حملہ کر کے ملک کے ایک بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ اس وقت مسلمانوں نے ملک تلنگانہ کو فتح کر لیا تھا۔ اور اس طرح وہ تمام اضلاع جن کو آج شمالی سرکار (Northern Circars) کہا جاتا ہے۔ یعنے گنجام، اسحاق پٹن، گوداوری اور کرشنا کے اضلاع مسلمانوں کے قبضہ میں آ چکے۔ ایک طرف جب ہندو گوا پر فوج کشی کا ارادہ کر رہے تھے۔ تو مشرقی اضلاع میں وجیانگر کے گورنر نرسمہا ان ہندو زمینداروں کو مسلمانوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر رہا تھا۔ جو کرشنا اور گوداوری کے اضلاع میں آباد تھے۔

فرشتہ لکھتا ہے :-

"یہ نرسنگھ ایک راجہ قوی ہیکل اور عظیم الجثہ تھا۔ اور کثرت مال اور وفور افواج میں موصوف اور ولایت کرناٹک اور تلنگ کے درمیان مقام رکھتا تھا۔ اور سواحل سمندر کے مچھلی پٹن تک اس کے تحت حکومت تھے۔ اکثر اوقات زمینداروں کو جنگ پر مستعد اور آمادہ کر کے اور خود ان کا مددگار ہو کر شاہان بہمنیہ کی سرحد میں شور و غوغا برپا کرتا تھا۔" (صفحہ ۵۱۲ مطبوعہ نولکشور)

سلطان محمد شاہ کو جب یہ خبریں پہونچیں تو وہ ان زمینداروں کو سزا دینے کیلئے نکلا۔ اور انہیں مطیع کر کے مچھلی بندر کے قریب دریائے کرشنا کو عبور کر کے کونڈاپور ضلع نلور پر بڑھا یہاں اس کو معلوم ہوا کہ نرسنگھ کے علاوہ کنجی ورم کا راجہ بھی اس سازش کے سرغناؤں میں سے ہے۔ بلکہ یہ تمام آگ اسی کی لگائی ہوئی ہے۔ سلطان محمد نے کنجی ورم کے متعلق دریافت

کیا فرشتہ لکھتا ہے :-

"سلطان جب کوندپور پہونچا ایک جماعت وہاں کے متوطن نے معروض کیا کہ یہاں سے دس منزل پر ایک بت خانہ ہے کہ کنجی نام رکھتا ہے۔ اور در و دیوار اور سقف اس کے زیورہ جواہر سے آراستہ اور لآلی وگوہر نفیسہ سے پیراستہ اور آج تک شاہان اسلام نے اس کو نہیں دیکھا۔ بلکہ نام بھی اس کا نہیں سنا۔ سلطان محمد شاہ چھ ہزار سوار خنجر گذار لشکر سے جدا کرکے بطور یلغار اس طرف متوجہ ہوا" (صفحہ ۵۱۲۔ مطبوعہ نولکشور)

چنگل پٹ ڈسٹرکٹ میانول کا مصنف صفحہ ۱۴ پر لکھتا ہے :-

" بہمنی سلطان نے اس شہر پر قبضہ کرکے اس کو تلوار اور آگ کی نذر کردیا۔ یہاں کے مشہور مندر کو لوٹ کر تباہ کردیا گیا"

فرشتہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کنجی کا راجہ اس جنگ میں مارا گیا۔ اور سلطان محمد شاہ نے شہر اور بت خانہ پر قبضہ کرلیا۔

فرشتہ نے کنجی ورم کے مندر اور اس کی دولت کے متعلق جو نظم لکھی ہے۔ وہ یہاں دی جاتی ہے :-

"ہمہ خانہ از گوہر و گنج پُر — نذرین بتاں ہم برآمودہ در
بہر یک صنم خانۂ دلپذیر — نہ چنداں گہر کاید اندر ضمیر
صنم خانہا جملہ گشتہ خراب — غنیمت چناں کس ندیدہ بخواب
بجز زیور و گوہر و گنج زر — نمی بردکس ہیچ چیزے دگر

محمد شاہ نے کندکور واپس ہوکر اپنے سردار حسن نظام الملک بحری۔ یوسف عادل خاں

اور مجدالملک کو اور مقامات فتح کرنے کیلئے بھیجا۔ انہوں نے اضلاع نلور، چنگل پیٹ، چیتور، گنٹور، اکڑپہ اور کرنول کے بہت سے مقامات پر قبضہ کرتے ہوئے پگنڈہ پر چڑھائی کی۔ معمولی محاصرہ کے بعد پگنڈہ بھی فتح ہو گیا۔ لیکن مسلمان ان مقامات میں مستقل طور پر نہیں ٹھہرے۔ بلکہ مقامی پالیگاروں اور رزاجاؤں سے ادائگی خراج کا عہد لیکر پلٹ گئے۔ ورنہ اگر ایک صوبہ قائم کر دیا جاتا تو جنوب کا یہ حصہ مدراس سے لیکر دریائے کرشنا تک اور مغرب میں پگنڈہ تک مستقل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں آجاتا۔ ممکن ہے کہ اس وقت کی سیاست نے محمد شاہ کو اس کی اجازت نہ دی ہو۔

ویروپکشا نے اپنے عہد میں بہت سے نئے نئے ٹکس جاری کئے۔ جس سے رعایا بہت تباہ اور بدظن ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ اس کے مظالم یہاں تک بڑھ گئے کہ اس کے وزراء اور افسران حکومت کی جان بھی غیر محفوظ ہو گئی۔

سیاح نیونز لکھتا ہے :-

"راجہ ویروپکشا ایک عجیب وغریب واہمہ میں مبتلا تھا۔ وہ اکثر اپنے سرداروں کو اس لئے قتل کر دیتا تھا کہ اس نے انہیں خواب میں اپنے حرم سرا میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔"

اسی راجہ کے عہد میں سیاح بیاروس کے علاوہ روسی سیاح نیکٹن بھی وجیانگر میں آیا ہوا تھا۔

ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب یہ حد سے بڑھ جاتا ہے تو ناقابل برداشت ہو کر مظلوم کو انتقام لینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ویروپکشا کے ظلم وستم کا بھی یہی انجام ہوا۔ جب وزراء اور امراء نے دیکھا کہ ان کی جانیں سلامت نہیں ہیں۔ تو انہوں نے اس کے خلاف سازش کی۔ اس سازش کا سرغنہ وہی نرسمہا تھا جو کہ مشرقی اضلاع کا گورنر اور محمد شاہ بہمنی کے مقابلہ میں

شکست کھا چکا تھا۔ اس نے راجہ کی یہ حالت دیکھ کر مختلف امراء اور سرداروں کو لکھا ہے۔

"ایک عادل و شفیق حکمران کے نہ ہونے سے تمام ملک تباہ ہو رہا ہے۔ اگر حالت یہی رہی تو عجب نہیں کہ اس سلطنت پر ہمیشہ کے لئے مسلمان قبضہ کر لیں۔ بہتر یہ ہے کہ ویروپکشا کو تخت سے اتار کر کسی دوسرے کو تخت نشین کیا جائے۔"

امراء نے اس تجویز کی تائید کی۔ نرسمہا اس وقت ضلع کنارا کا گورنر تھا وہ فوج لے کر خاموشی سے پایۂ تخت کو آیا۔ اور شاہی محل کا محاصرہ کر لیا۔ ویروپکشا کو جب خبر ہوئی تو وہ چور دروازے سے فرار ہو گیا۔ اور اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ امراء نے اتفاق کر کے نرسمہا کو تخت نشین کیا۔ اس طرح ۱۴۷۹ء میں وجے نگر میں بغیر خونریزی کے ایک خاموش انقلاب رونما ہوا۔

ایک دوسری روایت ہے کہ ویروپکشا کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے بڑے بیٹے نے جب باپ کے مظالم کو حد سے بڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ امراء نے اس کو تخت نشین کرنا چاہا۔ لیکن اس نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ اپنے باپ کا قاتل ہونے کی وجہ سے راجہ بن نہیں سکتا تھا۔ امراء نے ویروپکشا کے دوسرے بیٹے کو تخت پر بٹھایا۔ اس نے اپنے بھائی سے باپ کا انتقام لیا۔ لیکن یہ بھی صدور جہ عیاش نکلا۔ اس کا عہد ۱۴۷۹ء سے شروع ہو کر ۱۴۸۶ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس سال امراء نے اس کو معزول کر کے نرسمہا کو جس نے ویروپکشا کو معزول کیا تھا۔ تخت نشین کیا۔

بہر طور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکومت سنگما خاندان سے نکل کر ایک دوسرے خاندان میں منتقل ہو گئی۔

اور اگر نرسمہا کے خاندانی حالات دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ تلنگا اور سلووا ...

اگلے صفحات میں جن راجاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ سنگما خاندان سے ہیں۔ جس میں حکومت ہری ہر اول سے ۱۳۳۶ء میں شروع ہو کر ویروپکشا کے دوسرے لڑکے پر ۱۴۸۶ء میں ختم ہو گئی۔

(نوٹ :۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۷۹ء سے ۱۴۸۶ء تک نرسمہا بطور ریجنٹ رہا تھا)

نرسمہا۔اول

۱۴۸۶ء تا ۱۴۸۹ء

(معاصرین :۔ یوسف عادل شاہ بیجاپور ۱۴۹۰ء سے ۱۵۱۰ء۔ احمد نظام شاہ احمد نگر ۱۴۹۰ء سے ۱۵۰۸ء)

نرسمہا خاندان سلووا کا پہلا راجہ تھا جو تخت نشین ہوا۔ نرسمہا کو تخت جن حالات میں ملا تھا۔ پچھلی سطروں میں ان کا ذکر آچکا ہے۔ اس کے آبا و اجداد قدیم زمانہ میں ملک کنارا میں حکومت کرتے تھے۔ اس کی پیدائش عجیب و غریب حالات میں پنا او بلم میں جو دریائے پنار پر اروا کنڈہ اور انت پور کے درمیان ہے ہوئی۔ ہندو مورخین لکھتے ہیں کہ اولاد سے مایوس ہو کر اس کے ماں باپ نے پنا او بلم کے مندر میں منت مانی تھی۔ اور یہیں اس کی پیدائش ہوئی۔ نرسمہا نہ صرف کنارا کا حاکم تھا۔ بلکہ اس نے وجیانگر کے راجاؤں کے ماتحت مختلف مقامات پر گورنر بھی رہا۔ اور جنگوں میں شریک بھی ہوا تھا۔

اس کی تخت نشینی کے متعلق ہندو مورخین نے عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں۔ جو تاریخی صداقت سے بالکل معرا ہیں۔ میسور گزیٹر کا مصنف ہیودن راؤ اسی زمانہ کی ایک کتاب سلو ابھیا ودیم سے یہ روایت نقل کرتا ہے :۔

" اس نے رامیسورم تک تمام علاقہ کو فتح کر کے شمال میں دسرنا کے ملک پر چڑھائی کی۔ اور فتوحات حاصل کرتا ہوا ہمالیہ تک پہنچ گیا۔ اور یہاں سے پلٹ کر بنارس

میں تخت نشین ہوا۔ اس موقع پر خداؤں (بتوں) نے خوش ہو کر اس پر پھول
برسائے۔ اور ملک کے تمام راجہ جو اس موقع پر حاضر تھے۔ انہوں نے اس کو
اپنا شہنشاہ تسلیم کر دیا۔"

یہ کتاب نظم میں نرسمہا کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ شاعر نرسمہا کا درباری شاعر ہو۔ لیکن اس زمانے میں جب تحقیقات کیلئے ایک وسیع میدان موجود ہے۔ اور ناقابلِ انکار تاریخی شواہد موجود ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ میسور گزیٹیر کا ہندو مصنف آنکھ بند کر کے اس پر یقین کر لے۔ گو کہیں کہیں خود ہی اس روایت کے بعض واقعات کو جھٹلایا بھی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

" یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس روایت میں جس قدر واقعات ہیں۔ سب جھوٹ ہیں۔ دوسروں کے ملک پر چڑھائی کا قصہ مبالغہ سے خالی نہیں۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے۔ کہ اسکی تاجپوشی بنارس میں ہوئی۔ ممکن ہے کہ نرسمہا خود بنارس نہ گیا ہو۔ لیکن اپنی غاصبانہ حکومت کو مذہبی نقطۂ نظر سے جائز ثابت کرنے کیلئے اپنے نائب کو وہاں بھیجدیا ہو۔"

جس کسی نے بھی ہندوستان کی تاریخ کو ایک سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ وہ فوراً کہہ اٹھیگا کہ نرسمہا کے درباری شاعر نے صرف اپنے آقا کو خوش کرنے کیلئے اس قدر مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے مشرقی شاعر جب مبالغہ پر اتر آتے ہیں تو اسکی کوئی حد نہیں رہتی۔ یہی بات اس نظم میں بھی ہے۔ اور اسی لئے تمام مغربی اور مسلمان مورخین نے اس روایت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وجیانگر سے متصل دریائے تنگ بھدرا کے اس پار تمام ملک پر مسلمانوں کی بہمنی سلطنت تھی۔ اور مشرق میں اڑیسہ کا راجہ

گج پتی تھا۔ جو وجیانگر کا جانی دشمن تھا۔ بہمنی سلطنت سے شمال میں تمام ہندوستان پر خاندان لودھی کی حکومت تھی۔ بنگال میں پٹھان حکومت کر رہے تھے۔ بنارس مسلمانوں کے زیر فرمان تھا۔ نرسمہا بنارس تو کجا بلکہ دریائے تنگ بھدرا کو بھی کبھی عبور کر کے بہمنی حکومت پر حملہ نہیں کر سکا۔ بلکہ اس وقت جب وہ ویروپکشا کو معزول کر کے تخت نشین ہوا تو سارا مشرقی علاقہ مچھلی بندر سے لیکر جنوب میں چنگل پیٹ تک مسلمانوں کے ماتحت تھا یعنی یہاں کے مقامی راجہ اور پالیگار محمد شاہ بہمنی کو خراج دیتے رہتے تھے۔ اس لئے یہ روایت تاریخی شواہد سے بالکل معرا اور صرف شاعرانہ تعلیوں سے بھری ہوئی ہے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ نرسمہا ایک نہایت تجربہ کار اور عاقل راجہ تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی فوج پر توجہ کی۔

سیاح نیونز لکھتا ہے :-

"اس نے عرب سوداگروں سے گھوڑوں کی فرمایش کی۔ انہیں معقول معاوضہ دیا جاتا تھا۔ گھوڑے بندر گاہ عدن و ہرمزستہ لائے جاتے تھے۔ جو گھوڑے راستے میں تلف ہو جاتے تھے۔ ان کی قیمت دُم اور کھال دکھانے پر مل جاتی تھی۔ اس نے گھوڑوں کی قیمت مقرر کر دی تھی۔ تین گھوڑوں کے لیے ایک ہزار طلائی پگوڈا (ایک طلائی سکہ جس کی قیمت ۳½ روپیہ ہوتی ہے) دئے جاتے تھے"

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :-

"نرسمہا کی یہ کارروائی بہمنی سلطان کے خلاف تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسکے حریف گھوڑے خرید کر سکیں"

نرسمہا نہایت خاموشی سے فوجی تیاریوں میں مصروف رہا۔ اور اس وقت جب گلبرگہ میں محمد شاہ بہمنی کا ۱۴۸۲ء میں انتقال ہوا۔ اور محمود شاہ دوم کی تخت نشینی سے بہمنی سلطنت میں انتشار پیدا ہو گیا تو اس نے ان علاقوں پر فوج کشی کی جو اسکی گرفتاری کے عہد میں جا چکے تھے۔ بہمنی سلطنت نے اپنی اندرونی مشکلات میں مبتلا رہنے کی وجہ سے اوہر توجہ نہ کی۔ اس لئے نرسمہا نے ان مقامی راجاؤں کو (جو محمد شاہ کے عہد میں بہمنی سلطنت کے باجگذار بن گئے تھے) شکست دیکر اس تمام علاقے پر جو دریائے کرشنا سے جنوب میں چنگل پیٹ تک تھا، پھر قبضہ کر لیا“

مہاچ نیونز لکھتا ہے:-

”نرسمہا نے بسناگر کا راجہ ہو کر انصاف سے حکومت کی۔ اس نے وہ تمام علاقے واپس لے لئے جو گذشتہ عہد میں ہاتھ سے جا چکے تھے“

نرسمہا کے ذاتی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنسکرت کا عالم تھا۔ اس کے نام سے راما بھیودیم کی ایک نظم مشہور ہے۔ جو سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔ اس کے زمانے میں بہت سے تلگو زبان کے شاعر گذرے ہیں۔ ان میں پنا ویرا بھدریا نہایت مشہور ہے۔ اس کی وفات ۱۴۸۹ء میں واقع ہوئی۔

نرسمہا دوم

۱۴۸۹ء سے ۱۴۹۱ء

معاصرین:- محمد شاہ ثانی بہمنی ۱۴۸۲ء سے ۱۵۱۸ء - یوسف عادل شاہ بیجاپور ۱۴۸۹ء سے

۱۵۱۰ء - احمد نظام شاہ احمد نگر ۱۴۹۰ء سے ۱۵۱۰ء

نرسمہا اول کی وفات پر اس کا بیٹا نرسمہا دوم تخت نشین ہوا۔ نرسمہا اس وقت نہایت کم عمر تھا۔ اس لئے تمراج جس کا مشہور تاریخی نام نرسا نایک ہے۔ بطور نائب السلطنت حکمرانی کرنے لگا۔ چار سال کے بعد اس نے نرسمہا دوم کو زہر دیکر اس کے چھوٹے بھائی کو جو ابھی شیر خوار تھا۔ تخت نشین کیا۔

چنانچہ سکاٹ لکھتا ہے :-

> "ہیمراج (نرسا نایک) غاصب سلطنت تھا۔ اس نے وجیا نگر کے کمسن راجہ کو زہر دے کر اسکے شیر خوار بھائی کو تخت نشین کیا۔ رفتہ رفتہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لیکر سلطنت کا مختار کل بن گیا"

اس شیر خوار بچے کو تخت نشین کرنے کے چھ سال بعد نرسا نایک نے اس کو بھی زہر دیکر مار ڈالا۔ اور ۱۴۹۹ء میں آپ خود تخت نشین ہوا۔

نیوننز لکھتا ہے :-

> " نرسا نایک نے سازش کرکے بادشاہ کو بالکل خاموشی سے مروا ڈالا۔ اور لوگوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کہ بادشاہ کہاں ہے اور اس کا کیا ہوا ۔ جب بادشاہ لاپتہ ہوگیا تو اس نے خود تخت پر قبضہ کر لیا"

مورخین میں سے بعض پہلی روایت کو صحیح مانتے ہیں اور بعض دوسری کو۔ ہمیں یہاں اس بحث سے سروکار نہیں۔ صرف اس حقیقت کو لیا جاتا ہے کہ نرسا نایک نے سلطنت کے جائز وارث نرسمہا دوم اور اس کے کمسن بھائی کا کسی نہ کسی حیلہ سے خاتمہ کر دیا۔ اور خود تخت پر قابض ہوگیا۔

اس طرح وجیانگر میں یہ دوسرا انقلاب بغیر کسی خونریزی کے عمل میں آیا۔ اور سلطنت سلوا خاندان سے نکل کر تلوا خاندان میں آگئی۔

نرسانایک کا حال لکھنے سے پہلے تاریخی واقعات کا تسلسل قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ مسلمانوں کی بہمنی سلطنت کا حال بھی لکھ دیا جائے۔ کیونکہ نرسانایک کی تخت نشینی کے بعد یہ سلطنت اس کی حریف نہیں رہی تھی۔ بلکہ اس کے عوض دکن کی دوسری اسلامی سلطنتیں مقابلہ میں آگئی تھیں۔

محمد شاہ بہمنی دوم کی وفات پر گلبرگہ میں امیر برید سب سے زبردست شخصیت کا مالک بن گیا تھا۔ محمود شاہ بہمنی دوم صرف برائے نام بادشاہ تھا۔ امیر برید نے سیاہ وسفید کا مختار ہوکر اپنی ایک علیحدہ حکومت بریدشاہی کے نام سے بیدر میں ۱۴۸۷ء میں قایم کرلی تھی۔ اس کی اس چیرہ دستی نے دوسرے امراء کو علیحدہ کر دیا۔ اور انہوں نے بھی اپنی اپنی علیحدہ حکومتیں قایم کرلیں۔ اس طرح بہمنی سلطنت کے خاکستر پرنئی سلطنتیں قایم ہونی شروع ہوئیں۔

(۱) بیجا پور میں ترکی امیر یوسف عادل نے اپنی حکومت قایم کرکے ۱۴۹۰ء میں عادل شاہیہ خاندان کی بنیاد ڈالی۔

(۲) اسی سال احمد نگر میں احمد نظام شاہ نے نظام شاہی سلطنت قایم کی۔

(۳) برار میں فتح اللہ عماد نے عماد شاہی خاندان کی حکومت بھی اسی سال قایم کی۔

یہ تینوں سلطنتیں محمد شاہ کی وفات کے آٹھ سال بعد قایم ہوئیں۔ ان سلطنتوں کے قایم ہونے کے بعد بھی بہمنی سلطنت اور چند سال تک قایم رہی۔ لیکن اس کے سلاطین اس قدر کمزور تھے کہ امرائے حکومت جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ چند سال بعد یعنی ۱۵۱۲ء میں امیر قطب الملک نے بھی گولکنڈہ میں اپنی سلطنت قایم کرتے ہوئے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی بہمنی

سلطنت کے سلاطین گلبرگہ میں برائے نام ۱۵۲۵ء تک حکمران رہے۔ اور اس کے بعد یہ حکومت بالکل مٹ گئی۔ اور گلبرگہ پر عادل شاہیوں نے قبضہ کر لیا۔

(نوٹ :- اس کتاب میں دکن کی ان اسلامی سلطنتوں کی تاریخ سے صرف ان واقعات کو لیا گیا ہے۔ جن کا تعلق راجگان وجیانگر اور جنوبی ہند سے ہے۔ ان سلطنتوں میں صرف تین یعنے احمدنگر۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کو ہی وجیانگر یا جنوبی ہند سے تعلق رہا۔ باقی دو دوسری سلطنتوں کو کچھ تعلق نہیں تھا۔)

اگر وجیانگر کے پہلے اور دوسرے انقلاب اور اس کے ساتھ اس سلطنت کی حریف بہمنی سلطنت کے حالات کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں حریف ہندو اور مسلمان اس تمام عرصہ میں اپنے اندرونی خلفشار میں اس قدر گھرے رہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کچھ کارروائی نہیں کر سکے۔ محمد شاہ بہمنی کی وفات کے بعد اگر بہمنی سلطنت میں انتشار پیدا نہ ہوتا تو یہ یقین تھا کہ وجیانگر کے انقلابوں سے فائدہ اٹھا کر وہ جنوبی ہند پر مستقل طور پر قابض ہو جاتی۔ یا وجیانگر میں اگر انقلاب نہ ہوتا تو مسلمانوں کو اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہندو دریائے کرشنا کو عبور کر کے دکن پر قبضہ کر لیتے۔ قدرت نے دونوں حریفوں یعنے ہندو اور مسلمانوں کو ایک ساتھ کمزور کر دیا کہ اس مدت میں ایک دوسرے کے مقابل نہ ہو سکیں۔

جس طرح ہندوؤں کی وجیانگر اور مسلمانوں کی بہمنی سلطنت کے قایم ہونے سے پیشتر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بے تعلق رہے تھے۔ اسی طرح تاریخ نے اپنے آپ کو دہرا کر چالیس سال کی مہلت دونوں قوموں کو دی کہ پھر نئے سرے سے تیار ہو کر میدان میں آئیں۔

انقلاب کے بعد وجیانگر جب سنبھل گیا تو مسلمانوں کی حالت بھی دکن میں سنبھل گئی تھی۔ اور اب ان کے مد مقابل ایک بہمنی سلطنت کے عوض سرحد پر پانچ سلطنتیں قایم ہو گئی تھیں۔ یعنے بیجاپور، احمدنگر، گولکنڈہ، بیدر اور برار۔ جن میں اول الذکر تین کو وجیانگر سے بہت زیادہ

تعلق رہا ہے۔ ان اسلامی سلطنتوں کی باہمی رقابت سے ہندوؤں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس عرصہ میں مسلمانوں کی اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اوڑیسہ کے راجہ نے شمالی سرکار کے اضلاع گنجام، اسحق پٹن، گوداوری اور کرشنا جن پر مسلمانوں کا تسلط تھا۔ دوبارہ قبضہ کرلیا۔ لیکن جنوب میں گو فوراً اسی وقت تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ مگر بعد میں ہونے والے واقعات نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔

خاندان تلووا

نرسا نایک

۱۴۹۹ء سے ۱۵۰۳ء

(معاصرین:- محمود شاہ بہمنی ثانی ۱۴۸۲ء سے ۱۵۱۸ء۔ یوسف عادل شاہ بیجاپور ۱۴۸۹ء سے ۱۵۱۰ء۔ احمد نظام شاہ ۱۴۹۰ء سے ۱۵۱۸ء)

یہ خاندان تلووا کا پہلا راجہ ہے جو سلووا خاندان سے حکومت غصب کرکے تخت نشین ہوا۔ اس کے متعلق دو روایات تو پہلے نقل کی گئی ہیں۔ ایک اور روایت فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:-

"وجیانگر کی سلطنت سات سو سال سے ایک ہی خاندان میں چلی آتی تھی۔ اس کے بعد سلووا خاندان میں منتقل ہوگئی۔ اس راجہ (نرسمہا اول) کی وفات پر اس کا کم عمر لڑکا تخت نشین ہوا۔ لیکن یہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہا۔ اس کے بعد اس کا دوسرا چھوٹا بھائی راجہ بنا۔ لیکن ہیمراج نے جو عرصہ سے شاہی محل میں خاصہ

اقتدار رکھتا تھا۔ اس راجہ کی زندگی کا خاتمہ کرکے خود تخت پر قبضہ کر لیا۔"

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :-

" نرسا نایک ۱۴۹۹ء میں تخت نشین ہوا۔ اگرچہ تخت پر اس کا اقتدار ۱۴۹۰ء سے ہی مسلّم تھا۔"

نرسا کے عہد میں کسی بیرونی دشمن سے جنگ نہیں ہوی۔ اور نہ ملک کے اندر کوئی بغاوت ہوی۔ اس کے عہد کے دو تلگو شاعر مشہور ہیں۔ جن کا نام نندی ملیا اور گھنٹا سنگیہ ہے۔ لیکن اس کے عہد کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ۱۴۹۸ء میں پرتگال والے ہندوستان میں آئے۔ نرسا نایک کی وفات ۱۵۰۳ء میں ہوی۔

ویرا نرسمہا

۱۵۰۳ء تا ۱۵۰۹ء

(معاصرین :- محمود شاہ بہمنی ثانی، یوسف عادل شاہ۔ احمد نظام شاہ)

نرسا نایک کی وفات پر اس کا بیٹا جو بیلی رانی کے بطن سے تھا۔ تخت نشین ہوا۔ اس کے چھ سالہ عہد کے متعلق نیونز لکھتا ہے :-

" یہ ہمیشہ جنگوں میں مصروف رہا۔ اس کے باپ کی وفات کے بعد ملک میں ہر جگہ چھوٹے چھوٹے راجا اور سردار خود مختار ہو گئے تھے۔ ویرا نرسمہا نے ان پر فوج کشی کرکے انہیں پھر مطیع کر لیا۔"

لیکن میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :-

" کوئی علمی ثبوت یا کوئی کتبہ اب تک ایسا نہیں ملا۔ جس سے معلوم ہوتا کہ اس

کامیاب تھا۔ بلکہ اس کے عہد میں کسانوں کا حال اس قدر تباہ تھا کہ انہیں

محصولات ادا کرنے کیلئے اپنی زمینوں کو فروخت کرنا پڑتا تھا۔"

اسکی وفات سنہ ۱۵۰۹ء میں ہوئی۔ اور تخت پر اس کا بھائی کرشنا دیوا بیٹھا۔ جس کو ہندو مورخین "کرشنا دیورایا اعظم" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

کرشنا دیوارایا

سنہ ۱۵۰۹ء سنہ ۱۵۳۰ء

معاصرین :- بیجاپور۔ عادل شاہی۔ یوسف عادل سنہ ۱۵۱۰ء۔ اسمٰعیل عادل سنہ ۱۵۱۰ء سنہ ۱۵۳۴ء۔

گولکنڈہ قطب شاہی۔ سلطان قلی قطب شاہ سنہ ۱۵۱۲ء تا سنہ ۱۵۴۳ء

بیدر۔ امیر علی برید سنہ ۱۵۰۴ء۔ سنہ ۱۵۴۲ء

احمدنگر۔ احمد نظام شاہ سنہ ۱۴۹۰ء تا سنہ ۱۵۱۰ء۔ برہان نظام شاہ اول سنہ ۱۵۱۰ء تا سنہ ۱۵۵۴ء

کرشنا دیوارایا کے بچپن کے متعلق مشہور ہے کہ اس کا باپ نرسا نایک نے اپنی موت سے چند گھنٹے پہلے اپنے وزیر تمراج کو حکم دیا کہ کرشنا دیوا کی آنکھیں نکالدی جائیں۔ کہ ویرا نرسمہا جو خاص رانی کے بطن سے تھا۔ تخت نشین ہو۔ لیکن وزیر نے دوراندیشی سے کام لیکر کرشنا دیوا کو چھپا دیا۔ اور بکری کی دو آنکھیں راجہ کے حضور میں پیش کیں۔

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :-

" اگر اس حکم کی تعمیل ہو جاتی تو جنوبی ہند کی تاریخ ایک ایسے بادشاہ کے عہد سے خالی رہتی۔ جو سب سے اہم شخصیت کی مالک تھی۔"

کرشنا دیورایا سنہ ۱۴۸۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۲۳ سال

کی تھی۔ اس لئے تخت نشین ہوتے ہی اپنے بھتیجے اور تین سگے بھائیوں کو چندر گیری کے قلعہ میں قید کر دیا۔ اس کے بعد وہ ڈیڑھ سال تک گذشتہ راجگان وجیانگر کے کارناموں کے مطالعہ میں مصروف رہا۔ نیونز لکھتا ہے :-

"ان کاغذات میں اس کو نرسمہا اول کا ایک وصیت نامہ ملا جس میں تحریر تھا کہ اسکے جانشین کو چاہئے کہ قلعہ اودگیری کو اڑیسہ والوں کے قبضہ سے اور قلعہ رائچور اور مدگل کو مسلمانوں کے تصرف سے نکالکر اپنی سلطنت میں شامل کرلے۔"

تخت نشینی کے تین سال بعد اس نے میسور پر فوج کشی کرکے سیوا سمندرم اور سرنگاپٹم پر قبضہ کرلیا۔ اسی سال کے اخیر میں اودگیری پر قبضہ کرلیا گیا۔ اودگیری پر حملہ ان مسلسل جنگوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ جس نے اسے آئندہ چار سال تک اڑیسہ والوں سے لڑائیوں میں مصروف رکھا۔ ان تمام جنگوں میں یہ مظفر و منصور ہو کر نکلا۔ خلیج بنگالہ تک تمام مشرقی علاقہ اس کے قبضہ میں آگیا۔ دریائے کرشنا کو عبور کرکے اضلاع شمالی سرکار کو پائمال کرتا ہوا وہ اسحق پٹن تک پہونچ گیا۔ اس جنگ میں تلنگانہ والوں کو سخت شکست ہوئی۔ گوان کی تائید پر گولکنڈہ کے قطب شاہی مسلمان بھی تھے۔ آخر تنگ آکر پرتاب رودرا دیوا نے صلح مانگی۔ صلح ان شرائط پر ہوئی کہ پرتاب رودرا دیوا اپنی بیٹی کی شادی کرشنا دیوا سے کردے۔ اور ان تمام مقبوضات سے دست کش ہو جائے۔ جن پر اس کا قبضہ ہو چکا ہے۔

اس جنگ سے فارغ ہو کر کرشنا دیوا نے تین سال جنوب کی فتوحات میں صرف کئے۔ چدمبرم، دیلور، مدورا، ملیبار اور ٹراونکور کے راجہ جو اگلے عہدوں میں آزاد ہو چکے تھے۔ از سر نو باجگذار بنائے گئے۔ اس طرح اب وجیانگر یا کرشنا دیوا کی سلطنت جنوب میں دریائے کرشنا سے لیکر راس کماری تک اور مشرق میں خلیج بنگالہ سے لیکر بحر عرب تک مستحکم ہوگئی۔ دریائے کرشنا سے

شمال میں مشرقی ساحلی ملک اسحق پٹن تک اس کے قبضہ میں آگیا تھا۔

وجیانگر کی سلطنت اس سے پہلے کبھی اس قدر وسیع اور زبردست نہیں ہوئی تھی۔ اسوقت جب ملک کے اندرونی استحکام سے اطمینان ہوگیا تو اس نے دکن کی اسلامی سلطنتوں پر نظر ڈالی۔ مسلمان پہلے سے ایک دوسرے کے حریف تھے۔ اور مسلسل جنگوں میں مصروف تھے۔ کرشنا دیورایا نے مناسب سمجھا کہ انہیں اور کمزور بناکر ان کے ممالک پر قبضہ کرلے۔ سب سے پہلے اس نے بیجاپور پر توجہ کی۔ جس کے قبضہ میں دریائے کرشنا و تنگ بھدرا کا دوآب۔ اور رائچور و مدگل کے قلعہ تھے۔ اس کی حکمت عملی برار۔ بیدر۔ گولکنڈہ اور احمدنگر کے مسلمان حکمرانوں کو اس جنگ سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہوگئی۔

سیاح نیونز لکھتا ہے:۔

"کرشنا دیورایا نے اس قدر فریب سیاست سے کام لیا۔ کہ برار، بیدر۔ گولکنڈہ اور احمدنگر کے مسلمان سلاطین نے نہ صرف اس آنے والی جنگ سے علیحدہ رہنے کا وعدہ کیا۔ بلکہ انہوں نے بیجاپور کے خلاف کرشنا دیوا کی مدد بھی کرنی چاہی۔ ان پانچوں اسلامی حکومتوں میں بیجاپور کی سلطنت سب سے زیادہ طاقتور تھی۔ اور دوسری چار اسلامی حکومتیں یہ دیکھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔"

فروری ۱۵۲۰ء میں کرشنا دیورایا اس قدر کثیر فوج لیکر پایۂ تخت سے نکلا کہ جنوبی ہند نے اس سے پہلے اس قدر تیار فوج نہیں دیکھی تھی۔

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے:۔ (صفحہ ۱۸۲۴)

"صرف کتا نایک کے ہراولی دستہ میں تیس ہزار تیرانداز سوار اور چھ ہاتھی تھے۔ اس کے پیچھے سیوا سمندرم کے گورنر کے ماتحت پچاس ہزار پیادہ فوج۔

دو۲ ہزار سوار اور بیس۲۰ ہاتھی تھے۔ وزیراعظم کی فوج اسکے علاوہ تھی۔ اس میں ساٹھ۶۰ ہزار پیادے ساڑھے تین ہزار سوار اور تیس۳۰ ہاتھی تھے۔ سپہ سالار فوج اڑپا نایک کے ماتحت ایک لاکھ پیادہ فوج، پانچ ہزار سوار اور پچاس۵۰ ہاتھی تھے۔ اسکے بعد صوبہ دار اودگیر کی فوج تھی۔ راج کمار کی فوج میں اسّی ہزار پیادے۔ ڈھائی ہزار سوار اور چالیس ہاتھی تھے۔ یہاں تک کہ راجہ کے اس ملازم کے کمان میں جو راجہ کو پان بنا کر دیتا تھا۔ پندرہ۱۵ ہزار پیادے اور دو۲ سو سوار تھے۔ خاص راجہ کرشنا دیوا کے ماتحت چھ۶ ہزار سوار چالیس۴۰ ہزار پیادے اور تین سو ہاتھی تھے۔ راجہ کی یہ فوج ان جنگ آزما سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ جنہوں نے گذشتہ جنگوں میں ناموری حاصل کی تھی ولست میں بنکاپور وغیرہ کے سردار بھی آکر مل گئے۔

نیونز لکھتا ہے:-

"اس لشکر میں ساڑھے پانچ سو ہاتھیوں کے علاوہ صرف جنگی سپاہیوں کی تعداد سات لاکھ چھتیس۳۶ ہزار تھی۔ ان کے ساتھ پرتگالی سپاہی بھی تھے۔ جنہیں کرشنا دیورایا نے گوا سے طلب کیا تھا۔ پرتگالی فوج کی کمان فگریڈو کے ہاتھ میں تھی۔

(نوٹ:- معلوم ہوتا ہے کہ یوروپین اقوام میں سے اہل پرتگال نے سب سے اول کرشنا دیورایا کے عہد میں ہندوستانیوں کی جنگ میں حصہ لیا ہے۔)

دیورایا کے کیمپ کے متعلق یہی سیاح لکھتا ہے:-

"میں یہاں ان دھوبیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ جو اس کیمپ میں بے شمار تھے۔ اور نہ میں ان ناچنے والیوں کا ذکر کرونگا۔ جو بیس ہزار کی تعداد میں

سپاہیوں کا دل لبھانے کیلئے موجود تھیں۔ اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کیمپ میں بار برداری کا کس قدر سامان ہوگا۔ کیمپ کے آگے آگے دس سے بارہ ہزار بہشتی گذرنے والی فوج کو پانی پلانے کیلئے راستہ میں کھڑے رہتے تھے۔ اور اسی قدر بہشتی کیمپ میں موجود تھے۔ اس تمام مجمع سے آگے آگے کوئی تین چار فرسنگ کے فاصلہ پر پچاس ہزار سپاہی بطور ہراول دستہ کے دشمن کی جستجو پر مامور تھے۔ ان کے دونوں بازوؤں پر دو ہزار سوار تھے۔ جو تیر و کمان لئے ہوئے انکی حفاظت کرتے تھے کیمپ میں ہر قسم کا سامان فروخت ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ہیرے جواہر بھی ملتے تھے۔"

مورخ بھٹاچاری لکھتا ہے :-

"کہ یہ جنگی کیمپ نہیں تھا۔ بلکہ ایک نہایت عالیشان شہر معلوم ہوتا ہے۔ جس میں ہر قسم کی ضروریات ملتی تھیں۔ یہاں تک کہ تفریح کے لئے بیس ہزار رقاصہ عورتیں بھی تھیں۔"

مورخ ہیگ لکھتا ہے :-

"یہ فوج وجیانگر سے نکل کر تین ماہ کے سفر کے بعد راپچور کے قریب مل آباد میں ٹھہری۔ جب یہاں تمام جنگی انتظامات مکمل ہوگئے۔ تو رائچور کا محاصرہ کر لیا گیا۔"

قلعہ کی محصور اسلامی فوج کے پاس ڈیڑھ سو بھاری توپیں تھیں۔ اور اس فوج نے تین ماہ تک نہایت کامیابی سے مدافعت کی۔ تیسرے ماہ کے اخیر میں معلوم ہوا کہ اسمٰعیل عادل شاہ والی بیجاپور مدد کیلئے آرہا ہے۔ اسمٰعیل عادل کے ماتحت ایک لاکھ بیس ہزار پیادے

اٹھارہ ہزار سوار اور ایک سو پچاس ہاتھی تھے۔ بیجاپور کی فوج دریائے کرشنا کے شمالی ساحل پر آکر ٹھہری۔

مورخ ہیگ لکھتا ہے :۔

"ہندوؤں کی اس قدر کثیر فوج دیکھ کر اسماعیل عادل نے واپس ہونا چاہا۔ کہ کسی دوسرے بہترین موقع پر ان سے لڑے۔ لیکن اس کے سرداروں نے کہا کہ اس قدر فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک مسلمان بادشاہ کے یہ شایانِ شان نہیں کہ بغیر مقابلہ کئے واپس چلے جائے۔ لیکن اسمٰعیل آمادہ نہیں ہوا۔ مگر اتفاق سے ایک شام کو جب وہ شراب کے نشہ میں مخمور تھا۔ تو ہاتھی پر سوار ہو کر ہندو فوج کی طرف چل دیا۔ یہ دیکھکر کوئی دو ہزار مسلمان سپاہی بادشاہ کے ساتھ ہو گئے۔ ابھی یہ مشکل سے دریا کے پار ہوئے تھے۔ کہ ہندوؤں کے تیس ہزار سوار اور دو لاکھ پیادہ فوج نے جو دریا کی حفاظت پر متعین تھی۔ ان پر حملہ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان یا تو سب کے سب مارے گئے۔ یا جو واپس پلٹے دریا میں غرق ہو گئے۔ اسمٰعیل عادل بڑی مشکل سے واپس ہوا۔ اور اس وقت اس کے ساتھ جب وہ اپنی کیمپ میں پہونچا تو صرف سات سوار باقی تھے۔"

اسماعیل نے یہاں اپنے امراء سے مشاورت کی۔ اسد خاں لاری نے کہا کہ بیجاپور واپس ہو کر برہان نظام شاہ والیٔ احمد نگر سے اتحاد کر لیا جائے۔ اور اس کے بعد اپنے اصلی دشمن امیر برید سے بدلہ لیا جائے۔ جس نے ہندوؤں کو اس جنگ پر آمادہ کیا ہے۔ اسماعیل نے اس وقت قسم کھائی کہ جب تک رائچور اور مدگل واپس نہ ملے۔ شراب کو ہاتھ نہیں لگائیگا۔

نیونز اس جنگ کے متعلق لکھتا ہے :۔

"دیورایا کی اس قدر کثیر فوج دیکھ کر اسماعیل عادل نے پہلے پہل دریا کو عبور کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ لیکن بعد میں چند جنگجو سرداروں کی تجویز پر دریا کو عبور کرکے ساحل پر خیمہ زن ہوا۔ اسماعیل کی آمد کی خبر سنکر دیورایا نے اپنی فوج کو سات حصوں میں تقسیم کرکے ہفتہ کے دن مسلمانوں پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں دیورایا نے اپنی جنگی قابلیت کا اظہار نہایت ناک طور پر کیا۔ یہاں تک کہ مسلمان قریب قریب سب ہی مارے گئے۔ یہ حالت دیکھکر اسد خاں نے بادشاہ سے کہا کہ اگر جان عزیز ہے تو میرے پیچھے پیچھے چلے آئیے۔ چنانچہ بادشاہ کو بیکروہ نہایت مشکل سے دریا کے پار پہونچا۔"

اسلامی کیمپ کو لوٹ لیا گیا۔ دیورایا کو علاوہ باربرداری اور دوسرے جنگی سامان کے چار ہزار عربی گھوڑے سو ہاتھی اور چار سو بھاری توپیں اور نو سو گاڑیاں ملیں۔ میدان جنگ میں جب مسلمان مقتولوں کو دیکھا گیا تو ان میں مسلمانوں کے کئی ایک نامی سرداروں کی لاشیں تھیں۔ اسیران جنگ میں پانچ سردار بھی تھے۔ جن میں ایک صلابت خاں نامی سردار بھی تھا۔ جو زخموں سے بالکل چور چور تھا۔"

صلابت خاں کے متعلق نیونز کے حوالے سے سیول اپنی تاریخ فرگاٹن ایمپائر کے صفحہ ۳۴۲ پر لکھتا ہے:-

"صلابت خاں اسمٰعیل عادل کا سپہ سالار تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اسلامی فوج شکست کھاکر پیچھے ہٹ رہی ہے۔ تو اپنے پانچ سو پرتگالی جوانوں کو لیکر اس کو روکنا چاہا۔ لیکن ہندوؤں کا حملہ اس قدر زبردست تھا کہ صلابت خاں کی کچھ پیش نہیں گئی۔

یہ دیکھ کر صلابت خان نے موت کو شکست پر ترجیح دیتے ہوئے اپنے پانچ سو پرتگالی سواروں کو لے کر اس بہادری سے ہندوؤں پر حملہ کیا کہ جدھر نظر اٹھتی تھی۔ ادھر صلابت خاں ہی نظر آتا تھا۔ صلابت خان بڑھتے بڑھتے دیو رایا کے خاص محافظ دستہ تک پہونچ گیا۔ یہاں صلابت خان کا گھوڑا مارا گیا۔ پرتگال والوں نے یہ دیکھ کر اس قدر کثیر تعداد میں ہندوؤں کا قتل کر کے اسکے پاس پہونچے کہ ہندو فوج کے درمیان ایک راستہ بن گیا تھا۔ یہاں انہوں نے ایک دوسرا گھوڑا صلابت خان کو فراہم کیا۔ صلابت خان یہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ بھیڑوں کے گلہ میں کوئی شیر آ گیا ہے۔ پرتگالی سپاہی، اور صلابت خاں دیر وقت تک لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ تمام پرتگالی مارے گئے اور صلابت خاں زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرا۔ اور ہندوؤں کے ہاتھ میں اسیر ہو گیا۔"

(نوٹ :- معلوم ہوتا ہے کہ پرتگالی بھاڑے کے ٹٹو تھے۔ جو دونوں حریفوں کو مدد دے رہے تھے۔ اس قسم کی کرایہ کی فوج کو انگریزی میں مرسینری سولجرس (Mercinary Soldiers) کہا جاتا ہے کرایہ کے سپاہی یورپ میں رواجاً ہوتے تھے۔ اہل پرتگال نے سرزمین ہند پر بھی یہی رواج شروع کر دیا)

جنگ کا نتیجہ فیصلہ کن نکلا۔ اس جنگ کے بعد ہندوؤں نے رائچور کا اور سختی سے محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں نے بھی امکان بھر کوشش کی۔ لیکن سپہ سالار کے مارے جانے پر انہوں نے ہندوؤں کو قلعہ سپرد کر دیا۔ اس کے بعد مدگل کا قلعہ بھی ہندوؤں کے ہاتھ میں آ گیا۔ رائچور اور مدگل کے قلعوں کو فتح کرنے میں پرتگالی فوج اور ان کے سردار فاریڈو نے بہت کارہائے نمایاں دکھائے۔

اس فتح سے ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور انہوں نے کرشنا دیوا کو صلاح دی۔ کہ مسلمانوں کا تعاقب کرتے ہوئے بیجاپور پر چڑھائی کرے۔ لیکن کرشنا دیوا نے دریائے کرشنا کو عبور کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ اس جنگ کے فیصلہ کے ساتھ دوآبہ رائچور کی قسمت کا فیصلہ بھی دس سال کے لئے ہو گیا۔ یعنے مسلمان دس سال تک پھر ادھر کا رخ نہیں کر سکے۔

کرشنا دیوا نے اس جنگ سے چند سال پیشتر اپنی ایک معشوقہ ناگلا کے نام پر ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی تھی۔ رائچور اور مدگل کی فتح کے بعد کرشنا دیوا اس نئے شہر میں پہونچا۔ یہاں اسمٰعیل عادل کے سفیر نے آکر باریابی چاہی۔ دیورایا نے ایک مہینے بعد اس کو باریابی بخشی۔ سفیر نے اپنے سلطان کی جانب سے کہا کہ "دونوں سلطنتوں کے درمیان جو اتحاد عرصۂ دراز سے چلا آتا تھا۔ اس کو دیورایا نے توڑتے ہوئے بے وجہ بیجاپور کے علاقوں پر حملہ کرکے انہیں اجاڑ دیا ہے۔"

اسماعیل نے اپنے سفیر کے ذریعہ یہ بھی درخواست کی تھی کہ "مفتوحہ علاقہ اور تمام مال غنیمت واپس کر دیا جائے۔" دیورایا نے جواب دیا "اسمٰعیل کے تمام مطالبات کو وہ منظور کرنے کے لئے تیار ہے۔ بشرطیکہ اسماعیل آکر اس کے پاؤں چومے۔" سفیر یہ سن کر پلٹ گیا۔ اسمٰعیل عادل نے اس کا نہایت سختی سے جواب دیا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ "تلوار اس کا فیصلہ کریگی۔" لیکن ہندو مورخ لکھتے ہیں کہ "اسماعیل عادل نے دوبارہ سفیر سے کہلا بھیجا کہ وہ دیورایا کے پاؤں چومنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن وہ کس منہ سے پھر اپنے پایۂ تخت کو جاکر اپنی فوج اور رعایا کو منہ دکھا سکتا ہے۔"؟

(نوٹ:۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اسماعیل عادل ہزیمت خوردہ تھا۔ اور اس نے اپنے علاقہ کی واپسی کی درخواست بھی کی تھی۔ لیکن یہ بات کہ وہ کرشنا دیورایا کے پاؤں چومنے کیلئے آمادگی ظاہر کی۔ ایک مسلمان کی اسلامی

غیرت کے منافی ہے۔ اسماعیل کی غیرت کا ثبوت نیو نز اور دوسرے مورخین کی تحریروں سے ملتا ہے۔ اس نے رائچور اور مدگل واپس لینے کے لئے قسم کھائی تھی کہ وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائیگا۔ ایک شخص جس نے یہ عہد کیا اور نباہا ہو۔ وہ اس قدر بے غیرت نہیں ہوسکتا۔ اسماعیل کی بہادری کا ثبوت گذشتہ جنگ میں مل چکا ہے۔ کہ کس طرح اس نے مٹھی بھر سپاہ کے ساتھ دریائے کرشنا کو عبور کرکے کرشنا دیورایا کی ٹڈی دل فوج پر حملہ کیا تھا۔ ایک ایسے غیور اور جوانمرد بادشاہ کو یہ الزام دینا کہ وہ دیورایا کے پاؤں چومنے پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ یہ ہندو مورخین کے تعصب کا بین ثبوت ہے۔)

یہ جواب سن کر دیورایا بیجاپور پر بڑھا۔ شہر کا محاصرہ کرلیا گیا۔ کرشنا دیورایا اس وقت تُلا بیٹھا تھا کہ اسماعیل کو پکڑ کر یا تو قتل کر دے یا اسیر کرلے۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسمٰعیل نے کوئی ترحم آمیز درخواست نہیں کی تھی بلکہ سختی سے مطالبہ کیا تھا) لیکن اسمٰعیل بیجاپور خالی کرکے نکل چکا تھا۔ ہندوؤں نے بیجاپور کو تباہ کر دیا۔ ہیزم کے لئے عمارتوں کو ڈھا دیا گیا۔ مساجد کی بے حرمتی کی گئی۔ ان میں سوّر کاٹے گئے۔ منبروں کو توڑ کر رکھ دیا گیا۔ قرآنِ مجید کے نسخے جلا دئے گئے۔ اور پردہ نشیں عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ بیجاپور جب تباہ ہوگیا اور پانی کی قلت ہونے لگی تو ہندو فوج یہاں سے مدگل کو پلٹ گئی۔ میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۱۸۵ پر لکھتا ہے:۔

"(ہندو) فوج نے عملی طرز پر کل شہر (بیجاپور) کو تباہ کر دیا اور ہیزم کے لئے جس کا ملنا مشکل تھا۔ تمام گھروں کو ڈھا دیا گیا۔ صرف ایک ہی عمارت محفوظ رہی۔ جو اسماعیل عادل کا محل تھا۔ جس میں کرشنا دیورایا خود اقامت گزین تھا۔"

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہندو فوج نے بیجاپور پر کس قسم کی تباہی لائی تھی۔ ہندو فوج کے واپس جانے کے بعد اسماعیل عادل نے واپس آکر بیجاپور پر پھر قبضہ کر لیا۔

یہاں پھر اس نے اپنے ایک سردار اسد خاں کو سفیر بنا کر بھیجا۔ اسد خاں کو معلوم تھا کہ صلابت خان کرشنا دیورایا کی قید میں ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صلابت خاں زندہ رہے۔ اس لئے کہ صلابت خاں اسمٰعیل عادل کا منظور نظر ہے۔ اس کی زندگی میں اسد خاں کو کامیابی مشکل تھی۔ اس نے دیورایا سے کہا کہ "علی عادل تمام شرائط قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن صلابت خان نے ایک خفیہ خط لکھکر روک رکھا ہے"۔ یہ سن کر دیورایا نے صلابت خان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اسد خاں نے دیورایا سے کہا کہ "اسمٰعیل عادل اور اس کی والدہ ملکہ جہاں سرحد پر دیورایا سے ملاقات کریں گے"۔ یہ کہہ کر اسد خاں واپس ہوا۔ لیکن اس ڈر سے کہ کہیں اصل حال معلوم ہونے پر اسمٰعیل اس کو قتل نہ کر دے۔ یہ بیگام کی طرف چلا گیا لیکن جاتے ہوئے اسمٰعیل کو پیغام بھیجا کہ وہ دیورایا کا اعتبار نہ کرے۔

جب وقت مقررہ پر علی عادل اور ملکہ جہاں سرحد پر نہ پہونچے تو دیورایا کے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس نے پھر مملکت بیجاپور پر چڑھائی کی۔ اور اس وقت اس کی فتوحات کا دائرہ گلبرگہ تک پہونچ گیا۔ یہاں عادل خاں سپہ سالار تھا۔ اس نے سختی سے مدافعت کی۔ لیکن جنگ میں مارا گیا۔

ایک ہندو مورخ لکھتا ہے :-

" دیورایانے گلبرگہ میں ایک بہمنی شہزادے کو جو قید میں تھا۔ رہا کرکے تخت نشین کیا"۔

لیکن دوسرے مورخین لکھتے ہیں :-

" گلبرگہ میں گجری کلیان راؤ کو گورنر مقرر کیا گیا"۔

تاریخ اموکٹا ملیاڈا میں تفصیل سے یہ بیان آیا ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ

ہندوؤں نے راستہ بھر تمام مقامات کو اجاڑ دیا۔ مساجد اور دوسرے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی۔

دیورایا اس طرح مظفر و منصور ہو کر گلبرگہ سے اپنے پائے تخت کو نہایت شان و شوکت سے واپس ہوا۔

اس جنگ سے واپسی کے بعد کرشنا دیورایا نے بیجاپور پر چڑھائی کر کے سامری کو، جو باغی ہو گیا تھا مطیع کر لیا۔ یہاں سے اس کی فوج جزیرۂ سیلون پر بڑھی اور یہاں کے راجہ نے خراج دینا منظور کر لیا۔

وجیانگر کا یہ انتہائی عروج تھا اور یہی عروج اس کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ سیول اپنی تاریخ "فرگاٹن ایمپائر" کے صفحہ ۱۵۵۔ ۱۵۶ پر لکھتا ہے:۔

"یہ سچ ہے کہ ان فتوحات کا اثر اسماعیل عادل شاہ والئ بیجاپور پر نہایت برا پڑا اس کی طاقت اور اس کے گھمنڈ کو اس قدر صدمہ پہونچا کہ وہ اب اپنے ہمسایہ مسلمان سلطنتوں سے دوستی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ دوسری طرف ان فتوحات کا اثر یہ ہوا کہ وجیانگر کے راجاؤں میں ایک نیا گھمنڈ اور فخر پیدا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی ہمسایہ طاقتوں کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے غرور نے ان کے ہمسایوں کو ان کا دشمن بنا دیا"

کرشنا دیورایا کے عہد میں باربوسا، پیئز، نیونز وغیرہ سیاح وجیانگر میں آئے تھے اور انہوں نے اس سلطنت کا ذکر اپنے سفرناموں میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔

کرشنا دیورایا نے اپنے عہد میں بہت سے مندر تعمیر کئے۔ ان میں سب سے مشہور "فتح گھر" ہے جس کی تعریف فرگوسن نے اپنی کتاب "دھارواڑ و میسور میں فن تعمیر" میں کیا ہے۔ اور اس

نے اس تعمیر کو قدیم نینوا کی تعمیرات سے تشبیہ دی ہے۔ وٹھل سامی کا مندر بھی جسکی خوبصورتی کی تعریف مسٹر ری نے کی ہے۔ اسی راجہ کی تعمیرات میں سے ہے۔

اس زمانے میں رفاہ عام کے بہت سے کام ہوئے سنہ ۱۵۲۱ء میں اس نے کوریگال کے پاس دریا پر بند تعمیر کیا۔ اور نہر سونا اسی کی نکالی ہوئی تھی۔ جو ضلع بلاری کو سیراب کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک پرتگالی انجینئر ڈی لا پانٹے کی مدد سے اس نے شہر وجیانگر میں ایک بہت بڑا تالاب بھی بنوایا۔

نیونز لکھتا ہے کہ کرشنا دیورایا نے بہت سی شادیاں کیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ اس کی محبوب ناگلا دیوی تھی۔ جس کے نام پر اس نے شہر ناگلا پور (موجودہ ہوس پیٹ) بسایا۔ اس شہر کی تعریف میں نیونز لکھتا ہے:-

"راجہ نے یہ شہر اس عورت کے نام پر آباد کیا جو اس کو سب سے زیادہ محبوب تھی۔ شہر کے اطراف ایک نہایت خوشنما دیوار تعمیر کی گئی۔ شہر کے اندر سب سے بڑی گلی کے دونوں طرف خوشنما سنگین عمارتیں تھیں۔ اس کی وسعت چالیس قدم کی تھی۔ کرشنا دیورایا نے اپنے امیروں کو یہاں محلات بنانے کا حکم دیا۔ جس کی انہوں نے تعمیل کی۔ اس شہر کی تجارت سے سرکار کو بیالیس ہزار پگوڈا کی آمدنی ہو رہی ہے۔ اس شہر کے علاوہ ضلع تناولی میں بھی اس نے اپنے نام پر ایک شہر تعمیر کیا۔ جس کا نام "کرشنا رایا سمندرم" ہے۔"

کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ کرشنا دیوا نے ملک کے طول و عرض میں بہت سے مندروں کو معقول جاگیریں دیں۔

سیول اپنی کتاب "فرگاٹن ایمپائر" میں نیونز کے حوالے سے لکھتا ہے:-

" ۱۵۲۵ء یا ۱۵۲۶ء میں دیورایا کو معلوم ہوا کہ اسماعیل عادل شاہ والی بیجاپور پھر ایک دفعہ رائچور لینے کی تجویز کر رہا ہے۔ دیورایا اس خبر کے سنتے ہی ایک بڑی فوج لیکر رائچور کی طرف گیا۔ اور اسماعیل کو لکھا کہ "اسماعیل نے دو دفعہ بذات خاص حاضر ہو کر اطاعت کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ابھی تک ایفا نہیں ہوا ہے۔"

اس خط میں اس نے لکھا کہ "وہ عنقریب پھر بیجاپور کی مملکت پر حملہ کریگا"

معلوم نہیں کہ اسماعیل نے اس خط کا کیا جواب دیا۔ لیکن دیورایا بارش کا موسم شروع ہو جانے کی وجہ سے پائے تخت کو واپس چلا گیا۔ اور یہاں جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ ابھی یہ تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ دیورایا بیمار ہو کر ۱۵۳۰ء میں فوت ہو گیا۔"

دیورایا کے عہد میں ملک کی حالت کے بارے میں سیاح پئس لکھتا ہے :-

" تمام ملک میں بالکل امن وامان تھا۔ زمین نہایت سرسبز و شاداب تھی۔ اور ہر جگہ تالاب بھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ محصولات سے جملہ آمدنی ۱۲۰ لاکھ پگوڈا ہوتی تھی۔ جس میں نصف راجہ کو دیا جاتا تھا۔ اور باقی نصف فوج پر خرچ ہوتا تھا۔"

نیونز لکھتا ہے :-

" کاشتکاروں کی حالت بالکل تباہ تھی۔ کیونکہ ان پر مالگذاری کا نرخ بہت زیادہ لگا ہوا تھا۔"

تمام ملک کئی حصوں میں منقسم تھا۔ اور ہر حصہ میں ایک گورنر رہتا تھا۔ وجیانگر کے خراج گذار راجاؤں میں مشہور یہ تھے۔ بنکاپور، گرسپا، برکلور، کلیکٹ اور بھٹکل۔ گورنری کے عہدوں پر زیادہ تر برہمن فائز تھے۔ یہ گورنر فیڈرل (وفاقی) طریق پر راجہ کے ماتحت ہوتے تھے۔

اوران میں سے ہر ایک اپنی ایک خاص فوج رکھتا تھا۔ ہر گورنر کا ایک نمائندہ پایۂ تخت میں رہکر ایک روزانہ رپورٹ دیتا تھا۔ دسہرہ نہایت شان وشوکت سے منایا جاتا تھا۔ جس کی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی۔ (نوٹ۔ اس کی تقلید میں میسور میں اب بھی دسہرہ نہایت شان سے منایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ راجگان میسور وجیانگر کے بعد اپنے آپ کو ان کا وارث سمجھتے ہیں۔)

ملک کے مغربی حصے میں سات بڑی بندرگاہیں تھے۔ جن سے مال تجارت کی درآمد ہوتی تھی۔ ان میں بھٹکل سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ مشرقی ساحل پر کائل اور دیوی پٹم تھے

دیورایا کے زمانے میں تعزیرات جرائم کے متعلق نیوننز لکھتا ہے :۔

"چوری کا ثبوت ملتے ہی چور کے ہاتھ اور پاؤں اسی وقت کاٹ دیئے جاتے تھے اگر چوری بڑی ہوتی تو چور کو سولی دیدی جاتی تھی۔ امراء جو باغی ہوجاتے تھے۔ تو ان کے پیٹ میں لکڑی گھسیڑ کر مار دیا جاتا تھا۔ عام لوگوں کو معمولی خطاؤں پر یہی سزا دی جاتی تھی۔ ان کے سر کاٹ کر بازار میں لٹکائے جاتے تھے۔ بادشاہ کا حکم ہر شخص کو بے چون وچرا ماننا پڑتا تھا۔ اکثر ڈیول (مبارزت) لڑے جاتے تھے۔ جن میں جیتنے والا ہارنے والے کی تمام املاک پر قابض ہوجاتا تھا بعض اوقات بادشاہ لوگوں کو ہاتھیوں کے آگے بھی ڈال دیتا تھا کہ وہ انہیں پھاڑ دیں۔ برہمن بھاری سزاؤں سے بالکل معاف تھے۔ اور انہیں جرم کی پاداش میں زیادہ سے زیادہ صرف اندھا کر دیا جاتا تھا"

بادشاہ کو شکار کا شوق بھی تھا۔ اکثر سؤر کا شکار ہوتا تھا۔ اور کتے استعمال کئے جاتے تھے۔

دیورا یا خود بھی عالم و شاعر تھا۔ اور اس کے زمانے میں بہت سے مصنف اور شعرا گذرے ہیں۔ جو اس کو اس زمانے کا راجہ بھوج سے تشبیہ دیتے ہیں کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانے کا سب سے بڑا شاعر السانی پیدا تھا۔

کرشنا دیورایا سے کتاب راج نیتی منسوب کی جاتی ہے کہ یہی راجہ اس کا مصنف ہے۔ یہ کتاب نظم میں ہے۔ اور دراصل ہدایت نامہ راجگان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ کتاب اپنے ولی عہد کے لئے لکھی تھی۔ اس نظم کا خلاصہ یہاں دیا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں ہندوؤں کے خیالات کیا تھے۔ اور ملکی سیاست کیا تھی۔

(۱) دن اور رات محنت کئے جاؤ۔ جو فریادی تمہارے پاس فریاد لائے اسکی داد رسی کرو۔

(۲) رعایا سے اس طرح سلوک کرو کہ وہ تمہارے لئے دعا کریں۔ یہ مت کہو کہ ان کی دعا کس کام کی ہے۔

(۳) قلعوں کی کمان صرف عمدہ تربیت یافتہ برہمنوں کے قبضہ میں رکھی جائے۔ یہی لوگ قلعوں کی محافظت کر سکتے ہیں۔

(۴) کسی شخص کو بڑا رتبہ دیکر بعد میں اس کے رتبہ کو نہ گھٹاؤ۔ اس سے اس کے دل میں نفرت پیدا ہوگی۔ اس لئے رتبہ بتدریج بڑھاؤ۔

(۵) کسی برہمن کو ان عہدوں پر مقرر نہ کرو۔ جن کی وجہ سے انہیں اچھوت ذاتوں میں رہنا سہنا پڑے۔ اور انہیں ایسے عہدے بھی نہ دئے جائیں۔ جن کی وجہ سے انہیں دغابازوں اور جھوٹوں اور بدنام لوگوں سے سابقہ پڑے۔ غیر ملکوں میں جہاں کے باشندوں میں نیکی کا عنصر نہیں ہے۔ برہمنوں کو نہ بھیجا جائے۔ اور ایسے عہدے برہمنوں کو نہ دئے جائیں جو کمتر درجے میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۶) جو برہمن اپنے اصلی صفات سے معرا ہو گیا ہو۔ اس کو ملازمت مت دو۔

(۷) ایک تعلیم یافتہ برہمن کو خاص اپنی درخواست سے ملازمت دینے سے سلطنت کے سات بازو قوی ہوتے ہیں اس کو سیاست اور فلسفہ میں ماہر ہونا چاہئے۔ اور اس کی عمر ۵۰ اور ۷۰ سال کے درمیان ہو۔ اس کو [illegible] اور جسمانی مرض نہ ہو۔ اور جس کے خاندان نے اسی راجہ کے خاندان میں پہلے ملازمت کی ہو۔

(۸) ایک بادشاہ جو نالائق وزیر کے ماتحت ہو۔ ایسا ہے کہ جیسا ایک شخص جس کے پاس جواہرات ہیں۔ لیکن وہ انہیں استعمال نہیں کرسکتا۔

(۹) ایک شخص کو ایک بڑا کام دینے سے بہتر ہے کہ اس کو بہت سے شخصوں پر تقسیم کردیا جائے کہ جلد ختم ہو۔

(۱۰) دولت ہی راجہ کیلئے سب کچھ مہیا نہیں کرسکتی۔ اس کیلئے بہترین دوست اور مشیر بھی ہونا ضروری ہیں۔

(۱۱) ایک بھرا ہوا خزانہ اور فوج بادشاہ کو کچھ کام نہیں آسکتے۔ جب تک اس کی ملازمت میں اچھے اور بااعتبار آدمی نہ ہوں۔

(۱۲) اگرچہ بادشاہ کیلئے چھوٹی اور بڑی ذاتوں کی دوستی کی ضرورت ہے۔ لیکن ایک برہمن ہی ہے جو اسکے اڑے وقت کام آسکتا ہے۔

(۱۳) خیراتی کاموں کیلئے یعنے مندروں کی املاک کے محاصل وصول کرنے کیلئے برہمن کو مقرر نہ کرو۔

(۱۴) بادشاہ کو ایک کسان کی مثال اختیار کرنی چاہئے۔ جو زمین کی پہلے حد بندی کر لیتا ہے۔ اور بعد میں گھانس پھوس جو زراعت کے دشمن ہیں۔ دور کرتا

ہے۔اس لئے پہلے زمین کو قبضہ میں لاکر بعد دشمنوں کو بھگانا چاہئے۔

(۱۵) سرحد پر جو قدیم قومیں ہیں۔ان سے تعرض نہ کرو۔

(۱۶) پروکا لوگوں سے جو سبب جنگلوں میں ہیں۔ تعـــرض نہ کرو۔ بلکہ ان کی حد بندی کرو کہ شہروں میں آنہ سکیں (پروکا ایک جنگلی قوم ہے)

(۱۷) اگر سرحد پر بہت قدیم قوم کے لوگ ہیں۔ تو ان سے نقصانات پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

(۱۸) قدیم قوم کے لوگوں میں کوئی تمہارا مہمان ہو اور اس سے کوئی تقصیر ہوجائے تو نظر انداز کردو۔

(۱۹) اگر تم بازپرس کروگے تو وہ اپنی خطا کو نہیں دیکھے گا۔ بلکہ تمہارا دشمن ہو جائیگا۔

(۲۰) دوسرے بادشاہوں پر غلبہ پانے کیلئے ضروری ہے کہ ان کے سفراء کو خوب انعامات دو۔

(۲۱) گھوڑوں اور ہاتھیوں کی نگہبانی پر امراء کو مت مقرر کرو۔ وہ انہیں ذریعہ تفریح بنالیں گے۔

(۲۲) ایک مجلس میں ایک بڑی شخصیت جب کچھ بیان کرتی ہے۔ تو یہ لازمی بات ہے کہ حسد کرنے والے پہلے اس کی بات پر یقین نہیں کرتے۔

(۲۳) وزراء میں جب شرارت پائی جائے۔ اور انکی وجہ سے سلطنت کے کاموں میں خلل نظر آتا ہو۔ تو ایک نئے طاقتور وزیر کو مقرر کرو۔

(۲۴) خزانہ بھرا و پُر رکھو اور فوج کو اپنا طرفدار بنائے رکھو کہ وزراء کی

شرارت چل نہ سکے۔

(۲۵) اگر غذا میں ایک دانہ بھی کم ہو جائے تو یاد رکھو کھانے والا تم کو برا کہیگا۔

(۲۶) اگر کسی شخص سے برا کام ہوا اور اس سے چشم پوشی کی گئی تو یاد رکھو کہ برے کاموں کی کثرت ہو جائیگی۔

(۲۷) دشمن پر قابو پا کر پھر اس کو معاف کر دو گے تو تمہارا نام خوب چمکیگا۔

(۲۸) آمدنی بڑھانے کیلئے ضروری ہے کہ زمین بڑھائی جائے۔ اگر زمین کا رقبہ بڑھایا نہیں جا سکتا تو موجودہ زمین کو ہی تالابوں اور نہروں کے ذریعہ زیادہ زرخیز بنانے کی کوشش کرو۔

(۲۹) اس بادشاہ کو ترقی نہیں ہو سکتی جس کے عہدہ دار تو ہوں۔ لیکن رعایا ملک چھوڑ کر جلا وطن ہو رہی ہے۔

(۳۰) ایک بادشاہ کو اپنی آمدنی چار حصوں میں تقسیم کرکے اس طرح استعمال کرنا چاہئے:۔

"ایک حصہ۔ اپنے خاص اخراجات اور تحفے تحائف دینے کے لئے

دو حصے۔ فوجی ضروریات پر

چوتھا حصہ۔ خزانہ کی بھرتی پر۔ کہ دشمن ڈرتے رہیں۔

(۳۱) اگر بادشاہ کی پولس اصلی مجرم کے عوض دوسرے کو گرفتار کرے تو اس کا الزام بادشاہ پر ہے۔

(۳۲) بادشاہ کو چاہئے کہ تین چوتھائی معاملہ کو خود اپنی فراست سے پہچانے۔ چوتھا حصہ اسکے دوست اگر سچے ہیں تو اس سے بیان کریں گے۔ جو بادشاہ ایسا

کرتا ہے۔ وہ بے گناہوں کو سزا نہیں دیتا ۔ اس سے سلطنت کو استحکام ہوتا ہے۔

(۴۳) ایک بادشاہ کو عیش و راحت میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھنا چاہئے۔ جس طرح بگلہ درخت پر سوتے وقت اپنی ایک آنکھ کھلی رکھتا ہے۔

(۴۴) سنیاسی اور جٹادھاری فقیروں کو نقد انعامات اور زمینیں مت دو۔ اس سے ان کے اعتقادات متزلزل ہوجاتے ہیں۔ جب اعتقادات متزلزل ہوجاتے ہیں کہ ملک میں قحط، وبائیں اور شیر خواروں کی اموات شروع ہوجاتی ہیں۔

(۴۵) سلطنت کے مجرموں سے کوئی رعایت نہ کرو۔

(۴۶) گو بادشاہ بذات خود کتنا ہی جوانمرد کیوں نہ ہو۔ اس کو دوسرے جوانمردوں کی بات بھی سننی چاہئے۔

(۴۷) ایک بادشاہ کو اس طرح حکومت کرنی چاہئے کہ اس کی بندرگاہوں میں تجارت کی ترقی ہو۔ گھوڑے، ہاتھی، قیمتی جواہرات، خوشبو، صندل اور موتی وغیرہ ہمیشہ ان مقامات پر فروخت ہوتے رہیں۔ بادشاہ کو ان تاجروں کی ذات پات اور اعتقادات کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

(۴۸) جب تک موقع نہ آئے اسوقت تک ایک مجرم کے سامنے اپنا غصہ ظاہر نہ کرو۔

(۴۹) ایک بدترین دشمن کے آگے بادشاہ کو اپنی فوجیں لیکر آہستہ بڑھنا چاہئے اور جب موقع ملے تو بجلی کی تیزی سے حملہ کرنا چاہئے۔

(۵۰) جب یہ معلوم ہو کہ حریف کے عہدہ دار اس سے بدگمان ہیں۔ تو ان کو اپنی طرف ملانے کی کوشش کرو۔ اور جہاں تک ہوسکے ان میں پھوٹ ڈالو۔

(۴۱) اگر تمہاری رعایا کی بزدلی کی وجہ سے تخت سے دست برداری کی ضرورت ہو تو آدھا ملک دشمن بادشاہ کے حوالے کرکے اپنا تخت بچا لو۔

(۴۲) ہزار الفاظ کہنے سے بہتر ہے کہ دشمن کو تباہ کرکے ملک میں آزادی سے چلو پھرو

(۴۳) دشمن پر قابو پانے کے لئے سختی سے کام لو۔ اگر کام نہ نکلے تو فریب سے کام لو

(۴۴) ایک بادشاہ میں یہ عادتیں نہیں ہونی چاہئیں:۔

(۱) مجرموں کو بغیر تحقیق سزا دینا

(۲) قلعوں کی دیکھ بھال نہ کرنا۔

(۳) دشمن کو خط و کتابت کا موقع نہ دینا۔

(۴) غیر ملکیوں کو جو اعتبار کرکے ملک میں آئیں انہیں تباہ کر دینا۔

(۵) وزیروں سے گہری دوستی رکھنا

(۶) بدخواہوں سے ملے رہنا۔

(۷) وفاداروں کو غیر وفادار سمجھنا۔

(۸) خوشامد کو پسند کرنا

(۹) ایسے آدمیوں کو سزا نہ دینا جو سلطنت کے بھید دوسرے آدمیوں کو بتلا دیتے ہیں۔

(۱۰) اہم معاملات پر توجہ نہ دینا۔

(۱۱) عالموں (لائق ادب لوگوں) کا ادب نہ کرنا۔

(۱۲) کم درجہ اور خراب لوگوں سے ملنا۔

(۱۳) شہوت اور جوئے بازی سے رغبت رکھنا۔"

(۴۵) جب بادشاہ پر تین قسم کی آفتیں نازل ہوں۔ ایک جو دیوتاؤں کی طرف سے ہو دوسری جو آسمان سے نازل ہو۔ اور تیسری جو زمین سے پیدا ہو تو برہمنوں کے ذریعہ خوب خیرات اور قربانی کی جائے۔

(۴۶) ایک بادشاہ کو اس کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ اس کے بڑے عہدہ دار ایک دوسرے کی سخت مخالف رہیں

(۴۷) بادشاہ کو آپ خود سفارت پر نہ جانا چاہیئے۔ بلکہ ایسے شخص کو بھیجنا چاہیئے جو عالی صفات رکھتا ہو۔ اور اس کے ساتھ خزانہ، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ ہوں۔ کہ وقت ضرورت نمایش کے ساتھ ساتھ خرچ بھی کر سکے۔ ایسا شخص وہ ہونا چاہیئے جو بادشاہ کی ذات سے محبت رکھے۔ ورنہ ممکن ہے کہ وہ دولت حاصل کرنے کے بعد خود بادشاہ پر پلٹ پڑے۔

(۴۸) اپنے ملک کی سرحد پر گھنے جنگلات کو ترقی دو۔ لیکن ملک کے اندر زمین کو قابل زراعت بناؤ۔

(۴۹) سرحد پر جو سردار متعین ہیں۔ ان سے آشتی کے ساتھ پیش آؤ۔

(۵۰) جو سوداگر تمہارے ملک میں باہر سے آئیں۔ ان کی ہمت افزائی کرو۔ اور انہیں انعامات دو۔

(۵۱) بادشاہ کو غیر ممالک کے سفیروں سے خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیئے۔

(۵۲) ایک بادشاہ کو اس شخص سے خفیہ مشورہ لینا نہ چاہیئے۔ جس کی ابھی ابھی نئی عزت افزائی ہوئی ہے۔

(۵۳) وہی بادشاہ آرام کی نیند سوتا ہے۔ جو اپنے قلمرو میں ایسے برہمنوں

کو مقرر کرے جو قابل، جوانمرد اور قدیم خاندان سے ہیں۔

(۵۴) جو روپیہ ہاتھی، گھوڑوں، فوج اور برہمنوں اور دیوتاؤں پر اور اپنی شان و شوکت دکھانے پر خرچ ہوتا ہے۔ وہ رائگاں نہیں جاتا۔

(۵۵) اگر ہمالیہ جیسی اونچی دولت بھی مل سکتی ہے تو بادشاہ کو لازم نہیں۔ کہ ملیچھوں (مسلمانوں) کے ملک میں جائے۔ اس کو صرف اپنی فوج ان کے ملک میں بھیجنا چاہئے۔ اس لئے کہ ملیچھوں سے موافقت ہو نہیں سکتی۔

(۵۶) بادشاہ کے پاس تین قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ خیر خواہ وہ جو نہ خیر خواہ ہیں نہ بد خواہ۔ بد خواہ

(۱) خیر خواہ یہ لوگ ہیں۔ حکیم، طبیب، نجومی، عالم، شاعر، پروہت اور خاندانی پجاری۔

(۲) جو لوگ محاصل وصول کرتے ہیں۔ وہ نہ خیر خواہ ہیں نہ بد خواہ۔

(۳) جو لوگ خزانہ کو دیا ہوا روپیہ پھر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بد خواہ ہیں۔

(۵۷) شاہی انعامات کے مستحق صرف برہمن ہیں۔ یہ روپیہ ان کی حفاظت پر خرچ کرنا چاہئے۔

(۵۸) مار کے خوف سے ہی عورت اپنے شوہر کی اطاعت کرتی ہے۔

(۵۹) ہفتہ کے سات دن ہیں اور ہر دن کو کی نہ کوئی قیمتی پتھر اپنے جسم پر بطور زیور پہنو۔"

کرشنا دیورایا کی کامیابی کے اسباب میں میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۱۹۵۶

پر مکھتا ہے :-

"(۱) بہترین فوجی تنظیم

(۲) اس کی سیاسی چالیں۔

(۳) اس کی ذاتی وجاہت۔

(۴) اس کی ہمسایہ سلطنتوں میں باہمی رقابت"

۱۵۲۴ء میں اس کے وزیر تمراج نے کرشنا دیو رایا کے بیٹے کو جو چھ سال کا تھا۔ زہر دیدیا اس راز کے فاش ہونے پر تمراج کو اندھا کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ جہاں وہ مرگیا۔ تمراج شاید کرشنا دیو رایا کے بعد اس کے چھوٹے بھائی بانر سمہا کے بیٹے کو تخت نشین کرنا چاہتا تھا۔ اسکی وفات کے وقت اس کی دو بیٹیاں اور ایک صغیر سن بیٹا تھا۔ اس کی دو بیٹیوں کی شادی رام راج اور تر ملا سے ہوی۔ جن کا ذکر بعد میں آئیگا۔ غالباً تمراج کے اس فعل سے اسمٰعیل عادل نے دوبارہ بیجاپور پر چڑھائی کی تجویز کی ہو۔

کرشنا دیو رایا کے عہد پر ایک نظر

تاریخی نقطۂ نظر سے کرشنا دیوا کا عہد ایک نہایت کامیاب عہد ہے۔ زمانہ حال کے بعض ہندو مورخین نے اس کی فتوحات کو دیکھکر اس کو نپولین (Napoleon) سے تشبیہ دی ہے۔ جو کسی طرح مناسب نہیں۔ کہاں نپولین کی فتوحات اور کہاں کرشنا دیوا۔ نپولین نے تمام یوروپ کو نیچا دکھا دیا تھا۔ لیکن دیو رایا بیجاپور کی ایک چھوٹی سی سلطنت کو بھی کامل طور پر فتح نہ کرسکا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ہندو راجاؤں میں یہی پہلا راجہ تھا۔ جس نے اپنی پالیسی

سے مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر خود فائدہ اٹھایا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ اسی راجہ کے عہد میں وجیانگر کی سلطنت اپنے انتہائی عروج پر پہونچی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ انتہائی نقطہ تھا۔ جہاں پہونچکر زوال شروع ہو جاتا ہے۔ گو اس وقت اس کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ کرشنا دیورایا میں جنگی قابلیت و فرزانگی موجود تھی۔ لیکن جب فتح حاصل ہو چکی تو اس نے اس سے فائدہ حاصل نہیں کیا۔ بخلاف اس کے اس نے اپنے حریف کے مذہبی جذبات سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اسمٰعیل عادل کو اپنے قدم چومنے کیلئے طلب کرنا اور اس پر اصرار کرنا ایک ایسی فاش غلطی تھی۔ جس نے مسلمانوں کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر دیا۔ ایک مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن سوائے خدا کے کسی کے آگے اپنا سر نہیں جھکا سکتا۔ اگر کرشنا دیورایا بیجاپور پر کامل قبضہ کر بیٹھتا تو دکن کے مسلمان جو خود ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ خوش ہو جاتے۔ لیکن اس توہین نے سب کو برگشتہ خاطر کر دیا۔ اور اس پر مزید طرہ یہ ہوا کہ کرشنا دیوا کے جانشینوں نے بھی اس کی ہی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ جس کے باعث اس سلطنت پر نہایت جلد زوال آ گیا۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرشنا دیو رایا نے جہاں سلطنت کو عروج پر پہنچایا۔ وہاں اپنے جوش اور مذہبی تعصب سے خود اس کے زوال کے اسباب بھی مہیا کر گیا تھا۔

اچھوت رایا

سنہ ۱۵۳۰ء و سنہ ۱۵۴۲ء

(معاصرین ۱۔ اسمٰعیل عادل شاہ سنہ ۱۵۳۴ء۔ ابراہیم عادل سنہ ۱۵۳۴ء سے سنہ ۱۵۵۷ء۔ احمد نگر

برہان نظام شاہ (۱۵۱۸ء تا ۱۵۵۴ء)

کرشنا دیورایا کی وفات پر اس کا سوتیلا بھائی اچھوت رایا تخت نشین ہوا۔ ہندو تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تخت کیلئے وجیانگر میں نزاع ہوا۔ فرشتہ اور نیونز کے بیان سے بھی زیادہ واضح نہیں ہوتا۔

فرشتہ لکھتا ہے :-

"کرشنا دیورایا کی وفات پر اس کی چھوٹی بیٹی تخت کی وارث تھی۔ مقامی زبان کی کتابوں اور کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشنا دیورایا کا ایک چھوٹا بیٹا بھی تھا۔"

کرشنا دیورایا کے متعلق تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس کی بارہ رانیاں تھیں۔ جن میں چار سب سے ممتاز تھیں ان میں بڑی رانی ترمل دیوی کی لڑکی سے رام راج کی شادی ہوئی تھی اور دوسری رانی کی لڑکی سے ترمل راج نے شادی کی تھی۔ اس لئے ان رانیوں نے چاہا کہ رام راج بحیثیت بڑا داماد ہونے کے تخت نشین ہو۔ لیکن تیسری رانی نے اپنے بھائی ہوجے ترملا کے بل پر جس کے ساتھ محل کا ایک غلام بھی شامل ہو گیا تھا۔ اپنے شیرخوار بچے کو تخت نشین کرنا چاہا۔ ایک تیسری پارٹی اچھوت رایا کو تخت نشین کرنا چاہتی تھی۔

اس خانہ جنگی کی خبر جب اسمٰعیل عادل شاہ کو بیجاپور میں پہونچی تو اس نے ۱۵۳۰ء میں کرشنا دیورایا کی وفات کے تین ماہ بعد وریائے کرشنا کو عبور کر کے رائچور اور مدگل پر قبضہ کر لیا۔

اس طرح دوآبہ رائچور پھر دس سال کے بعد مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اس وقت اسمٰعیل عادل شاہ کی حمایت پر علاؤ الدین عماد شاہ والئ بیدر اور امیر برید بھی تھے۔ امیر برید بیجاپور کا باجگذار بن چکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ وجیانگر والوں نے اپنی خانہ جنگی کی وجہ سے رائچور اور مدگل کی مقیم فوج کو کوئی کمک نہیں بھیجی۔ اس لئے تین ماہ کے محاصرہ کے بعد یہ دونوں قلعے مسلمانوں کے ہاتھ آگئے۔ اسمٰعیل عادل دوآبہ رائچور پر قبضہ کر کے بیجاپور کو واپس ہوگیا۔ اس کے بعد ہی اسمٰعیل عادل کا انتقال ہوگیا۔ اور ابراہیم عادل تخت نشین ہوا۔

وجیانگر اس تمام عرصہ میں سازشوں کا گھر بنا رہا۔ یہاں تک کہ ہوجے ترملا اور تیسری رانی نے جو اپنے شیر خوار لڑکے کو تخت نشین کرنا چاہتی تھی۔ بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل سے مدد مانگی اور اس تائید کے عوض خراج دینا منظور کر لیا۔ ابراہیم عادل نے اس دعوت کو منظور کر لیا ابراہیم عادل کے آنے کی خبر سن کر دوسری دو پارٹیوں نے آپس میں اتحاد کر لیا۔ اور ہوجے ترملا اور تیسری رانی کے مطالبہ کو قبول کرتے ہوئے اس کے شیر خوار لڑکے کی تخت نشینی کو منظور کر لیا گیا۔ اس طرح سمجھوتہ کرنے کے بعد ابراہیم عادل والی بیجاپور کو جو راستہ میں تھا۔ لکھ دیا گیا کہ وجیانگر میں آپس میں سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ اسی سفیر کے ذریعہ یہ بھی درخواست کی گئی کہ ابراہیم عادل وجیانگر آنے کی تکلیف گوارا نہ کرے۔ حسب وعدہ اس کو امداد کے عوض جو رقم دینا منظور کی گئی تھی۔ بھیجدی گئی۔ ابراہیم عادل رقم لے کر اُدھر سے اُدھر ہی واپس چلا گیا۔

حقیقت میں یہ ایک نہایت گہری سیاسی چال تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر وجیانگر باجگذار بن گیا تو اس ہندو سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائیگا۔ ابراہیم عادل کے واپس جاتے ہی دوسری پارٹیوں نے سازش کر کے وجیانگر پر فوجی قبضہ کرتے ہوئے محل کا محاصرہ کر لیا۔ مجبور ہو کر ہوجے ترملا نے خودکشی کر لی۔

اب ان دونوں پارٹیوں نے ملکر اچھوت رایا کو تخت نشین کیا۔ اور سلطنت کے

کے نظم و نسق میں اس کے دونوں سالے پدا سلو کا ترملا اور چنا سلو کا ترملا کے ساتھ رام راج اور اس کے بھائی ترملا کو بھی حصہ دیا گیا۔ جو پہلی اور دوسری رانی کے داماد تھے۔

نیونز لکھتا ہے :-

"ابراہیم عادل شاہ والیٔ بیجاپور کو وجیانگر آنے کی دعوت کسی نے بھی نہیں دی۔ وجیانگر کی خانہ جنگی کی حالت سن کر وہ خود حملہ آور ہوا۔ یہاں تک کہ وہ پایۂ تخت سے ایک منزل پر پہونچ گیا۔ اچھوت رایا اگر چاہتا تو اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے ہمت ہار دی۔ ابراہیم عادل کے ماتحت اس وقت صرف بارہ ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل سپاہ تھی۔ اس نے شہر ناگلا پور پر حملہ کر کے اس کو بالکل تباہ کر دیا۔ اچھوت رایا نے دس لاکھ طلائی پگوڈا اور ایک لاکھ کے جواہرات دیکر صلح کر لی۔ رائچور پر اس کے قبضہ کو تسلیم کر لیا گیا۔ جس کے بعد ابراہیم عادل واپس ہو گیا۔ اسکے واپس ہوتے ہی وجیانگر میں امراء اور رعایا نے راجہ کو غیرت دلائی کہ ان کی ضد کی وجہ سے وجیانگر کو یہ روز دیکھنا نصیب ہوا۔ آخر ان تمام ہنگاموں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اچھوت رایا کو سب نے راجہ تسلیم کر لیا۔ اور سلطنت کے انتظام میں اس کے سالوں کے ساتھ رام راج اور اس کے بھائی ترملا کو بھی حصہ دیا گیا۔"

روایات میں خواہ کس قدر اختلاف ہو۔ لیکن نتیجہ ایک ہی ہے۔ یعنے اچھوت رایا کو سب نے راجہ تسلیم کر لیا۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اچھوت رایا کے سالے پدا سلو کا ترملا اور چنا سلو کا ترملا نے اس قدر ظلم و ستم سے کام لیا کہ تمام ملک میں ایک شورش پھیل گئی۔ اور کئی ایک ماتحت سردار اور امراء باغی ہو گئے۔ اسی زمانہ میں اڈیسہ کا راجہ جس کا ملک

کرشنا ویورایا نے فتح کر لیا تھا۔ حملہ کر کے دریائے کرشنا تک اپنا تمام ملک واپس لے لیا۔ انہیں حالات میں اچوت رایا کا عہد ۱۵۴۲ء میں ختم ہو گیا۔

سداسیورایا

۱۵۴۲ء - ۱۵۷۰ء

معاصرین :-

ابراہیم عادل شاہ	والی بیجاپور	۱۵۳۵ء	۱۵۵۷ء
علی عادل شاہ	" "	۱۵۵۷ء	۱۵۸۰ء
علی برید	" بیدر	۱۵۴۲ء	۱۵۷۹ء
سلطان قلی قطب شاہ	" گولکنڈہ	۱۵۴۳ء	ـــــ
جمشید قطب شاہ	" "	۱۵۴۳ء	۱۵۵۰ء
سبحان قطب شاہ	" "		۱۵۵۰ء
ابراہیم قطب شاہ		۱۵۵۰ء	۱۵۸۰ء
برہان نظام شاہ	" احمد نگر	۱۵۱۸ء	۱۵۵۴ء
حسین نظام شاہ	" "	۱۵۵۴ء	۱۵۶۵ء

اچوت رایا کی وفات کے وقت ملک کی جو حالت تھی اس کا اندازہ ہو چکا ہے۔ اچوت رایا کے مرتے ہی امراء نے اس کے سالوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین لیا۔ اور رام راج اور اس کے بھائی ترملا کی پارٹی برسراقتدار آ گئی۔ انہوں نے سداسیورایا کو جو اچوت رایا کا سوتیلا بھائی تھا۔ تخت نشین کیا۔

سیاح گیا سپرے کو رسے جو اس زمانے میں وجیانگر میں تھا۔ لکھتا ہے :-

"اچھوت رایا کی وفات کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے ونکٹا دری کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اس کو چھ ماہ بعد قتل کر دیا گیا۔ اور سدا سیورایا کو تخت نشین کیا گیا۔ لیکن تمام انتظام سلطنت رام راج اور اس کے بھائی کے ہاتھ میں رہا۔ یہ دونوں کرشنا دیو رایا کے داماد تھے۔"

رام راج نے ملک میں اس قدر طاقت حاصل کر لی کہ راجہ برائے نام رہ گیا۔ ہندو مورخین لکھتے ہیں:۔

"سدا سیورایا اس وقت نہایت کمسن تھا۔ اس لئے اس کو برائے نام راجہ بنا کر رام راج نے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔"

سدا سیورایا کو رام راج نے تمام عمر اپنی قید میں رکھا۔ سدا سیورایا کو سلطنت کے کاموں میں بالکل دخل نہیں تھا۔ سدا سیوا کا نام تاریخ میں صرف اس لئے لکھا گیا ہے کہ رام راج نہایت ہوشیاری سے کام لیکر تمام احکام و فرامین سدا سیورایا کے نام سے جاری کرتا تھا۔ ورنہ سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک صرف رام راج ہی تھا۔

رام راج ایک نہایت زبردست سیاسی شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے سلطنت وجیانگر کی تمام اندرونی کمزوریوں کو دور کرکے اس کو ایک ایسی سطح پر قایم کیا۔ جس کی وجہ سے تمام ملک میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ جنوبی ہند کے ہندو آج بھی رام راج کے عہد کو رعب اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور یاد کرتے ہیں۔

رام راج نے اقتدار حاصل کرتے ہی سب سے پہلے فوجی تنظیم پر توجہ کی۔ رعایا کی مشکلات کو دور کیا۔ اور ایسے احکام جاری ہوئے جن کی وجہ سے شورشیں بالکل دب گئیں۔ تمام باغی سردار ایک ایک کرکے پھر سلطنت کے حلقۂ اطاعت میں آگئے۔ صرف ایک ٹراونکور باقی رہگیا۔ اچھوت

رایا کے زمانے میں ٹراونکور کے راجہ نے بغاوت کرکے ضلع تناولی پر قبضہ کر لیا تھا۔ ٹراونکور پر چڑھائی کی گئی۔

ریورنڈ ہراس نے اپنی تاریخ "خاندان اراویدو" میں لکھا ہے :۔

" ٹراونکور والوں نے حملہ آوروں کو سخت شکست دی۔ لیکن بعد میں وجیانگر والے ان پر غالب آگئے۔ ٹراونکور نے ضلع تناولی کو خالی کرتے ہوئے خراج دینا منظور کر لیا۔"

ملک کے اندرونی انتظام سے فارغ ہوکر رام راج نے اپنی شمالی سرحد پر نظر ڈالی۔ اس زمانہ میں دکن کی اسلامی سلطنتوں میں تین سلطنتوں کی سرحدیں وجیانگر کی سرحدوں سے ملی ہوئی تھیں۔ احمدنگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی ان تینوں میں آپس میں نااتفاقی تھی۔ اور ہمیشہ ان میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان تینوں میں بیجاپور کی سلطنت سب سے زیادہ زبردست تھی۔ اور یہی سلطنت ہمیشہ وجیانگر کے مقابلہ میں صف آرا ہوتی تھی۔ رام راج نے سب سے پہلے اس کا خاتمہ کرنا چاہا۔ لیکن اس کو جرأت نہیں ہوئی۔ کہ اکیلا اس سے مقابلہ کرسے۔ اس لئے اس نے اپنے خسر کرشنا دیورایا کی تقلید میں ایک ایسی سیاسی روش اختیار کی۔ کہ جس کی وجہ سے تینوں سلطنتیں ایک دوسرے کی پہلے سے زیادہ دشمن بن گئیں۔ اور بیک وقت نہ صرف بیجاپور بلکہ احمدنگر اور گولکنڈہ بھی کمزور ہو گئے۔

رام راج کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اسلامی سلطنتوں اور خصوصًا بیجاپور کی طاقت کا سارا راز ان کی سوار فوج میں ہے۔ اس لئے اس نے اپنی سوار فوج کو مضبوط اور بیجاپور کی طاقت کو کمزور کرنے کیلئے پرتگال والوں سے ایک معاہدہ کیا۔

(نوٹ :۔ اس وقت پرتگال والے اپنی بحری طاقت کی وجہ سے ملک کی تمام تجارت سے عربوں کو بے دخل

کرکے اس پر اپنا قبضہ جمار ہے تھے۔ بلکہ انہوں نے بندرگاہ گوا وغیرہ پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔)

پرتگال والوں سے حال ہی میں احمدنگر والوں نے ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس لئے رام راج نے پرتگال والوں سے معاہدہ کرنے میں احمدنگر کو بھی شریک کرلیا۔ اس معاہدہ سے اس کو نہ صرف وہ ذریعہ ہاتھ آگیا۔ جس سے بیجاپور کو کمزور کرسکے۔ بلکہ ایک حلیف (احمدنگر) بھی مل گیا۔ جو اس کی مقصد برآری کے لئے نہایت ضروری تھا۔ رام راج نے پرتگال والوں سے جو معاہدہ کیا۔ اس کی شرائط حسب ذیل تھیں :-

(۱) یہ معاہدہ گوا کے گورنر ڈی کاسٹرو اور راجہ سداسیورایا لنہ بتاریخ ۱۹ ردسمبر سنہ ۱۵۴۷ء میں طے کیا ہے۔

(۲) فریقین اس بات کا عہد کرتے ہیں۔ کہ ایک فریق کا دوست دوسرے فریق کا بھی دوست، اور ایک فریق کا دشمن دوسرے فریق کا بھی دشمن مانا جائیگا۔ اور جب کبھی ہندوستان بھر میں کسی بادشاہ یا حاکم سے جنگ کی ضرورت پڑ جائے تو ایک فریق دوسرے فریق کی مدد کریگا۔ نظام شاہ والی احمدنگر کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

(۳) بندرگاہ گوا میں جتنے گھوڑے عرب یا فارس سے اتریں۔ گورنر گوا کا فرض ہوگا۔ کہ وجیانگر کے راجہ کو مناسب وقفوں کے ساتھ اطلاع دیکر تمام گھوڑے اس کے لئے بہ ادائے قیمت خرید کرکے بھجوا دے۔ ہرگز کوئی گھوڑا بھی سلطنت بیجاپور کو نہ بھیجا جائے۔

(۴) وجیانگر کا راجہ اپنے ملک کے تمام سوداگروں کو اس امر پر مجبور کریگا کہ وہ اپنے تمام سوداگری کا مال انہیں بندرگاہوں سے روانہ کریں جو پرتگال والوں کے قبضہ میں ہیں۔ کوئی تاجر کو مجاز نہ ہوگا کہ سامان تجارت بیجاپور کے مقبوضہ

بندرگاہوں سے چڑھائے۔

(۵) وجیانگر کا راجہ اپنے تمام تاجروں کو حکم دیگا کہ آئندہ شورہ اور لوہا بیجاپور کی بندرگاہوں سے نہ خریدیں بلکہ اپنی تمام ضروریات پرتگالی کوٹھیوں سے خریدیں۔

(۶) کپڑے، تانبہ، ٹین اور جست کیلئے بھی یہی مذکورۂ بالا حکم ہے۔

(۷) وجیانگر کا راجہ اپنی بندرگاہوں میں مسلمانوں کا کوئی جہاز یا بیڑا آنے نہ دیگا اور اگر اتفاقاً کوئی آجائے تو اس کو گرفتار کرکے گوا بھیجدیا جائیگا

(۸) دونوں فریق اس کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ عادل شاہ والی بیجاپور سے جنگ کرینگے۔ اور وہ علاقہ جو فتح ہوگا وجیانگر کی ملکیت سمجھا جائیگا۔ اس کے عوض ان تمام مقامات پر جو مغربی گھاٹوں کے مغرب میں اور شمال میں باندے سے لیکر جنوب میں سنکا کورے تک ہیں۔ بادشاہ پرتگال کا علاقہ تسلیم کیا جائیگا"

(بمبئی گزیٹیر صفحہ ۴۳۹-۲)

(نوٹ ۱۔ اس عہدنامہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ جنوب کے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف کس قدر جذبہ پایا جاتا تھا۔ دوسری یہ کہ مغربی قوموں کو ملک میں نہ صرف دخل دہی کا موقع دیا گیا بلکہ ان کی حکومت بھی تسلیم کرلی گئی۔

اس عہدنامہ کے طے ہونے کے بعد رام راج نے بیجاپور پر توجہ کی۔ اس وقت بیجاپور اور احمدنگر میں شہر کلیان کے قبضہ کے متعلق اَن بَن تھی۔ احمدنگر سے کسی گذشتہ جنگ میں بیجاپور نے کلیان پر قبضہ کرلیا تھا۔ رام راج نے کلیان کے حصول کیلئے احمدنگر کی تائید کرنے کا وعدہ کرلیا۔ فرشتہ لکھتا ہے :-

" اس اتحاد کو مضبوط کرکے رام راج نے برہان نظام شاہ والی احمد نگر اور جمشید قطب شاہ والی گولکنڈہ سے سازش کرکے بیجاپور والوں پر حملہ کیا "

ہندوستانی تاریخ " واسو چیتریہ " کا مصنف لکھتا ہے :-

" احمد نگر کا سلطان اس سے مدد کا خواہاں ہوا تو اس نے اس کی مدد کی "

۱۵۵۱ء میں دریائے بھیما کے کنارے ایک خونریز معرکہ میں بیجاپور والوں کو شکست ہوئی۔ ابراہیم عادل شاہ نے یہ دیکھکر اپنے جنرل اسد خاں کے ذریعہ رام راج سے علحدہ صلح کرلی۔ اس صلحنامہ میں برہان نظام شاہ اور جمشید قطب شاہ کو بالکل علحدہ رکھا گیا۔ اس صلحنامہ میں رام راج نے یہ شرط بھی بیجاپور والوں سے منوائی کہ وہ آئندہ کبھی احمد نگر یا گولکنڈہ سے کبھی اتحاد نہ کریں گے اور شہر کلیان کو احمد نگر کے حوالے کردیا گیا۔

اس جنگ کے تیسرے سال گولکنڈہ اور احمد نگر والوں نے اتحاد کرکے بیجاپور سے جنگ چھیڑدی۔ متحدہ فوجیں گلبرگہ پر بڑھیں۔ رام راج نے اس وقت بیجاپور کی تائید کی۔ اور اپنے بھائی کو گولکنڈہ پر فوج کشی کے لئے بھیجدیا۔ رام راج کی اس فوج کشی سے گھبراکر گولکنڈہ والے اپنا پائے تخت بچانے کیلئے واپس ہوگئے۔ جس کی وجہ سے احمد نگر والے بھی اپنے ملک کو واپس ہوگئے۔ گولکنڈہ والوں نے رام راج سے صلح کرلی۔ ان سے اقرار لیا گیا کہ وہ آئندہ کبھی احمد نگر سے اتحاد نہ کریں گے۔

ہندوستانی تاریخ "سیوتارتن" کا مصنف لکھتا ہے :-

" رام راج نے ابراہیم قطب شاہ پر حملہ کرکے اس کو احمد نگر سے قطع تعلقات پر مجبور کیا "

اس کے بعد رام راج نے شہر کلیان کو احمد نگر کے قبضہ سے نکالکر بیجاپور کے حوالے کردیا

ان دونوں جنگوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ تینوں اسلامی سلطنتیں مجبور ہوگئیں کہ ایک دوسرے سے کبھی اتحاد نہ کرسکیں۔ اب اس کے بعد رام راج نے ان سلطنتوں کے اندرونی معاملات میں بھی دخل دینا شروع کیا۔ گولکنڈہ میں جمشید قطب شاہ کی وفات پر امراء نے اس کے بیٹے کو تخت نشین کیا۔ لیکن رام راج نے جمشید قطب شاہ کے بھائی ابراہیم قطب شاہ کی حمایت میں گولکنڈہ پر فوج کشی کردی۔ جنگ میں امرائے گولکنڈہ کو شکست ہوی۔ اور ابراہیم قطب شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ہندوتاریخ نرسابھ۔ پالیمو کا مصنف لکھتا ہے:۔

"اس نے قطب شاہ کو مدد دیکر اس کی سلطنت اسے بحال کردی۔ اس تائید کے عوض ملک کا ایک حصہ رام راج نے حاصل کر لیا"

۱۵۵۷ء میں بیجاپور میں ابراہیم عادل کی وفات ہوگئی۔ اور اس کا بیٹا علی عادل تخت نشین ہوا۔ لیکن اس کے چچا عبداللہ نے پرتگال والوں کی حمایت لیکر تخت کا دعویٰ کیا۔ اس تائید کے عوض اس نے سالسٹ اور بردیز کا خطہ پرتگال والوں کے حوالے کردیا۔ پرتگال والوں نے مملکت بیجاپور پر چڑھائی کی۔ علی عادل نے رام راج سے مدد چاہی اور اس کا منہ بولا لڑکا بن گیا۔ رام راج نے ایک زبردست فوج بھیجکر عبداللہ کو شکست دی۔ اور وہ مجبور ہوکر احمدنگر کی طرف فرار ہوگیا۔ جہاں رام راج کے خوف سے احمدنگر والوں نے اسکو گرفتار کرکے گوا کو بھیجدیا۔ اور یہاں اس کا انتقال ہوگیا۔

اس واقعہ کے دوسرے سال یعنے ۱۵۵۸ء میں علی عادل والئ بیجاپور کی کم سنی اور ناتجربہ کاری کو دیکھکر احمدنگر والوں نے پھر ایک بار شہر کلیان کو حاصل کرنے کیلئے فوج کشی کردی۔ علی عادل بھاگ کر وجیانگر میں پناہ لی۔ رام راج نے اسکی تائید میں احمدنگر پر چڑھائی کردی۔ جنگ میں احمدنگر والوں کو شکست ہوی۔ اس تائید کے صلے میں بیجاپور

سے رائچور اور مدگل پر وجیانگر کے مستقل قبضہ کو تسلیم کرایا گیا۔

ابھی اس واقعہ کو چند سال ہی گذرے تھے کہ احمد نگر کے حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی کا نکاح ابراہیم قطب شاہ والئ گولکنڈہ سے کیا۔ اوران دونوں کی فوجیں پھر شہر کلیان کو حاصل کرنے کے لئے بیجاپور پر حملہ آور ہوئیں۔ اس وقت ان کے ساتھ علی برید والئ بیدر اور برہان عماد والی برار بھی شامل تھے۔ بیجاپور کے علی عادل نے یہ دیکھ کر رام راج سے تائید چاہی۔ جنگ میں پھر احمد نگر والوں کو شکست ہوئی۔ ہندو فوج نے دوبارہ احمد نگر پر قبضہ کر لیا۔ اوراس بدقسمت شہر کی تباہی اور اسلام و مسلمانوں کی توہین میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔

تاریخ فرشتہ کا مترجم برگس (Briggs) اپنی کتاب کے جلد سوم کے صفحہ ۲۰۲ پر لکھتا ہے:-

"ظلم وستم کی انتہا نہیں رہی۔ مسجدوں میں سور کاٹے گئے۔ گھوڑے باندھے گئے۔ اور گھروں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قرآن مجید کے نسخے لاکر ان کی بے حرمتی کی گئی۔ اور انہیں سربازار جلایا گیا۔ مسلمان پردہ نشیں عورتوں کی دن دھاڑے راستوں میں عصمت دری کی گئی۔ مسجدوں اور دوسرے مذہبی عمارات کو ڈھا دیا گیا"

مورخ ہیگ اپنی کتاب کے صفحہ ۴۲۷ پر لکھتا ہے:-

"ہندوؤں نے اس موقع سے پھر فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کی توہین کی۔ اوران کی مسجدوں میں گھوڑے باندھے گئے۔ اور جب جلانے کو لکڑی نہ رہی تو مسجدوں کو ڈھا کر لکڑی لی گئی"

حسین نظام نے عاجز ہو کر صلح طلب کی اور وجیانگر میں حاضر ہو کر سر دربار رام راج

کے ہاتھ سے پان کا بیڑا لینا قبول کیا۔ جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ رام راج کو اپنے سے برتر مانتا ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں نہ صرف احمد نگر کا بہت سا علاقہ وجیانگر کے قبضہ میں آیا بلکہ بیجاپور سے بھی تائید کے عوض کونڈاپلی کا علاقہ لے لیا گیا۔

رام راج کی اس مذکورۂ بالا پالیسی کی وجہ سے جب دکن کی تینوں اسلامی سلطنتیں ایک ایک کرکے کمزور ہوگئیں اور کسی میں وجیانگر کے مقابلہ کی طاقت نہ رہی تو اب رام راج نے اپنے مغلوب حریفوں یعنے مسلمانوں کی اسی طرح تحقیر شروع کردی جس طرح کرشنا دیورایا نے اپنے مغلوب حریف اسمٰعیل عادل کی کی تھی۔

مسلمانوں کا اس طرح عاجز و بے بس ہوجانا ہندو دنیا میں رام راج کے نام کو خوب چمکا دیا۔ اس وقت حقیقت بھی یہی تھی کہ سارے دکن اور جنوبی ہندوستان میں رام راج سے زیادہ زبردست حکمران اور کوئی نہیں تھا۔ وجیانگر اپنے پورے عروج پر تھا۔ مال و دولت کی فراوانی، ملک میں امن و امان، دشمنوں کی عاجزی اور بے بسی نے رام راج کے دماغ کو آسمان ہفتم پر پہنچا دیا تھا۔ اس نے مسلمان سفیروں کو حکم دیا کہ اس کے دربار میں جب حاضر ہوں تو کھڑے رہیں۔ ان سے نہایت نفرت، حقارت اور غرور سے مخاطب ہوتا تھا۔ جب کبھی سفر میں ساتھ ہوتے تھے تو ان کو پیدل چلنے کا حکم تھا۔

صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا۔ بلکہ مسلمان سلاطین بھی جب دربار میں آتے تھے تو ان سے بھی یہی سلوک کیا جانے لگا۔ اور بات بات میں ان کے مذہب کی توہین ہونے لگی۔ یہاں تک کہ عام ہندو بھی سر بازار مسلمانوں اور اسلام کی توہین کرنے لگے۔

رام راج کی اس پالیسی کے متعلق میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۵۹ اور ۲۰۶۰ پر لکھتا ہے:-

" رام راج کا ۲۲ سالہ عہد اور اس کی جنگی پالیسی اور شاطرانہ چالوں نے اس کے نام کو جنوب میں اس قدر چمکا دیا کہ یقیناً وہ اس وقت دریائے نربدا سے نیچے راس کماری تک سب سے زیادہ طاقتور حکمران تھا۔ جس کے نام سے جنوبی ہند کانپتا تھا حقیقت میں رام راج اس وقت جنوبی ہند۔ دکن کا ڈکٹیٹر تھا۔ جس کے اشاروں پر اس کے ہمسایہ رقصاں رہتے تھے۔ اور یہی ان کی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس میں اس قدر نخوت پیدا ہو گئی تھی کہ ہر شخص جو اس سے امداد کا طالب ہوا۔ وہ اس کو دیکھکر اس سے اندرونی طور پر دشمنی کرتا تھا۔ گو ذاتی طور پر ہر ایک اس سے مدد کا خواہاں تھا۔ لیکن اندرونی طور پر اسکی چیرہ دستیوں کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے حسد کرتے تھے۔

اس (رام راج) نے بیجاپور، احمدنگر اور گولکنڈہ والوں کو ایک دوسرے کے خلاف مدد دی۔ بیدر اور برار والوں نے اسکے ہاتھ سے شکست کھائی۔ اس لئے انہوں نے اتحاد کر لیا۔ ان میں کوئی اس کا دوست باقی نہیں رہا۔"

رام راج کی پالیسی وقت کی مناسبت سے تھی نہ کہ کسی اصول پر۔ ضرورت کے مطابق اس نے ایک کے خلاف دوسرے کو مدد دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی دوستی ان کے نزدیک قابل اعتماد نہیں رہی۔ اس لئے کہ تفریق ڈال کر وہ ہمیشہ اپنا فائدہ ملحوظ رکھتا تھا۔"

حالات دن بدن بد سے بدتر ہونے شروع ہوئے۔ مسلمانوں اور ان کے مذہب کی توہین کے لئے کوئی کسر باقی نہ رکھی گئی۔ آخر صبر اور مجبوری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ انکی آنکھیں کھلیں۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ جب تک وہ آپس کی خانہ جنگی

کو چھوڑ کر اتفاق نہ کرلیں گے۔ان کا پنپنا مشکل ہے۔ اس لئے انہوں نے ایک دوسرے سے اتفاق کر لیا۔ اور اس وقت وہ تمام امور جو ان کی آپس کی خانہ جنگی کا باعث بنے ہوئے تھے بالائے طاق رکھدئے گئے۔ اس آپس کی نااتفاقی کی وجہ نہ صرف سیاسی تھی بلکہ مذہبی بھی۔

(نوٹ :۔ دکن کی یہ سلطنتیں بحاظ عقیدہ سنی اور شیعہ تھیں)

لیکن اس وقت سب کے سب اسلام کے نام پر ایک مرکز پر جمع ہوگئیں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس اتفاق کی بنیاد علی عادل شاہ والئ بیجاپور نے رکھی تھی۔

کلنزی کے مخطوطات کا مصنف ولسن ہند و حوالجات سے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۱۹ - ۲۶۸ پر لکھتا ہے :۔

"ایک دن بیجاپور کے سفیر نے رام راج کے دربار میں شکایت کی کہ محل کے اونٹ ملازموں کی خوراک کیلئے جو سؤر لائے جاتے ہیں وہ ہمیشہ اسی راستے سے اور اسی وقت لائے جاتے ہیں۔ جب سفیر دربار کو آتا ہے۔ اس شکایت کو سن کر رام راج نے جواب میں طنزاً کہا :۔

"تم تو مرغ کھاتے ہو جو سؤروں کے پاخانہ سے اناج چنکر کھاتا ہے"

سفیر نے اس کی اطلاع علی عادل کو دی۔ علی عادل اس مذہبی توہین کو برداشت نہ کرسکا۔

ابوالقاسم فرشتہ لکھتا ہے :۔

"آخر کار علی عادل نے طے کر لیا کہ اس (رام راج) کی مغروری کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اور اس کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے پائمال کر دے۔ اس کی خاطر اس نے اپنے ہمسایہ مسلمان سلطنتوں سے اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ اس نے اپنے جنرل کشور خاں کو قطب شاہ والی گولکنڈہ کے پاس بھیجا۔ جو فوراً اتحاد پر راضی ہوگیا۔ احمد نگر کا حسین نظام

شاہ شولاپور کے معاملہ کی وجہ سے علی عادل سے اتفاق نہ کرسکتا تھا۔ اس لئے ابراہیم قطب شاہ نے درمیان میں پڑکر دونوں میں اتحاد کی تجویز کی۔ اس کے لئے اس نے اپنے وزیر مصطفیٰ خان کو نظام شاہ کے پاس بھیجا۔ مصطفیٰ خان نے نہ صرف اتحاد کرایا بلکہ دونوں خاندانوں (احمد نگر اور بیجاپور) میں شادی بھی کرا دیا۔ مصطفیٰ خان نے حسین نظام شاہ سے کہا: "جب مسلمانوں کی کل طاقت صرف ایک بہمنی بادشاہ کے ہاتھ میں تھی تو اس وقت تک مسلمانوں اور ہندوؤں میں توازن قایم رہا۔ اور جب مسلمان تقسیم ہو گئے تو انہیں شکستیں اٹھانی پڑیں مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ تمام دیندار بادشاہ پھر متحد ہو کر آپس میں ایک دوسرے کے صد درجہ دوست بنے رہیں۔ اور ایسی صورت میں ایک عام دشمن کے مقابلہ میں انکی حفاظت ہو سکتی ہے وجیانگر کے راجہ نے تمام کرناٹک کے راجاؤں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ انہیں اسلامی ملکوں سے دور کریں۔ اور اس طرح ان لوگوں کو جن کو خدا نے ہماری ضمانت میں دیا ہے۔ بے دینوں کے ظلم و ستم سے بچائیں۔ اور ہمارے مساجد و مقدس مقامات ان بے دینوں کی جائے رہایش نہ بنیں۔"

اس تقریر کا اثر حسین نظام شاہ پر نہایت گہرا ہوا۔ اس کو رام راج سے پہلے ہی نفرت تھی اور اس کے ہی مقبوضات اور پایۂ تخت کو رام راج نے سب سے بڑھکر تباہ کیا تھا۔ اس لئے حسین نظام شاہ نے اس اتحاد میں شرکت کرلی اور اس اتحاد کو مضبوط بنانے کیلئے مصطفیٰ خان کی رائے سے اپنی بیٹی چاند بی بی (دکن (احمد نگر) کی مشہور ملکہ جس نے بعد میں مغلوں کے مقابلہ میں داد شجاعت دی تھی) کی شادی علی عادل سے کر دی۔ اور شولاپور کا قلعہ جو ہمیشہ وجہ نزاع

بنا رہا تھا۔ اس کے جہیز میں علی عادل کو دیدیا گیا۔ دوسری طرف علی عادل نے اپنی بہن فلاح بی بی کی شادی حسین نظام شاہ کے بڑے بیٹے سے کر دی۔ اور اس کے جہیز میں شہر کلیاں دیدیا گیا۔ پرتگالی مورخ کوٹو لکھتا ہے:۔

"اس اتحاد کی بنیاد حسین نظام شاہ نے رکھی۔ اس اتحاد میں علی برید بھی شامل ہو گیا۔"

"وجیا نگر کی تباہی" (Destruction of Vijaynugar) جو ایک مرہٹی تاریخ ہے۔ اس کا مصنف لکھتا ہے:۔

"اتحاد کی بنیاد حسین نظام شاہ نے رکھی۔ علی عادل اس اتحاد میں شامل ہونے سے انکار کرتا رہا۔ اس لئے کہ رام راج نے بہت سے موقعوں پر اسکی مدد کی تھی۔ آخر حسین نظام نے علی عادل سے درخواست کی کہ "کم از کم اسکی فوجوں کو وہ اپنے ملک سے گذرنے کی اجازت دے"۔ علی عادل نے اس سے بھی انکار کیا۔ لیکن دوسری طرف اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر رام راج سے مدگل اور رائچور کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ رام راج نے علی عادل کے سفیر کو سر دربار ذلیل کرکے باہر نکال دیا۔ یہ خبر جب علی عادل کو پہونچی تو اس نے اتحاد میں شرکت کر لی۔ اور جنگ کی تیاری شروع کر دی گئی۔"

میسور ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا مصنف جنگ کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۹۱ پر لکھتا ہے:۔

(۱) احمد نگر میں رام راج کی ہندو فوج کا ظلم وستم اور اسلام کی توہین خاص کر ان مقامات پر جہاں جہاں ہندو فوج کا گذر ہوا۔

(۲) مسلمانوں کے مذہبی اور دوسرے عمارات اور ملک کی تباہی -

(۳) رام راج کا برتاؤ۔ اسلامی سلاطین اور ان کے سفیروں کے ساتھ۔ ان سے اس طرح برتاؤ کیا جاتا تھا کہ ان کو دربار میں بیٹھنے کی تک اجازت نہیں تھی۔ ان سے انتہائی نفرت، حقارت اور غرور سے خطاب کیا جاتا تھا۔ جب کبھی یہ سفر میں ساتھ ہوتے تھے تو ان کو پیدل چلنے کا حکم تھا۔

(۴) رام راج کے فوجی افسر اور سپاہیوں کا مسلمانوں کے ساتھ پُر غرور اور ذلیل برتاؤ (خصوصاً احمدنگر میں)

(۵) جب کبھی موقع ملتا تو مسلمان سلطنتوں کا ایک نہ ایک حصہ غصب کر لیا جاتا تھا خصوصاً بیجاپور اور گولکنڈہ کے علاقے"

یہ وہ اسباب تھے جن سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے اتفاق کر لیا۔ خواہ بنیاد کسی نے رکھی ہو۔ اس اتفاق کے بعد وہ جنگ کی تیاری کرنے لگے۔

مورخ ہیگ اپنی تاریخ کے صفحہ ۱۲۹ پر لکھتا ہے :۔

" اس اتفاق کے بعد علی عادل شاہ والیٔ بیجاپور نے رام راج سے دوآبہ رائچور اور ضلع ہپ گری کا مطالبہ کیا۔ جن پر رام راج نے قبضہ کر لیا تھا۔ رام راج نے بیجاپور کے سفیر کو سر دربار ذلیل کر کے شہر سے باہر نکال دیا۔ یہ خبر جب اسلامی پایۂ تختوں میں پہونچی تو حسین نظام شاہ والی احمدنگر۔ ابراہیم قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ اور علی برید شاہ والیٔ بیدر اپنی اپنی فوج لیکر علی عادل شاہ سے آکر مل گئے۔ اور مسلمانوں کی یہ متحدہ فوج ۲۵ر ڈسمبر ۱۵۶۴ء میں کرسمس کے دن بیجاپور سے نکلی۔ اور تالیکوٹہ پر جو دریائے کرشنا سے ۲۵ میل شمال میں ہے۔ مقام کیا

اس کی خبر جب رام راج کو ملی تو اس نے اپنے بھائی ترملا کو مدافعت کے لئے روانہ کیا۔"

فرشتہ لکھتا ہے :-

"ترملا کے ماتحت بیس ہزار سوار۔ ایک لاکھ پیدل سپاہی۔ اور پانچ سو ہاتھی تھے۔"

ترملا کو بھیجنے کے چند دن بعد رام راج نے اپنے بھائی ونکٹا دری کو بھی ایک زبردست فوج دیکر بھیجا اور بعد میں باقی ماندہ فوج لیکر خود بھی میدان میں پہونچ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ رام راج کی عمر اس وقت اسّی سال کی تھی۔ میدان جنگ میں جس قدر فوج جمع ہوئی۔ اس کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے :-

"ہندوؤں کے کل فوج کی تعداد ایک لاکھ سوار۔ تین لاکھ پیادے۔ دو ہزار ہاتھی۔ اور پانچ سو توپیں تھیں۔ اور مسلمانوں کے پاس ان سے نصف فوج بھی نہیں تھی۔"

پرتگالی مورخ لکھتے ہیں :-

"ہندوؤں کے پاس اس وقت نو ہزار پیدل سپاہی۔ ستر ہزار سوار فوج تھی۔ مسلمانوں کے پاس پچاس ہزار سوار اور تیس ہزار پیادے تھے۔"

دوسرے ہندو مورخ لکھتے ہیں :-

"اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے نصف بھی نہیں تھی۔"

ہندو فوج کی تعداد اور ان کے جنگی کیمپ کی شان و شوکت کے متعلق مرہٹی تاریخ "وجیانگر کی تباہی" (Destruction of Vijaynagar) کا مصنف لکھتا ہے :-

" ہندو فوج کا کیمپ اس قدر بڑا تھا کہ وجیا نگر میں جس ہندو کے پاس بھی گھوڑا تھا وہ فوج میں داخل کر لیا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ فوجی کیمپ نہیں ہے۔ بلکہ ایک نہایت آباد اور وسیع شہر ہے۔ جس میں ہر جگہ ناچ رنگ ہوتا تھا۔ سپاہیوں کی دلجوئی کے لئے زنان بازاری کے طائفے بھی ہمراہ تھے۔ شراب کی دوکانیں ہر جگہ کھلی ہوئی تھیں۔ گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، خزانہ، اناج سب کچھ کیمپ میں موجود تھے۔ رام راج نے پائے تخت سے نکلنے سے پہلے اپنی رانیوں اور ماں کے پاس گیا۔ ماں نے نصیحت کی کہ مسلمانوں سے صلح کر لی جائے۔ لیکن رام راج نے نہیں مانا۔"

مورخ ہیگ اپنی کتاب کے صفحہ ۴۲۹ پر لکھتا ہے:۔

" رام راج نے پہلے اپنے چھوٹے بھائی تما کے ماتحت بیس ہزار سوار۔ پانچ سو ہاتھی اور دس ہزار پیادہ فوج بھیجی کہ مسلمانوں کو دریائے کرشنا عبور کرنے سے باز رکھے۔ تما کے بعد وینکٹ دری کو ایک اور زبردست فوج کے ساتھ روانہ کیا گیا اسکے بعد آپ خود میدان جنگ کو روانہ ہوا۔ کل فوج کی تعداد جو ہندوؤں نے میدان جنگ میں لائی۔ ایک لاکھ سوار۔ تین لاکھ پیادے۔ دو ہزار ہاتھی۔ اور ایک ہزار توپیں تھیں۔"



کرشنا دیورایا
(ایک سنگین مجسمہ سے)



رام راج - والی بیجانگر
(ایک قدیم تصویر سے)

رکساس تنگڑی کی جنگ

یعنے

تالیکوٹہ کا قیامت خیز معرکہ

گذشتہ باب میں لکھا جا چکا ہے کہ مسلمان تالیکوٹہ میں جمع تھے۔ تالیکوٹہ سے نکل کر جب وہ دریائے کرشنا کے شمالی ساحل پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ ہندو فوج دریا کے جنوبی ساحل کے تمام اہم مقامات پر قبضہ کر چکی ہے۔ تاکہ مسلمان پار نہ اتر سکیں۔

مورخ ہیگ اپنی کتاب "ہسٹورک لینڈ مارکس آف دی دکن کے صفحہ ۱۳۰ پر لکھتا ہے :-

" مسلمانوں نے سراغ رسانوں کو بھیجا کہ دریا سے پار اترنے کیلئے کوئی راستہ تلاش کریں۔ لیکن انہوں نے تمام راستے دیکھنے کے بعد یہی رائے دی کہ دریا عبور کرنے کیلئے یہی راستہ سب سے موزوں ہے جو ہمارے آگے ہے۔ اور یہیں سے توپیں وغیرہ لے جا سکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں نے ایک جنگی چال چلی۔ انہوں نے مشہور کر دیا کہ شمال میں ایک اور راستہ دریافت ہوا ہے۔ جہاں سے فوج دریا کے پار اتر سکتی ہے۔ اور سچ مچ ان کی فوج یہاں سے شمال کی طرف بڑھی۔ لیکن انہوں نے یہ ہوشیاری کی کہ بیس ہزار سوار فوج کو ایک کمین گاہ میں چھپا دیا۔ مسلمانوں کو شمال کی طرف بڑھتے دیکھ کر ہندو فوج بھی جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی۔ اور انہوں نے یہ غلطی کی کہ اس جگہ پر جہاں پہلے کیمپ تھا کوئی فوج

نہیں چھوڑی۔ ہندوؤں کو اس طرح مغالطہ میں ڈالکر اسلامی فوج تین دن تک آگے بڑھتی رہی۔ اور یکایک ایک شب میں کامل اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اسی جگہ واپس آگئی۔ جہاں سے چلی تھی۔ اسلامی فوج نے تین دن کا راستہ ایک ہی دن میں طے کر لیا۔ وہ اس جگہ پر شام کے وقت پہونچی۔ اور سر مغرب ان کے ہراولی دستہ نے جو کمیں گاہ میں چھپا ہوا تھا۔ دریا کو عبور کرکے جنوبی ساحل پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے روز یعنے ۲۴ر جنوری ۱۵۶۵ء کو مسلمانوں کی تمام فوج دریا کے پار اتر گئی۔ سب سے پہلے نظام شاہ نے دریا کو عبور کیا تھا۔"

سیول اپنی تاریخ " فرگاٹن ایمپائر" کے صفحہ ۱۹۹ پر لکھتا ہے :-

" موضع انگالگی کے قریب مسلمانوں نے دریا کو عبور کیا۔ اور اس میدان میں مقیم ہوئے جو موضع بیاپور یا بھوگا پور کے متصل ہے۔ اور اسی میدان میں جنگ ہوئی"

لیکن جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ جنگ موضع رکساس جی اور ٹنگڑی کے درمیانی میدان میں ہوئی۔ کنڑی اور مرہٹی تاریخوں میں اس جنگ کو رکساس ٹنگڑی کی جنگ کے نام سے ہی لکھا گیا ہے (تالیکوٹہ یہاں سے ۲۵ میل شمال میں ہے۔ مورخین حیران ہیں کہ جب میدان جنگ سے مقام تالیکوٹہ اس قدر دور ہے تو اس جنگ کو تالیکوٹہ کے نام سے کیوں منسوب کیا گیا ممکن ہے کہ مسلمان فوج کے عرصہ تک یہاں مقیم رہنے کی وجہ سے یہ نام مشہور ہوگیا ہو۔ یا یہ مواضعات تالیکوٹہ سے ملحق ہونے کی وجہ سے میدان جنگ کو تالیکوٹہ کا نام دیدیا گیا ہو۔)

ہندوؤں کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ بھی واپس پلٹے۔ لیکن اسلامی فوج دریا کو عبور کرکے کھلے میدان میں خیمہ زن تھی۔ ہندو بھی مقابل میں صف آرا ہوگئے۔

مسلمانوں نے جنگ سے بیشتر اتمام حجت کیلئے رام راج سے کہلا بھیجا کہ صلح کر لی جائے

لیکن اس نے مسلمانوں کی اس درخواست کو ان کی کمزوری پر محمول کرتے ہوئے نہایت نخوت سے سفیروں کو واپس بھیجدیا۔

میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۹ پر لکھتا ہے :۔

" رام راج ایک نہایت ذہین سیاست دان تھا۔ اس کو اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز تھی۔ وہ خود بھی کئی بار ان کا دوست اور دشمن بنا۔ اور وہ جانتا تھا کہ وقت پڑنے پر وہ اس کے خلاف ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ اپنی تمام شمالی سرحدوں کو ہمیشہ مستحکم کرتا رہا۔ لیکن یہی شخص جو ہمیشہ اپنے دشمنوں کی کمزوریوں پر نظر رکھکر فائدہ اٹھاتا رہا اور ہمیشہ ان کو ایک دوسرے سے لڑاتا رہتا تھا۔ اور ایک دوسرے میں حسد اور رقابت بڑھایا کرتا تھا۔ ایک لمحہ کیلئے اپنی قدیم پالیسی بھول گیا اور ایک ایسی جنگ میں مبتلا ہوگیا جس سے وہ واپس نہیں پھرا۔"

نماز صبح کے بعد مسلمان جنگ کے لئے تیار ہوئے اور اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دی میمنہ پر علی عادل شاہ۔ درمیان یا قلب میں حسین نظام شاہ۔ میسرہ پر ابراہیم قطب شاہ اور علی برید شاہ کی فوجیں تھیں۔ ان کے مقابل ہندو فوج میں میمنہ تمراج کے ماتحت تھا۔ میسرہ پر وینکٹ دری اور قلب میں رام راج تھے۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے حضریوں اور افسروں نے رام راج سے کہا کہ " آپ پالکی چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔" لیکن اس نے جواب دیا کہ " یہ تو جنگ نہیں۔ بچوں کا کھیل ہے۔ مسلمان ہمارے پہلے ہی حملے کی تاب نہ لاکر بھاگ نکلیں گے۔"

اسلامی فوج حملے کے لئے آگے بڑھی۔ ان کے تیر اندازوں اور شمشیر زنوں کو حکم تھا کہ وہ خاص طور پر ہندوؤں کے ہاتھیوں پر توجہ کریں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں کے بہت سے ہاتھی زخمی ہو گئے۔ جس سے ان کی صفوں میں ایک انتشار پیدا ہو گیا۔ رام راج نے جب یہ

دیکھا کہ مسلمان ہندوؤں کی کثرت سے ڈرتے نہیں ہیں۔ تو وہ پالکی چھوڑ کر ایک جواہر نگار شامیانے کے نیچے مرصع تخت پر بیٹھا۔ اور اپنے آگے اور داہنے بائیں سونا، چاندی اور دوسرے جواہرات کا ڈھیر رکھ لیا۔ اور اعلان کیا کہ جنگ میں جن لوگوں سے نمایاں بہادری کے کام ہوں گے انہیں بھاری انعام دیا جائیگا۔ ہندو فوج میں رام راج کی اس کارروائی سے ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ اور اس نے نہایت استقلال و مستعدی سے آگے بڑھ بڑھ کر حملہ کیا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کی فوج کا میسرہ اور میمنہ قلب سے جدا ہو گیا۔ جنگ کی اس حالت سے معلوم تو یہ ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کو کامل شکست ہو گی۔ اور اس کے آثار بھی پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن جس طرح مشرقی جنگوں میں پانسہ یکایک پلٹ جاتا ہے۔ اس جنگ میں بھی اسی طرح ہوا۔

مورخ ہیگ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۰ پر لکھتا ہے :۔

"علی عادل شاہ کا میمنہ قلب سے علٰحدہ ہو گیا۔ تو اس نے میدان جنگ سے ہٹ کر ہندو فوج کے پیچھے سے قلب پر حملہ کر دیا"

آگے چلکر یہی مورخ پھر لکھتا ہے :۔

"یہ حسین نظام شاہ کا استقلال تھا جس نے اس دن ناکامیابی کو کامیابی سے بدل دیا۔ مسلمانوں کی وہ فوج جو قلب میں حسین نظام شاہ کے ماتحت تھی نہایت استقلال سے دشمن کے حملوں کو روک رہی تھی۔ علی عادل شاہ کی فوج جو میمنہ پر تھی۔ علٰحدہ ہو چکی تھی۔ لیکن کشور خان بیجاپور کا جنرل کسی طرح حسین نظام شاہ کی فوجوں سے آکر مل گیا۔ حسین نظام شاہ نے اس وقت حکم دیا کہ وہ مشہور توپ جس کا نام "مالک میدان" ہے۔ حرکت میں لائی جائے۔ توپ میں تانبے کے

سے بھر کر ہندو فوج پر مارے گئے۔ توپ کے اس ہونک حملے سے ہندوؤں کا بڑھتا ہوا سیلاب نہ صرف رک گیا۔ بلکہ ہندو فوج میں انتشار پیدا ہو گیا۔ عین اس وقت مسلمان سواروں نے نہایت استقلال سے بڑھکر حملہ کیا۔ مہاراج یہ دیکھکر جلدی سے تخت چھوڑکر پالکی پر بیٹھ گیا۔ لیکن مسلمان سوار بالکل قریب پہونچ گئے تھے۔ انکے ایک ہاتھی نے پالکی پر حملہ کیا۔ جس سے خوف زدہ ہوکر پالکی بردار پالکی چھوڑکر فرار ہو گئے۔ ہاتھی سوار نے چاہا کہ مرصع پالکی کو اٹھالے۔ اور جب وہ پالکی اٹھانے کے لیئے جھکا تو ایک وفادار برہمن جو رام راج کے قریب تھا چیخ اٹھا کہ پالکی میں "مہاراج رام راج" ہے۔ اور اگر ان کو بچا لیا جائے۔ تو اس مسلمان کو دولت وجیانگر کا ایک بڑا افسر بنا یا جائیگا۔ مسلمان مہاوت کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے قبضہ میں کس کی شخصیت آرہی ہے تو اس نے ہاتھی کو اشارہ کیا۔ ہاتھی نے رام راج کو سونڈ میں اٹھاکر مہاوت کو دیدیا۔ اور اس نے پلٹ کر اس کو احمد نگر کے سردار رومی خاں کے پاس لیجاکر پیش کر دیا۔ رومی خاں نے رام راج کو حسین نظام شاہ کے پیش کیا۔ حسین نظام شاہ نے فوراً اس کو قتل کر کے اس کے سر کو نیزہ پر چڑھا کر فوج کے آگے آگے گشت کرایا۔ ہندو فوج نے جب اپنے راجہ کا سر دیکھا تو اس پر ایک ہیبت طاری ہو گئی۔ فوج میں کھلبلی پیدا ہو گئی اور اس نے فرار ہونا شروع کر دیا۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا۔ اور اس سختی سے کیا کہ میدان جنگ میں ایک لاکھ ہندو مارے گئے"۔

میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۶۹ پر لکھتا ہے :-

"۲۵ جنوری ۱۵۶۵ء کے دن دوپہر کو ہندوؤں نے جنگ شروع کی ۔

ونکٹ وری نے بحیثیت کماندار اعلیٰ اپنی فوج سے علی عادل کی فوج پر حملہ کیا
ونکٹ وری کے ماتحت ۲ لاکھ پیادے ۔ ۲۵ ہزار سوار اور ۵۰۰ ہاتھی تھے
گولہ باری سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچا۔ اور وہ بہ ظاہر پیچھے ہٹ
گئے ۔ جلد ہی عام لڑائی شروع ہوگئی ۔ ترملا نے جس کی کمان میں دایاں بازو
تھا ۔ گولکنڈہ اور بیدر کے مسلمانوں پر حملہ کیا ۔ وہ اور اس کا بیٹا رگھوناتھ
نے بہت سے مسلمانوں کو قتل کیا ، گولکنڈہ اور بیدر والے سخت نقصان اٹھاکر
پسپا ہوئے ۔ لیکن جنگ میں رگھوناتھ مارا گیا ۔ اور ترملا کی ایک آنکھ ضایع ہوگئی
رام راج کو جب یہ خبر پہونچی تو اس کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی ۔ اس نے پالکی چھوڑ
کر گھوڑے پر سوار ہوکر "گرہ ڈا گروڈا" کا جنگی نعرہ لگایا ۔ اور اتحادی
فوج پر حملہ کیا ۔ گولکنڈہ ، بیجاپور ، اور بیدر کی فوجیں اس حملہ کی تاب نہ
لاسکیں ۔ اسکے بعد اس نے احمد نگر کی فوج پر جو قلب میں متعین تھی ۔ دس ہزار
سواروں سے حملہ کیا ۔ یہ حملہ اس بے جگری سے ہوا کہ احمد نگر کی فوج قریباً آدھے
کوس تک پیچھے ہٹ گئی ۔ رام راج کا باڈی گارڈ رام راج کے اس حملہ کو دیکھکر
گھوڑوں سے اتر کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوا ۔ اور کئی مسلمانوں کو قتل کیا ۔ اس
عرصہ میں علی عادل نے جو پیچھے ہٹ گیا تھا ۔ عقب سے حملہ کیا ۔ اور نظام شاہ
نے اپنی فوجوں کے ساتھ ۔ لڑائی اس وقت میدان جنگ کے قلب میں ہورہی
تھی ۔ اس وقت رومی خاں کی توپوں نے اپنا کام شروع کیا ۔ اس کا اثر ایسا
مہلک پڑا ۔ کہ ہندوؤں کی فوج کا سیلاب جو آگے بڑھ رہا تھا سخت نقصان
اٹھاکر پیچھے ہٹنا شروع ہوا ۔ عین اس موقع پر حسین نظام نے اپنی فوجوں کو

کو ایک حملہ کیا۔ اور آپ خود فوج کے آگے اپنا شامیانہ نصب کیا۔ جس سے مقصد تھا کہ سلطان فتح یا موت پانا چاہتا ہے۔ رام راج یہ دیکھ کر اس وقت گھوڑے سے اتر کر تخت پر بیٹھا۔ اور اپنے سامنے تخت پر ہیرے جواہر اور سونے کے ڈھیر لگا دئے۔ اور اعلان کیا کہ جو شخص بہادری دکھائیگا۔ انعام پائیگا۔ یہ اعلان سن کر ہندو فوج پھر آگے بڑھی۔ رومی خاں نے اس وقت کی سب سے بڑی توپ "مالکِ میدان" میں تانبے کے سکے بھر کر چلائی۔ ایک ہی وقت میں پانچ ہزار ہندو گرے۔ ہندو فوج فرار ہونے لگی۔ ان میں ابتری پھیل گئی۔ جنرل کشور خاں (بیجا پور) نے بھی اسی وقت حملہ کیا۔ جس سے ہندو فوج کا قلب کامل طور پر منتشر ہو گیا۔ ایسے وقت میں رام راج کی فوج میں جو دو مسلمان جنرل تھے۔ وہ رام راج کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں سے آ ملے۔ اس سے ہندوؤں کے دل اور بھی چھوٹ گئے۔ ہندو جنرل اپنی فوج کو سنبھالنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ نہیں سنبھل سکی"۔

میسور گزیٹیر کی روایت میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس نے شکست کی وجہ مسلمان جنرلوں کی غداری بتلائی ہے۔ اور اسی پر اپنا پورا زور صرف کر دیا ہے۔

میسور گزیٹیر کے صفحہ ۲۰۷ پر لکھا ہے:۔

" رام راج کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر دو مسلمان جنرل رام راج کا ساتھ چھوڑ کر دشمن سے مل گئے۔ یہ غداری بقول ریورنڈ ہیراس صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ جنگ کی قسمت یکایک کیوں پلٹ کر رہ گئی۔ ہیراس نے یہ روایت سیزر فریڈرک سے لی ہے۔ جس نے اس جنگ کے ایک سال بعد جب وہ

وجیانگر آیا ہوا تھا تو سنی تھی"

نہایت تعجب ہے کہ میسور گزیٹیر کے مصنف کو ایک سنی سنائی بات پر تو یقین آ جائے۔ اور یقین نہ آئے تو اسلامی مورخوں کی روایات پر اور خصوصاً فرشتہ کی تاریخ پر۔ فرشتہ اس زمانہ میں بیجا پور میں موجود تھا۔ اس کو جو اطلاعات ملی تھیں وہ بالکل صحیح ملی تھیں۔ اور ممکن ہے کہ وہ میدان جنگ میں بھی موجود ہو۔ اسکی دیانت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے آقا علی عادل کی رعایت بھی نہیں کرتا۔ اس جنگ کی فتح کا سہرا اس نے حسین نظام شاہ کے سر باندھا ہے اگرچہ یہ اس کیلئے آسان تھا کہ اپنے آقا کو خوش کرنے کے لئے حسین نظام شاہ کے نام کو نظر انداز کر دے۔

سیرز فریڈرک کی اس سنی سنائی روایت کو نقل کرنے اور اس پر زور دینے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یعنے جنگ سے پونے چار سو سال بعد فتح کا سہرا بزور قلم مسلمانوں سے چھین لیا جائے۔ اگر سیرز فریڈرک کی اس سنی سنائی روایت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو دیکھنا یہ ہے کہ

(۱) کرشنا دیورایا اور رام راج کے سلوک کو دیکھتے ہوئے کسی مسلمان کا وجیانگر کی ملازمت میں رہنا ممکن تھا یا نہیں۔

(۲) کیا رام راج کی ذہنیت کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ اس نے اس قدر بڑے عہدے مسلمانوں کو دے رکھے ہوں۔

(۳) کیا مسلمان وجیانگر میں آباد تھے۔ کسی تاریخ میں یہ ذکر نہیں ہے کہ کرشنا دیورا کے عہد میں مسلمانوں کو جلا وطن کرنے کے بعد پھر انہیں وجیانگر کے حدود میں آباد کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

ان سوالات کا جواب جب تمام تاریخیں نفی میں دیتی ہیں۔ تو میسور گزیٹیر کا اس روایت پر زور دینا یقیناً حیرت انگیز ہے۔ میسور گزیٹیر کے مصنف نے ان دو مسلمان جنرلوں میں سے ایک کا نام عین الملک بتلایا ہے۔ اب اگر یہی مصنف اپنی کتاب کے اگلے صفحات الٹ کر دیکھے تو اس کو معلوم ہوگا کہ وہ خود لکھ آیا ہے کہ عین الملک جو گولکنڈہ کا ایک سردار تھا۔ اس کی وفات اس جنگ سے تیس سال پیشتر ہو چکی تھی۔ اور وہ کبھی وجیانگر کی ملازمت میں نہیں تھا۔

اب اس سنی سنائی اور فرضی روایت کو چھوڑ کر ہندوؤں کی شکست کے اصلی اسباب کو دیکھا جائے تو وہ دو ہیں۔

(۱) رومی خاں کی توپ کی گولہ باری۔ اور

(۲) رام راج کا قتل

مشرقی جنگوں میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے اور یہی اس جنگ میں بھی ہوا۔ رام راج کا سر نیزے پر دیکھتے ہی ہندو فوج میں ابتری پھیل گئی۔ اور ساتھ ہی رام راج کے بھائی وینکٹ دری اور ترملا کے فرار نے رہی سہی ہمت توڑ دی۔ وینکٹ دری اور ترملا اس جنگ میں زخمی ہو گئے تھے۔ ترملا کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو چکی تھی۔ اس لئے ان پر اس قدر خوف و ہراس چھا گیا تھا کہ انہیں سوائے فرار ہونے کے اور کچھ نہ سوجھی۔ اگر وہ چاہتے تو وجیانگر میں قلعہ بند ہو کر لڑ سکتے تھے۔ یا ان پہاڑیوں میں مدافعت کا سامان ہو سکتا تھا۔ جو وجیانگر کو گھیری ہوئی تھیں۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ہندوؤں پر اس قدر خوف و ہراس طاری ہو گیا کہ سوائے فرار ہونے کے انہوں نے اور کچھ سوچا ہی نہیں۔ میدان جنگ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ایک لاکھ ہندوؤں کی لاشیں اس میں

پڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ ہیبت ناک نظارہ تھا جس نے تریلا اور ونکٹ دری اور تمام ہندوؤں
کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

مقتولین جنگ کی تعداد

فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

" اس جنگ میں ہندو مقتولین کی تعداد ایک لاکھ تھی۔"

مورخ ہیگ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۱ پر لکھتا ہے :-

" ہندوؤں نے شکست کھا کر میدان چھوڑ دیا۔ فاتحین نے قتل عام کرتے ہوئے
انکا تعاقب کیا، مقتولین کی تعداد ایک لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔"

لیکن میسور گزیٹیر کا مصنف برہان ماثر کی روایت پر زور دیتا ہوا لکھتا ہے :-

" یہاں جنگ میں ہندو مقتولین کی تعداد کل نو ہزار تھی۔"

تعجب ہے کہ میسور گزیٹیر کے مصنف نے برہان ماثر کی روایت کو تسلیم کر لیا ہے۔
اگر برہان ماثر کی روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو تریلا اور ونکٹ دری کی ذہنیت
پر تعجب ہوتا ہے۔ کہ لاکھوں کی فوج کو زیر کمان رکھتے ہوئے صرف نو ہزار ہندوؤں کے قتل
ہوتے ہی وہ میدان جنگ کو چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ایک دوسری جگہ میسور گزیٹیر کے مصنف کو
اقرار ہے :-

" رومی خاں نے " مالک میدان" توپ کو چلایا تو پانچ ہزار ہندو مارے گئے۔"

(میسور گزیٹیر صفحہ ۲۰۷)

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر کثیر فوج میں اور چار ہزار ہندو قتل ہونے سے بھگدڑ کیوں

پڑ گئی۔ اگر ان روایات کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے تاریخ اور جنگ کے نتیجہ میں کچھ فرق نہیں آتا۔ یہی ماننا پڑیگا کہ رام راج کا سر دیکھتے ہی ہندو فوج نے ہمت ہار دی تھی۔

اس طرح جنوبی ہند کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی مہیب جنگ کا فیصلہ اور جنوب میں ہندوؤں کی طاقت کا ہمیشہ کے لئے ۲۵ / جنوری ۱۵۶۵ء کے دن خاتمہ ہوگیا۔

ترملا اور ونکٹ دری کی فراری

یہ لکھا جا چکا ہے کہ رام راج کا سر دیکھتے ہی ہندو فوج میں بھگڈر پڑ گئی۔ اور ترملا اور ونکٹ دری میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔

میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۷۵ پر لکھتا ہے:-

" معلوم ہوتا ہے کہ میدان جنگ کی حالت دیکھتے ہوئے ترملا پائے تخت کو چلا گیا۔ ونکٹ دری بھی بچ گیا۔ ان کی اس فراری کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن بعد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ونکٹ دری چندرگیری کے قلعہ کو چلا گیا۔ اور وہاں سے ترپتی کو۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان بھائیوں نے جدا ہونے سے پیشتر آئندہ کارروائی کے متعلق سمجھوتہ کر لیا تھا۔"

پھر یہی مصنف صفحہ ۲۰۷۶ پر لکھتا ہے:-

" اس سمجھوتہ کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس پر عمل بھی کیا۔ ونکٹ دری اپنے تعاقب کرنے والوں سے بچتا ہوا چندرگیری اور وہاں سے ترپتی پہونچا۔ کہ بادشاہ کا استقبال کرے۔ ترملا پائے تخت پہونچکر خزانہ اور بادشاہ کو منتقل کرنے کا انتظام کیا۔"

ہند و تاریخ رام رچھو کا مصنف لکھتا ہے :۔

"مسلمانوں نے ونکٹ دری کو بھی گرفتار کرنے کوشش کی۔ لیکن وہ انکے ہاتھ نہ آیا"

ریورنڈ ہراس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :۔

"جنگ کا نقشہ بدلتے ہی ترملا اور ونکٹ دری فرار ہو گئے"

رئیس لکھتا ہے :۔

"وجیانگر پہونچکر ترملا نے جو کچھ زر و جواہر اور خزانہ لیجا سکا۔ لیکر جنوب کی طرف پلگنڈہ کو چلا گیا"

ان روایات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ترملا اور ونکٹ دری میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔

اب رہی میسور گزیٹیر کے مصنف کی یہ روایت کہ میدان جنگ کی یہ حالت دیکھکر انہوں نے آپس میں کوئی سمجھوتہ کرلیا اور فرار ہوئے۔ اور بعد میں اس پر عمل بھی کئے۔ بالکل غلط ہے۔ واقعات ثابت کر رہے ہیں کہ ترملا اور ونکٹ دری کا فرار کسی سمجھوتہ کے ماتحت نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے الگ الگ راہ فرار اختیار کی۔ ونکٹ دری جو فرار ہوا تو سیدھا چندرگیری پہونچا۔ ممکن ہے کہ بعد میں وہ ترپتی کو بھی گیا ہو۔ لیکن ترملا فرار ہوکر سیدھا وجیانگر پہونچا اور یہاں سے جو کچھ مل سکا لے لیا۔ اور ساتھ ہی راجہ سداسیورایا کو جو ۲۳ سال سے قید میں تھا۔ لیکر پلگنڈہ چلا گیا۔ اگر ترملا اور ونکٹ دری میں کوئی سمجھوتا ہوا ہوتا تو ترملا کو چندرگیری جانا تھا۔ اس کے عوض وہ پلگنڈہ جا پہونچتا ہے۔

میسور گزیٹیر کے اس روایت کی تردید فرشتہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ "ونکٹ دری نے چندرگیری پہونچکر سلاطین اسلام سے صلح کی درخواست کی تھی"

بہر طور ونکٹ دری اور ترملا میدان جنگ سے فرار ہوئے اور ان کے ساتھ ہی ہندو

فوج بھی فرار ہونا شروع کی۔ مسلمانوں نے میدان جنگ میں تھوڑی دور تک ہندوؤں کا تعاقب کیا۔ اور بعد میں پلٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔

فرشتہ لکھتا ہے :-

"بہادران اسلام نے کفار کے لشکر ہزیمت خوردہ کا پیچھا کیا۔ اور تیغ یمانی سے اس قدر مشرکوں کی سرافشانی کی کہ ان تیرہ بختوں کے خون سے زمین نے رنگ لعل رمانی قبول کیا۔ اور بروایت مشہور عدد کشتوں کے تین لاکھ پہونچے تھے۔ اور بقول صحیح لاکھ کافر کے قریب اصل معرکہ اور تعاقب کے وقت تہ تمشیر ہو کر قتل ہوئے۔ جیساکہ مقام جنگ سے اناگندی تک جو دس کوس بیجانگر سے ہے جا بجا لاشیں پڑی تھیں۔ دامن صحرا کفار کے لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور مال وافر اور خزانہ بے شمار از زر و جواہر، تیغیں و ڈھالیں اور کمانیں دمشقی اور نیزہ خطی اور اسپ و شتر اور خیمہ و خرگاہ اور کنیز و غلام اس قدر غنیمت عساکر نصرت ماثر کے ہاتھ آئے کہ بحر و کان کے مانند مستغنی اور بے نیاز ہوئے۔ اور سلاطین دین پناہِ اسلام سے فرمان واجب الاذعان صادر ہوئے کہ فیل کے سوا جو شے جس کے ہاتھ آئے وہ اس کا مالک و مختار ہے۔"

ادہر تو مسلمان میدانِ جنگ میں مالِ غنیمت جمع کرنے اور فتح کے جشن منانے میں مصروف تھے اور ادہر وجیانگر میں جب مفرورین جنگ آنے لگے تو سراسیمگی پھیل گئی۔

برہان ماثر کا مصنف لکھتا ہے :-

" رام راج کی تمام دولت فاتحین کے ہاتھ لگی۔ بے حساب کنیز و غلام کے علاوہ ہاتھی اور اونٹ، خیمہ و خرگاہ اور زر و جواہر اس قدر ہاتھ لگے کہ تمام مسلمان مالا

مال ہو گئے ۔"

اس طرح دس دن تک مسلمان مال غنیمت حاصل کرنے میں مصروف رہے ۔ اور سلاطین دکن فتح کا جشن منا رہے تھے ۔ ادھر ترملا کو موقع مل گیا کہ وجیا نگر کو پہونچکر جو کچھ زر و جواہر اور خزانے تھے نکال کر ساتھ لے جائے ۔

جنگ کا نتیجہ اور وجیا نگر کی تباہی کے حالات لکھنے سے پیشتر ضروری ہے کہ رام راج کے دوسرے حالات لکھکر اس باب کو ختم کر دیا جائے ۔

رام راج کا عہد ہندو نقطۂ نظر سے ایک تابناک عہد تھا ۔ اس نے اپنے خسر دیورایا کی پالیسی پر پوری طرح کاربند رہا ۔

رام راج کا عہد جس طرح جنگی کارناموں سے بھرا ہوا ہے اسی طرح اس زمانہ میں اس نے فنون لطیفہ، علم موسیقی اور شاعری کو بھی ترقی دی ۔ اس کے عہد میں بہت سے مشہور ہندو شاعر گذرے ہیں ۔ کنٹری زبان کا ہندو شاعر پرندرو اسا اسی زمانے میں وجیا نگر میں تھا ۔ رام راج نے ملک کے اندر رفاہ عام کے بہت سے کام کئے ۔ اور بے شمار مندریں تعمیر کرائیں ۔ جس کی وجہ سے آج بھی جنوبی ہند کے ہندو اس کے عہد کو رام راج کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ۔

اکثر ہندو مورخین لکھتے ہیں ۔

" رام راج کی عمر اس کے قتل کے وقت ۸۰ سال کی تھی ۔ رام راج ایک سخت طبیعت کا حکمراں تھا ۔ جس بات پر اڑ جاتا تھا ۔ اس کو پورا کئے بغیر چین نہ آتا ۔ اس نے ملک کے جائز وارث سداسیو رایا کو قید میں رکھکر سلطنت غصب کر لی لیکن اسکی یہ کارروائی ملک کے بہترین مفاد کے لئے تھی ۔ اس نے وجیا نگر کی شہرت و

عظمت کو چار چاند لگا دئیے"۔

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :۔

" دنیا میں غاصبوں کو الزام دینے سے پیشتر اگر ان کے کارناموں کو دیکھا جائے تو انہوں نے اپنے ملک و قوم کو کس بام ترقی پر پہونچایا تو یہ الزام کوئی وقعت نہیں رکھتا"

جنگ کے بعد وجیانگر کی تباہی

ادہر میدان جنگ میں یہ قیامت آفریں معرکہ ہو رہا تھا۔ ادہر شہر وجیانگر آنیوالی تباہی سے بے خبر اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ وجیانگر میں کسی ہندو کو بھی اس بات کی امید نہیں تھی کہ میدان جنگ میں ہندوؤں کو شکست ہوگی۔ لیکن جب مفرورین جنگ آنے لگے تو شہر میں ایک سراسیمگی پھیل گئی۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شہر کے بدمعاش اور قرب و جوار کے دیہاتیوں نے لوٹ شروع کردی۔

رونڈ ہراس لکھتا ہے :۔

" ترملا نے جاتے ہوئے شہر میں حفاظت کے لئے کوئی فوج نہیں چھوڑی تھی"

میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۷۹ پر لکھتا ہے :۔

" یہ صحیح نہیں ہے کہ ترملا نے کوئی فوج شہر کی حفاظت کے لئے نہیں چھوڑی تھی۔ فوج تھی۔ لیکن اس پر خوف وہراس اس قدر طاری تھا کہ وہ کچھ نہ کرسکتی تھی۔ اس لئے دیہاتیوں نے جنہیں بنیڈر کہا جاتا ہے۔ حملہ شروع کردیا۔ اور جو کچھ امرا کے مکانات میں مال و خزانہ مل سکا۔ لوٹ کرلے گئے۔ ان کی اس لوٹ سے عام دوکاندار اور

خبری بھی نہ بچ سکے۔"

پرتگالی مورخ کوڈو اور مورخ سیول لکھتے ہیں :۔

"بنیڈروں نے شہر پر چھ دفعہ حملہ کیا تھا۔"

فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :۔

" بیراگیوں نے شہر کو لوٹنا شروع کیا۔"

مولوی بشیرالدین احمد دہلوی اپنی تاریخ بیجانگر میں لکھتے ہیں :۔

" یہ جنگ کاہے کو تھی۔ بلکہ ایک طوفان عظیم کی رَو تھی۔ کہ جو اس کے سامنے آگیا اس کو بہا گئی۔ سب امیدوں کا خاتمہ ہوگیا۔ شہر کے باشندے جو لاکھوں ہی تھے۔ بے یارو مددگار رہ گئے۔ سوائے چند کے ان بیچاروں کو بھاگنے کا موقع بھی نہ ملا۔ کیونکہ باربرداری کے بیل، گاڑیاں سب کی سب فوج کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ جو اب تک واپس نہیں آئی تھیں۔ ایسی حالت میں سوائے اس کے بَن نہ پڑی کہ خزانوں کو زمین میں گاڑ دیا۔ اور بوڑھے اور عورتوں اور بچوں کے سوا نئے جوانوں نے ہتھیار سنبھال لیے۔ اور اس آنے والی مصیبت کے منتظر ہو کر بیٹھ گئے۔ دوسرے دن بیجانگر کے اطراف کی جنگلی اقوام اور لٹیروں نے آکر شہر کو لوٹنا شروع کیا۔ بنجاروں (اقوام خانہ بدوش) لمباڑوں، کوروؤں اور اسی قسم کے لٹیروں کے گروہ کے گروہ بدنصیب باشندگان شہر پر آن پڑے۔ اور مال و اسباب، دکانوں اور بازاروں کو لوٹ گھسوٹ کر ساری دولت لے گئے۔"

پرتگالی مورخ کوڈو لکھتا ہے :۔

" فتحیاب مسلمان زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے دس دن تک میدان جنگ میں ٹھیرے

رہے۔ اور چند روز آرام لیا۔ اس کے بعد بیجانگر کا رخ کیا۔ اور اس دن سے لگا تار پانچ مہینے تک لوٹ مار کا بازار گرم رہا۔ لوگوں نے اپنا اپنا مال زمین میں گاڑ دیا تھا۔ اور بچا کچھا باؤلیوں میں ڈال دیا تھا۔ لشکریوں نے مکان کھودنے اور جلانے شروع کئے۔ ایک روز نظام شاہ بطور سیر سوار ہو کر نکلا۔ دیکھا کہ ایک جگہ چند لشکریان علی عادل شاہ ایک طبق مروارید و جواہر سے بھرا ہوا سامنے ہوئے تقسیم پر لڑ رہے ہیں۔ نظام شاہ کی فوج نے چاہا کہ ہم بھی حصہ لیں۔ دونوں کی آپس میں لڑائی ہونے لگی۔ دونوں طرف کے آدمی مارے گئے۔ اور زخمی ہوئے۔ یہ حالت دیکھکر نظام شاہ نے ارکان دولت سے کہا کہ آپس میں لڑنے بھڑنے سے کیا فائدہ بہتر یہ ہے کہ شہر کو جلا دو۔ تاکہ قضیہ فساد موقوف ہو۔ چنانچہ حکم شاہی کے موافق شہر کی تمام بڑی بڑی عمارتوں کو اور شہر کے اطراف میں بیس کوس تک قصبات کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ الغرض دشمن بے رحمی سے برابر لوٹ مار کرتے رہے جو ملا۔ اُسے قتل کیا۔ مندروں اور محلات کو مسمار کر دیا۔ خصوصاً راجہ کے محلات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ان کی دست برد سے صرف چند بڑے سنگ بست مندر اور کہیں کہیں چار دیواریاں باقی رہ گئیں۔ جہاں ایک زمانے میں یہ چہل پہل تھی۔ اور سر بفلک عمارتیں کھڑی تھیں۔ اب وہاں صرف کھنڈر اور مٹی کے ٹیلے دکھائی دیتے ہیں۔ مسلمانوں نے تمام بت توڑ ڈالے۔ اور نرسہوان کے بڑے بت کے بھی دونوں بازو اڑا دئے۔ مختصر یہ کہ کوئی چیز ان کے ہاتھ سے بچ نہ سکی۔ ان لوگوں نے اس بڑے منڈپ کو جو ایک بلند چبوترے پر واقع تھا۔ جہاں سے بڑے بڑے تہوار دہیں تماشہ دیکھا جاتا تھا۔ توڑ کر زمین کے

برابر کر دیا۔ اور تمام نقش و نگار والے پتھروں کو اکھیڑ کر پھینک دیا۔ ان لوگوں نے آراستہ اور شاندار و شل سوامی کے دیول میں جو دریا کے کنارے واقع ہے بڑے بڑے انبار آگ کے لگا دیئے۔ اور بے نظیر اور قابل دید پتھر کی صناعی کو برباد کر دیا۔ الغرض آگ اور تلوار، درانتی اور کلہاڑیوں سے ہر روز شہر کی تباہی اور بربادی کرتے رہے۔"

سیول اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

" شہر کے مندروں میں جس قدر بت تھے۔ مسلمانوں نے انہیں توڑ دیا۔ مسلمان انتقام لینے کے لئے آئے تھے۔ اور انہوں نے پوری طرح انتقام لیا۔"

ہراس لکھتا ہے:۔

" وجیا نگر کی موجودہ حالت سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ تمام مسلمانوں کی لائی ہوئی تھی یا امتداد زمانہ نے بھی اپنا کام کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے شہر میں رہنے کے لئے پھر جدید عمارات تعمیر کرنی شروع کیں۔ لیکن بعد میں ان کو ادھورا چھوڑ کر چلے گئے۔ آج جو شکستہ دیواریں نظر آتی ہیں۔ وہ مسلمانوں کی یادگار ہیں۔ ورنہ ہندو تعمیرات سے مسلمانوں نے کچھ بھی باقی نہیں رکھا۔"

اطالوی سیاح سیزر فریڈرک جو اس تباہی کے دو سال بعد وجیا نگر میں آیا تھا۔ لکھتا ہے:۔

" میں نے دنیا کے اور شاہی محلات کو بھی دیکھا ہے۔ لیکن وجیا نگر کے شاہی محل کی ہمسری کوئی محل بھی نہیں کر سکتا۔ اس محل کے نو دروازے ہیں۔ کھنڈرات میں اب بھی وتھوبا کا مندر، ہاتھیوں کا اصطبل اور حرم سرا کے غسل خانے پائے جاتے ہیں۔ یہ کھنڈرات ایک وسیع رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور یہاں پھرتے ہوئے یہ تصور بھی



وجیانگر کے کھنڈرات (کونسل ہال)



وجیانگر کے کھنڈرات (مندریں)

نہیں ہو سکتا کہ گذرے ہوئے زمانے میں اس کی شان وشوکت کیا ہو گی۔ کس طرح اس زمانے میں جب فن تعمیر بالکل محدود تھا۔ بڑی بڑی چٹانیں زمین سے صدہا قدم اونچی اٹھا کر اپنی جگہ پر موزونیت سے رکھی گئی تھیں۔ اس شہر خموشاں کی اس وقت کیا عظمت ہو گی۔ جبکہ عظیم المرتبت راجاؤں کا جلوس اس کی بھری ہوئی گلیوں سے گذرتا ہو گا۔ اور چاؤش صدا دے رہے ہوں گے۔"

وجیانگر کی تباہی کے متعلق ایک اور نظریہ

یوں تو ہر تاریخ یہی بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے وجیانگر کو کامل طور پر تباہ کر دیا۔ اس کے مندر اور عمارتیں نہ صرف ڈھا دی گئیں۔ بلکہ آگ بھی لگا دی گئی۔ لیکن یہ نہایت تعجب سے دیکھا جائیگا کہ مورخ ہراس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ "فاتح مسلمانوں کے جانے کے بعد ترملا پھر وجیانگر میں آکر اسی قدیم شاہی محل میں مقیم ہوا۔" اس کی تصدیق سیزر فریڈرک کے سیاحت نامہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "محل اسی حالت میں ہے جس طرح کہ پہلے تھا۔"

میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۸۵ پر لکھتا ہے:۔

"کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ترملا نے پھر اس شہر کو آباد کرنا چاہا۔ لیکن ترملا کی حرص اور ناقابلیت اس شہر کو آباد نہ کر سکی۔"

ان روایات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے سوائے شاہی محل اور بیاپتی کے مندر کے باقی تمام شہر کو تباہ کر دیا تھا۔ شاہی محل اس لئے محفوظ رہا کہ سلاطین اسلام اس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

رور نڈ ہراس لکھتا ہے:۔

"مسلمان جب پورے شہر کو تباہ کر چکے تو انہوں نے پھر اس کو اپنی طرز پر آباد کرنا چاہا۔ اور عمارتیں پھر تیار ہونی شروع ہوئیں۔ لیکن بعد میں مسلمان انہیں ادھورا چھوڑ کر چلا گئے۔"

بعد میں جب ترملا نے اس شہر کو آباد کرنا چاہا تو یہ اس کے بس کی بات نہ رہی۔ ممکن ہے کہ یہ دیکھکر ترملاہی نے شہر کو پوری طور پر جس طرح آج نظر آرہا ہے۔ برباد کر دیا ہو۔ اور رہی سہی کمی زمانے کے زبردست ہاتھوں نے پوری کر دی۔

بہرطور وجیانگر تباہ ہو گیا اور اس کو تباہ ہوئے آج پونے چارسو (۳۷۵) سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ یہ عالیشان شہر اس طرح تباہ ہوا کہ پھر پنپ نہ سکا۔ دنیا میں ہزارہا شہر آباد ہوئے اور مٹ گئے۔ قانون قدرت ایک وقت مقررہ تک ہر قوم اور ہر آبادی کو مہلت دیتا ہے۔ یہی مہلت وجیانگر کو بھی ملی تھی۔ اور جب وقت آگیا تو وجیانگر بھی اس طرح برباد ہوا کہ آج تصور میں بھی اس کی شان وشوکت اور عظمت وصولت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی آباد گلیاں۔ اس کے بھرے ہوئے بازار، اس کی فلک بوس عمارتیں، اس کے عالیشان معابد سب خاک میں مل گئے۔ وہ گلیاں جہاں چلنے والوں کو کثرت آبادی سے راستہ ملنا دشوار ہو جاتا تھا۔ وہ بازار جہاں دنیا بھر کی نعمتیں میسر تھیں۔ وہ عمارتیں جہاں خوشی وسرور کے نغمے ہمیشہ بلند رہا کرتے تھے۔ وہ معابد جہاں حسین وجمیل دیو داسیوں کے پرے کے پرے ناچ گا کر کوہ قاف کی پریوں کا نظارہ پیش کرتے تھے۔ سب مٹ گئے۔ ہندو قوم کا یہ عروس البلاد، ان کی تمدن ومعاشرت کا یہ گہوارہ، ان کے مذہب کا یہ محافظ شہر تباہ ہو گیا۔ اور اس طرح تباہ ہو گیا کہ اس کے ویران کھنڈروں میں جاتے ہوئے بھی روح کانپتی ہے۔

وجیانگر کی اس عبرتناک حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے رور نڈ ہیراس اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۶ پر

لکھتا ہے :-

"اگر مسلمان سلاطین اس شہر کو تباہ نہ ہونے دیتے تو تاریخ میں وہ ایک روشن زمانہ چھوڑ جاتے۔ اسی طرح جیسے کرشنا دیوا نے رائچور میں کیا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے دل جوش انتقام سے بھرے ہوئے تھے۔"

ہراس نے ان سطور کو لکھتے وقت بیجاپور کو بالکل فراموش کر گیا ہے کہ کرشنا دیورایا نے اس شہر سے کیا سلوک کیا تھا۔ اور بعد میں رام راج کے عہد میں احمدنگر پر ہندوؤں نے کس قسم کی تباہی لائی تھی۔ الزام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے مندروں کو توڑ دیا۔ اور شہر کو آگ لگا دی۔ کیا بیجاپور میں کرشنا دیورایا نے مسجدوں کو توڑ کر ہل نہیں چلا دیا تھا۔ کیا احمدنگر میں رام راج نے آگ نہیں لگائی تھی۔ یہ فطرت انسانی ہے کہ انتقام لے۔ اس لئے اگر مسلمانوں نے وجیانگر کو اپنے جوش انتقام میں تباہ کر دیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

وجیانگر کی تباہی کا اثر

وجیانگر کی تباہی سے جنوبی ہند کی سیاسی تاریخ میں جو انقلاب آیا۔ اس پر رائے زنی کرتے ہوئے میسور گزیٹیر کا مصنف صفحہ ۲۸۷ پر لکھتا ہے :-

(۱) اس تباہی نے ہندو طاقت کو جنوب میں ہمیشہ کے لئے توڑ دیا۔ ہندو ریاست برائے نام اور ایک صدی تک دوسرے خاندان میں رہی۔

(۲) آہستگی سے لیکن یقینی طور پر مسلمانوں کو جنوب پر حملہ آور ہونے کا راستہ کھل گیا۔

(۳) ایک مضبوط سلطنت یعنے مرکز کے نہ ہونے سے جنوب میں ہر جگہ چھوٹی چھوٹی خود

مختار ریاستیں پیدا ہو گئیں۔

(۴) وجیا نگر کے زوال کے ساتھ ہی پرتگالیوں پر بھی زوال آ گیا۔ جن کی تجارت اس ملک میں ایک وسیع پیمانہ پر ہوتی تھی۔ علاوہ دوسری اشیا کے صرف گھوڑوں کی تجارت سے انہیں ۱½ لاکھ ڈوکٹ (ایک پرتگالی سکہ) سالانہ وصول ہوتے تھے۔ ہر سال جنوبی ہندوستان سے پانچ لاکھ طلائی پگوڈا پرتگال کو بھیجے جاتے تھے۔

پرتگالی مورخ کوٹو لکھتا ہے :-

"سلطنت وجیا نگر کی تباہی سے گوا کی تجارت بھی تباہ ہو گئی۔ ہماری تجارت کا دارو مدار اسی سلطنت پر تھا۔ سلطنت وجیا نگر کی تباہی کیا ہوئی گویا ہماری بربادی تھی۔ کہ اس دن سے گوا کے باشندوں کی مرفہ حالی کا خاتمہ ہو گیا!"

وجیا نگر کی تباہی کو اگر سیاسی نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانوں نے سوائے اپنی توہین کا انتقام لینے کے اور کچھ نہیں کیا۔ جنوب کا وسیع ملک راس کماری تک کھلا ہوا تھا۔ اگر اس وقت وہ بڑھ کر قبضہ کر لیتے تو بعد میں ان کے جانشینوں کو جو مشکلات اس ملک کے فتح کرنے میں پیش آئیں۔ وہ پیش نہ آتیں۔ وجیا نگر سے ان کی واپسی سے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے جنوب میں ایک ناقابل تلافی نقصان پہونچا۔ اور ملک ایک ایسی خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا جو صدیوں تک جاری رہی۔

سر/۱۵

خاندانِ اراویدو

ترملا

۱۵۶۵ء تا ۱۵۷۲ء

معاصرین :- علی عادل شاہ (بیجاپور) مرتضیٰ نظام شاہ (احمدنگر)

گزشتہ سطور میں بتلایا جا چکا ہے کہ ترملا میدان جنگ سے فرار ہو کر پلکنڈہ میں مقیم ہوا۔ مسلمان فاتحین وجیانگر میں چھ ماہ ٹھہرنے کے بعد واپس ہوئے۔ انہوں نے واپسی کے وقت اپنی فوج کو رائچور اور مدگل کو فتح کرنے کیلئے بھیجا۔ مسلمان جب بیجاپور سے جنگ کے لئے نکلے تو انہوں نے ان قلعوں پر توجہ نہیں کی تھی، اگر وہ راستوں میں ان قلعوں پر توجہ کرتے تو شاید جنگ کا نتیجہ کچھ اور نکلتا۔ ممکن تھا کہ ان کی ساری طاقت ان مقامات پر صرف ہو جاتی۔ بخلاف اس کے انہوں نے سیدھے وجیانگر پر چڑھائی کر دی اور نتیجہ ان کے حسب مراد نکلا) رائچور اور مدگل فتح ہو گئے۔ بیجاپور نے ان کا الحاق کر لیا۔ اور اس طرح دوآبہ رائچور جس پر قبضہ کے لئے ڈھائی سو سال سے ہندو اور مسلمانوں میں ہولناک اور متواتر خونریزیاں ہو رہی تھیں مستقل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اور اس طرح وجیانگر کی سلطنت کی حدود جو دریائے کرشنا کے شمال سے بہت دور تک پھیل گئی تھیں۔ اب دریائے تنگ بھدرا تک محدود ہو گئیں۔ فاتح مسلمان واپسی کے وقت رائچور کے قریب ٹھہرے۔ اور ان میں پھر نااتفاقی پھیل گئی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکے کہ جنوب کا ملک کس طرح آپس میں تقسیم کیا جائے۔ اور اس نااتفاقی کی وجہ سے وہ عرصہ تک جنوب پر حملہ آور نہ ہو سکے۔

ترملا کو مسلمانوں کی نا اتفاقی کی خبر مل چکی تھی۔ ان کی واپسی کے بعد اس نے پلکنڈہ سے نکلکر اس اجڑے ہوئے شہر وجیانگر کو آباد کرنے کی ٹھانی کہ اسے پائے تخت بنا سکے۔ تالیکوٹ کی جنگ ۲۵ جنوری ۱۵۶۳ء میں ہوئی۔ ترملا پھر وجیانگر کو اسی سال ماہ جولائی میں واپس ہوا ترملا نے وجیانگر میں آکر پھر فوج کی تنظیم کی طرف توجہ کی۔ اور احمد نگر کے سلطان مرتضیٰ نظام شاہ سے اس نے دوستی کرلی تھی۔ اور دوسری طرف پرتگال والوں سے گھوڑے خریدے۔ پرتگالی مورخ لکھتے ہیں:-

"ترملا نے گھوڑے خرید کرکے اس کی قیمت ادا نہیں کی۔ جس کی وجہ سے پرتگالیوں کو سخت نقصان پہونچا۔"

میسور گزیٹیر کا مصنف صفحہ ۲۰۸۳ پر لکھتا ہے:-

"ملک کی خوش حالی اور فوج کی طاقت کا بہت بڑا راز پرتگال والوں سے تجارت میں مضمر تھا۔ ترملا نے گھوڑوں کی رقم نہ دیکر اپنے آپ کو بہت نقصان پہونچایا۔"

ترملا کی اس تیاری اور ان سازشوں کا حال جو اس نے پھر شروع کی تھی۔ جب بیجاپور میں معلوم ہوا۔ تو علی عادل شاہ نے پھر وجیانگر کا رخ کیا۔ لیکن اس وقت ترملا کی حمایت پر احمد نگر کی سلطانہ خونزہ ہمایون تھی۔ اس نے بیجاپور کے مقبوضات پر چڑھائی کردی۔ علی عادل واپس پلٹ گیا۔ لیکن اپنے جنرل کشور خان کو وجیانگر پر حملہ کرنے کیلئے بھیجدیا۔ یہ دیکھکر ترملا ہمیشہ کے لئے وجیانگر کو چھوڑ کر پلکنڈہ واپس آگیا۔ اس کے دوسرے سال یعنی ۱۵۶۶ء میں بیجاپور کے جنرل کشور خان نے ادہونی پر قبضہ کرلیا۔ ادہونی کا قلعہ تمام جنوبی ہند کی کنجی مانا جاتا تھا۔ بہمنی سلاطین عرصہ تک اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے رہے

لیکن کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت جب وجیانگر تباہ ہوگیا تو یہاں کا ہندو گورنر خود مختار ہوگیا تھا۔ کشور خان نے ایک سخت محاصرہ کرتے ہوئے اس کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کرلیا۔ ادہونی کی فتح سے اضلاع بلاری و کرنول کا راستہ مسلمانوں کیلئے کھل گیا۔ لیکن مسلمانوں کی نا اتفاقی نے بیجاپور والوں کو اور آگے بڑھنے نہ دیا۔ خوش قسمتی سے اس کے بعد گولکنڈہ، احمد نگر اور بیجاپور میں پھر معاہدہ ہوگیا۔ اسوقت آپس میں طے کرلیا گیا کہ بیجاپور والے جنوبی ہند پر اور گولکنڈہ والے مشرقی اضلاع پر جو دریائے کرشنا سے شمال میں تھیں۔ فتح کرلیں۔ گولکنڈہ والوں نے راجمندری پر قبضہ کرلیا۔ اور شمال میں اڑیسہ کے کلنگا خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن بیجاپور اپنے اندرونی معاملات میں ۱۵۷۳ء تک الجھا رہا۔

ترملا کی وجیانگر سے دوبارہ واپسی نے جنوبی ہند پر نہایت برا اثر ڈالا۔ اور اب ہندوؤں کو معلوم ہوگیا کہ جنوبی ہند کو بچانے کی طاقت فنا ہوگئی ہے۔ اس لئے ہر جگہ مختلف راجہ اور گورنر خود مختار ہونا شروع ہوئے۔ خصوصاً اضلاع بلاری اور کرنول میں جو وجیانگر سے قریب تھے۔ تمام حاکم ترملا سے باغی ہوگئے۔ اور مغربی علاقہ کوکن بھی سرکش ہوگیا۔ لیکن پلکنڈہ کے جنوب میں یہ اثر فوراً محسوس نہیں ہوا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رام راج کے عہد میں بہت سے اس کے ہی رشتہ دار یہاں کے حاکم بن گئے تھے۔

اسی سال ترملا نے برائے نام شہنشاہ راجہ سداسیورایا کو زہر دیکر مار دیا۔

میسور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے:۔

"ترمل راج کے بیٹے ونکٹ رائل نے سداسیورایا کو قتل کردیا۔"

سداسیورایا کے قتل سے وجیانگر کے تیسرے خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ سداسیورایا کے

کوئی اولاد نہیں تھی۔ سداسیورایا کے بعد ترملا خود تخت نشین ہوا۔ اس کی اس تخت نشینی سے سلطنت میں اور بھی ابتری پھیل گئی۔ رام راج کے بیٹے اپنے آپ کو تخت کا مستحق سمجھتے تھے۔ اس لئے ترملا اور رام راج کے لڑکوں میں بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ ان میں ایک نے علی عادل کے پاس جاکر اناگنڈی میں ٹہرنے کی اجازت چاہی جو دیدی گئی۔

۱۵۷۲ء میں بیجاپور کے مسلمانوں نے دکن کے معاملات سے فراغت پاکر پھر جنوب کی طرف توجہ کی۔ اور اس دفعہ انہوں نے ملک کے مغربی حصہ پر حملہ کیا۔ دھاڑواڑ، برکور، ملک کوکن کے بعض علاقے فتح کرلئے گئے۔ اور جنوب میں چندرگیری پر جو موجودہ ضلع شیموگہ میں ہے ان کا قبضہ ہوگیا۔

ترملا کا عہد ۱۵۷۳ء میں ختم ہوگیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سری رنگا رائل تخت نشین ہوا۔

سری رنگا رائل

۱۵۷۴ء تا ۱۵۸۶ء

اس کی تخت نشینی کے تیسرے سال میں بیجاپور کے مسلمانوں نے (جو تمام مغربی ساحلی علاقہ کو ضلع جنوبی کنارا تک فتح کرچکے تھے) بلکنڈہ پر چڑھائی کردی۔ یہ دوسرا قدم تھا جو وجیانگر کے بعد جنوب میں انہوں نے اٹھایا۔ محاصرہ کی سختی کو دیکھکر سری رنگا نے برکور کے ہندو پالیگاروں کو رشوت بھیجی۔ جس کو قبول کرتے ہوئے انہوں نے بیجاپور والوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جس کی وجہ سے مسلمان محاصرہ اٹھاکر واپس ہوگئے۔ اسی زمانہ میں گولکنڈہ والوں نے وجیانگر کے مشرقی مقبوضات پر قبضہ کرلیا۔ جنرل حیدرالملک نے ونوکنڈہ

(ضلع نلور) پر چڑھائی کی۔ جس طرح وجیانگر سے جنوب میں پلگنڈہ ایک اور مضبوط مقام تھا۔ ونوکنڈہ بھی مشرق میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ یہاں ایک سخت جنگ ہوئی۔ جس میں رام راج کے ایک بیٹے کو مسلمانوں نے گرفتار کر کے گولکنڈہ کو بھیج دیا۔ ونوکنڈہ کی فتح کے بعد مسلمانوں نے کھمم (موجودہ ضلع کرنول) فتح کر لیا۔ اور اس علاقہ پر ایک برہمن راجہ راؤ کو حاکم بنایا گیا۔ سری رنگا کی وفات ۱۵۸۶ء میں ہوئی۔

ونکٹ پتی رائل

۱۵۸۶ء-۱۶۱۴ء

سری رنگا کی وفات کے بعد اس کا بھائی رام رائل تخت نشین ہوا۔ لیکن اسی سال چند روز کے بعد اس کے انتقال پر ونکٹ پتی رائل تخت نشین ہوا۔

اس عرصہ میں گولکنڈہ کے مسلمان جزیرہ نما کے شمال مشرقی حصہ پر بتدریج قبضہ کر رہے تھے۔ تخت نشینی کے بعد ونکٹ پتی رائل نے چاہا کہ گولکنڈہ والوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا جائے۔ اس لئے اس نے ان مقبوضات پر حملہ کیا جو گولکنڈہ کے ماتحت آ چکے تھے۔ گولکنڈہ والوں نے اس کے جواب میں دوسری طرف سے پلگنڈہ پر حملہ کر دیا۔ محاصرہ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ اور گولکنڈہ والے واپس ہوئے۔ انکی واپسی نے ونکٹ پتی رائل کو اور جرأت دلادی۔ اس نے اودگیری (ضلع نلور) کے راجہ کو خط لکھا۔ کہ مسلمانوں پر حملہ کیا جائے اس نے خود بھی بہت سی فوج اس کی تائید کے لئے بھیجدی۔ اس خبر کو سن کر راجہ راؤ۔ جو گولکنڈہ کی جانب سے ونوکنڈہ پر حاکم تھا۔ مدافعت کے لئے نکلا۔ اور جنگ میں اودگیری والوں کو شکست ہوئی۔ مسلمانوں نے یہاں سے بڑھکر خاص اودگیری (ضلع نلور) پر قبضہ کر لیا۔

مشرقی علاقے میں جب یہ واقعات ہو رہے تھے۔ تو مغربی علاقے میں بیجاپور کی فتوحات روکنے کے لیے ونکٹ پتی رائل نے احمد نگر والوں سے اتحاد کر لیا کہ بیجاپور کے خلاف متحدہ قوت سے کارروائی کرے۔ علی عادل کو جب یہ خبر پہونچی تو اس نے پھر پلگنڈہ پر چڑھائی کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ونکٹ پتی رایل کو شہر پلگنڈہ چھوڑ کر چندر گیری میں پناہ لینی پڑی۔ پلگنڈہ پر ۱۵۹۲ء میں مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ (اگر نقشہ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اب مسلمان بیجاپور سے لیکر نیچے میسور کی سرحد تک تمام ملک پر قابض ہو چکے تھے۔ اور مشرق میں دریائے کرشنا سے نیچے کرنول اور نلور کا علاقہ گولکنڈہ والوں کے قبضہ میں آچکا تھا)

اس سال کے بعد دکن یعنی بیجاپور یا گولکنڈہ کے مسلمانوں نے اس طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ اس لئے کہ ان کی شمالی سرحدوں پر ان کے خلاف ایک اور زبردست طاقت صف آرا ہو گئی تھی۔ یہ طاقت مغلوں کی تھی۔ دہلی کے تخت پر اس وقت مغل شہنشاہ اکبر حکمران تھا۔

مورخ ہراس کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے :-

"اکبر نے ونکٹ پتی رائل کے پاس اپنے سفیر کو بھیجکر دکن کے مسلمانوں کے خلاف مدد چاہی۔ لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وقت ہندوؤں نے خیال کیا کہ دکن کی سلطنتیں فتح ہونے کے بعد مغل جنوبی ہند پر قبضہ کر لیں گے"

یہی مورخ یہ بھی لکھتا ہے :-

"ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور نے بھی ونکٹ پتی رائل سے مغلوں کے خلاف مدد چاہی۔ لیکن اب ہندوؤں نے یہی مصلحت سمجھا کہ کسی فریق کو بھی مدد نہ دی جائے"

مورخ ہراس کا یہ خیال صحیح ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس وقت ونکٹ پتی رائل کی توجہ خالص اندرونی معاملات پر تھی۔ پگکنڈہ سے پائے تخت کی تبدیلی نے سلطنت کے اثر و اقتدار پر اور بھی مہلک اثر ڈالا۔ میسور، تنجاور، مدورا اور جنجی کے راجہ باغی ہوکر اپنی خودمختاری کا اعلان کرچکے تھے۔ یہاں تک کہ میسوریوں نے سرنگاپٹم سے وجیانگر کے وایسرائے کو بھی نکال دیا گیا۔ ونکٹ پتی رائل نے ان باغی سرداروں کی جانب توجہ کی اور اسی سلسلہ میں اس نے چندرگیری کو چھوڑکر ویلور کو اپنا پائے تخت بنایا۔ کم از کم جنوب کے دریائی حصہ میں تو رہے۔ یہاں سے اس نے ایک دفعہ پرتگال والوں پر بھی (جو سنٹ تھامس مونٹ میں تھے) فوج کشی کی۔ لیکن خود اسی کے ایک سردار نے پرتگال والوں کو مدد دیکر اس کو شکست دیدی۔

ہراس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"اس سے خوش ہوکر پرتگال کے بادشاہ فلپ سوم (Phillip III) نے باغی سردار رگھوناتھ کا شکریہ ادا کیا۔"

اس کے عہد کے آخری سالوں میں خود اس کے خاندان میں ولی عہدی کے معاملہ پر نفاق پیدا ہوگیا۔ موت سے تین دن پیشتر اس نے سری رنگا سوم کو اپنا جانشین منتخب کیا۔

مقامی ہندو تاریخوں میں لکھا ہے کہ ونکٹ پتی رائل کے زمانہ میں ہندو مذہب میں وشنو عقاید کو بہت تقویت ملی۔ اور یہ عقاید تمام جنوبی ہند میں پھیل گئے۔ ترپتی کے مندر کو بھی اسی زمانہ میں اہمیت حاصل ہوی۔ ونکٹ پتی رائل نے ترپتی میں منادر تعمیر کئے۔ اور اسکی تقلید میں اس وقت ہندو رئیسوں نے بھی بہت سی تعمیرات کیں۔

باوجودیکہ ملک کی سیاسی حالت بہت ابتر تھی۔ ونکٹ پتی رائل کے عہد میں علم ادب اور شاعری نے خوب ترقی کی۔ ونکٹ پتی رائل کے دربار میں ہر روز و شب ہندوؤں کے مختلف

عقاید کے عالم بحث و مباحثہ کرتے تھے۔

مورخ ہراس لکھتا ہے :۔

"جیسوٹ فرقے کے عیسائی پادری بھی ان میں حصہ لیتے تھے۔ اس زمانہ کے شاعروں میں ایک ہندو شاعرہ رام بھدرامبا بہت مشہور ہوئی ہے۔"

گو وِنکٹ پتی رائل کے بعد اس خاندان میں اور چار راجاؤں کے نام آتے ہیں۔ یعنے سری رنگا رایل (۱۶۱۴ء تا ۱۶۱۵ء) راما دیو رائل (۱۶۱۵ء تا ۱۶۳۰ء) وِنکٹ پتی رائل (۱۶۳۰ء تا ۱۶۴۲ء) اور سری رنگا رائل (۱۶۴۲ء تا [illegible]) لیکن وجیانگر کی سلطنت کی بچی کچی شان و شوکت وِنکٹ پتی رائل کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ اور ان راجاؤں کی حالت ایک معمولی پالیگار سے کچھ بڑھکر نہ رہی نہ صرف دوسرے پالیگارا ور راجاؤں نے انکی رہی سہی قوت کو چھین لیا۔ بلکہ خاندان میں بھی نااتفاقی پیدا ہو گئی۔

وِنکٹ پتی رائل کے بعد سری رنگا رائل تخت پر بیٹھا۔ مگر اندرونی سازشوں نے ایک ہی سال میں اس کو تخت سے دست برداری پر مجبور کر دیا۔

پس کرشنا سوامی اینگار اپنی تاریخ ہند کے صفحہ ۲۸۱ پر لکھتا ہے :۔

"اور اسی سال اس کی وفات بھی ہو گئی۔ اسکے بعد راما دیوا رائل تخت نشین ہوا۔ لیکن خاندان کا ایک اور شخص جگ رایا تخت کا دعویدار ہوا۔ اور اس کی حمایت پر تنجاور کا راجہ تھا۔ جنگ میں جگ رایا کو شکست ہوئی۔ اس فتح سے امید ہو چکی تھی کہ راما دیوا رائل کا اقتدار بحال ہو جائیگا۔ لیکن اسی وقت مدورا کا نایک جو جنوب میں سب سے زبردست تھا۔ رام دیوا کے خلاف ہو گیا۔"

مدورا ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے :۔

" اگر مدور والے اس وقت مخالفت نہ کرتے تو تمام ملک میں پھر ہندو سلطنت
قایم ہو جاتی۔ لیکن یہ آخری امید بھی ختم ہو گئی"

پرتگال والے ابتک مشرقی علاقہ میں صرف تجارت پر قانع تھے لیکن اس سال سے انہوں نے بھی ملک کی حالت دیکھکر ان بندرگاہوں پر فوجی قبضہ کرلیا۔ جہاں وہ تجارت کرتے تھے۔
پرتگالی مورخ براڈاس لکھتا ہے :-

" اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر سنٹ تھامس مونٹ (چلے وارم) کے پرتگالی
تاجروں نے جواب تک خراج اور محصول ادا کرتے تھے۔ اس علاقہ کو بادشاہ پرتگال
کی ملکیت قرار دے دیا۔ اور انہوں نے بڑھکر اطراف کے علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا"

ملک میں یہ خانہ جنگی اسی طرح پھیلی ہوئی تھی کہ رام دیوا کا انتقال ہو گیا۔ اور وینکٹ پتی رائل دوم تخت نشین ہوا۔ اور اس کی حکومت ویلور اور اس کے مضافات تک محدود تھی لیکن وجیانگر کی دھاک ملک میں ابھی باقی تھی۔ اس لئے امراء اپنے اپنے فائدہ کے لئے شہنشاہ کے نام سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اس کے عہد کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے (East-India Co) اپنی تجارت کے لئے مدراس کی بندرگاہ ۱۶۳۹ء میں پونا ملے کے ہندو راجہ وینکٹ دری نایک سے حاصل کی۔

اسی خانہ جنگی کی حالت میں ۱۶۴۲ء میں وینکٹ پتی رائل کا انتقال ہو گیا۔ اور سری رنگا رائل چہارم تخت نشین ہوا۔ لیکن اسی سال بیجاپور اور گولکنڈہ کے مسلمانوں نے ویلور پر قبضہ کرلیا سری رنگا یہاں سے فرار ہو کر بدنور (میسور) کے نایک کے پاس پناہ گزین ہوا۔
ڈاکٹر کرشنا سوامی اینگار نے اپنی تاریخ ہند کے صفحہ ۲۷۱ پر لکھا ہے :-

" سری رنگا رائل نے مغل شہنشاہ شاہ جہاں کو مدد کے لئے خط لکھا۔ اس خط میں

لکھا گیا تھا کہ اگر جنوب کا تمام ملک اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ مسلمان ہو جائیگا
لیکن شاہ جہاں نے توجہ نہیں کی"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند میں اب ان راجاؤں کو جو وجیانگر کے نام لیوا تھے۔ کوئی وقعت باقی نہیں رہی۔ سری رنگا رائل کے آخری دن پلگنڈہ میں بسر ہوئے جہاں ۱۶۹۹ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا کوتھنڈا راما برائے نام راجہ ہوا۔ اور اس کی حیثیت ایک معولی پالیگار سے زیادہ نہیں تھی۔ کوتھنڈا راما کے بعد پلگنڈہ کی حکومت ۱۶۰۳ء تک اسی خاندان کے ماتحت رہی اور یہ پالیگار پہلے بیجاپور کو اور بعد میں سلطنت مغلیہ کو خراج دیتے رہے۔ ملکی انقلاب نے ان کو یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ ۱۶۰۴ء میں وہ یہاں سے نکلکر اناگندی میں جاکر پناہ گزین ہو گئے۔

(نوٹ :۔ اناگندی میں رام راج کی اولاد حکمران تھی۔ جنگ تالیکوٹہ کے بعد رام راج کے ایک بیٹے تمراج نے علی عادل شاہ کے پاس پناہ لی تھی۔ علی عادل نے تمراج کو اناگندی کی حکومت سپرد کر دی تھی۔ (تاریخ فرشتہ) اس زمانہ سے یہ خاندان ابھی تک اناگندی میں ہے)

حکومتِ وجیانگر کی بنیاد اسی شہر سے پڑی۔ وسعت پذیر ہوئی۔
اور پھر سمٹ کر اسی خطہ پر آگئی۔

تاریخ میں اناگندی کا ذکر پھر ۱۷۷۶ء میں آتا ہے۔

کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے :۔

"ٹیپو سلطان نے ۱۷۷۶ء میں اناگندی پر قبضہ کرتے ہوئے اس شہر اور اس کے مضافات کو جلا کر تباہ کر دیا تھا"۔

کرنل ولکس کی اس روایت کو دوسرے انگریزی اور ہند و مورخین نے لیا ہے۔ میسور گزیٹیر کا مصنف بھی اپنی کتاب کے صفحہ ۲۴۰ پر اسی روایت کو نقل کرتا ہے۔

ٹیپو سلطان کو بدنام کرنے میں مغربی مورخین نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ تعجب ہے کہ اس زمانہ کے مورخ بھی آنکھ بند کر کے ان کی ہی تقلید کر رہے ہیں۔

ولکس نے اس واقعہ کا سال ۱۷۸۰ء دیا ہے۔ یہ زمانہ ٹیپو سلطان کا نہیں بلکہ حیدر علی کا تھا۔ اور اس وقت مرہٹوں اور حیدر علی میں جنگ ہو رہی تھی۔ اپنے باپ کی فوج کی کمان کرتے ہوئے ٹیپو سلطان نے اناگندی پر قبضہ کر لیا۔ لیکن نہ اس کو جلایا اور نہ تباہ کیا۔ بلکہ اس کے خلاف اس قدیم خاندان کی عظمت و توقیر کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو نذر گذارنے اور دربار میں حاضر ہونے سے معاف کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کو سفید چتر (جو شاہی نشان ہے) پکڑنے کی اجازت دیگئی۔ اور اپنی ریاست میں ٹکسال قایم کرنے کی اجازت دیتے ہوے اندرونی خود مختاری بھی دیدی۔ کیا اس سے بہتر سلوک ممکن تھا؟ کہاں یہ سلوک اور کہاں ولکس کی روایت؟

مذکورۂ بالا تحریر کے ثبوت میں ذیل کی تحریرات دی جاتی ہیں جو ۱۷۷۶ء کے قریب کے زمانے ہی میں لکھی گئی تھیں۔ ان میں ایک تحریر حیدرآباد کے اس انگریزی رزیڈنٹ کی ہے جو ۱۷۸۵ء میں حیدرآباد میں تھا۔ اس نے اپنی کتاب ہسٹوریکل اینڈ پولٹیکل ویو آف دی دکن کے صفحہ ۱۴ پر لکھا ہے ؛ (۱) یہ کتاب ۱۷۹۴ء میں لندن میں شائع ہوئی تھی (۱) یہ کتاب اس نے میسور کی تیسری جنگ کے بعد لکھی تھی۔ جبکہ انگریز، مرہٹے اور حیدرآباد نے ٹیپو سلطان پر فتح پا کر سلطنت خداداد کے آدھے حصے پر قابض ہوگئے تھے۔ ان مقبوضات میں دوآبہ رائچور بھی تھا۔ جو حیدرآباد کے حوالے کر دیا گیا۔ سلطان نے دوآبہ رائچور کو دینا منظور تو کر لیا۔ لیکن اناگندی کو حوالے کرنے سے انکار کیا۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کتاب میں

میں لکھا ہے :-

"یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹیپو ملک کی تقسیم کے وقت اناگندی کو حوالے کرنے سے کیوں انکار کرتا ہے۔ اس سے ٹیپو کو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہ چھوٹی سی ریاست جس کا رقبہ بیس مربع میل ہے اس عظیم الشان سلطنت کی یادگار ہے۔ جس نے کبھی تمام ملک پر حکمرانی کی تھی۔ اس وقت رام راج کی اولاد یہاں حکمران ہے۔ اس کے حکمران کو رائل کہا جاتا ہے۔ جو مہاراجہ کا ہم معنی خطاب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان میں ایک رجسٹر رکھا ہوا ہے۔ جس میں جنوبی ہند کے تمام واقعات لکھے جاتے ہیں۔ شاید یہ اسی موہوم امید پر ہے کہ پھر یہ ملک کبھی ان کے قبضہ میں آجائیگا۔ اس ریاست کی آمدنی ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔ اور اس کی ایک خاص ٹکسال بھی ہے۔ جس میں سکے ڈھالے جاتے ہیں۔ اس ٹکسال کی اجازت ٹیپو نے دے رکھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے اس قدیم خاندان کی عظمت کو قایم رکھنے کیلئے انہیں اندرون ملک میں کامل خود مختاری دے رکھی ہے۔"

ایک اور انگریز افسر میجر رنل (Rennel) جو میسور کی تیسری جنگ میں شریک تھا اپنے تذکرہ (Memoir) میں لکھتا ہے :-

"اتحادیوں (انگریز، مرہٹے اور حیدر آباد) نے ٹیپو کا آدھا ملک لے لیا۔ تورا پچور کا دوآبہ حیدر آباد کے حصہ میں آیا۔ لیکن ٹیپو نے اناگندی کا علاقہ اتحادیوں کے حوالے کرنا منظور نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں قدیم راجگان وجیانگر کا خاندان آباد ہے وہ نہیں چاہتا کہ اس خاندان کو کوئی گزند پہونچے۔ شاید اس کو خوف ہے کہ اس علاقہ کو اتحادیوں کے حوالے کر دینے سے اس قدیم خاندان کو کوئی نقصان پہونچے گا

اور ان کی آزادی چھن جائے گی۔ اس جذبہ کیلئے ٹیپو ہماری تعریف کا مستحق ہے۔"

مندرجہ بالا تحریر کتاب سیاحت نامہ کیپٹن لٹل میں درج ہے۔ یہ کتاب ۱۷۹۴ء میں لندن میں شائع ہوئی تھی۔ ان عینی شواہد کے ہوتے ہوئے ولکس کی روایت پر جو اس واقعہ کے قریب اسّی سال بعد لکھی گئی ہے۔ کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کتاب پر چھوڑا جاتا ہے۔

اناگندی کا یہ علاقہ اس وقت ریاست حیدرآباد میں شامل ہے۔ اور ابھی تک یعنی ۱۹۳۹ء مطابق ۱۳۵۸ھ میں رام راج کی اولاد یہاں آباد اور حکمران ہے۔ اور حیدرآباد کی سرکاری اصطلاح میں اس کو اناگندی سمستان کہا جاتا ہے۔

زوالِ وجیانگر کے بعد

تالیکوٹہ کی جنگ ۱۵۶۵ء میں ہوئی۔ وجیانگر کی تاریخ کا سلسلہ قایم رکھنے کے لیے بعد کے واقعات بھی جو اس سلطنت سے تعلق رکھتے تھے۔ اخیر تک یعنی ۱۶۴۴ء تک لکھدیئے گئے ہیں۔ جبکہ اس سال اس سلطنت کی آخری شمع بھی گل ہوگئی۔ تاریخی لحاظ سے ۸۰ سال کا یہ زمانہ تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا۔ ۱۵۶۵ء سے ۱۵۹۲ء تک۔ ۲۷ سال

دوسرا۔ ۱۵۹۲ء سے ۱۶۳۷ء تک۔

تالیکوٹہ کی جنگ کے بعد ۲۷ سال کا پہلا دور دونوں قوموں کی باہمی جدال وقتال میں گذرا۔ ہندو چاہتے تھے کہ اپنا ملک دوبارہ حاصل کریں۔ یا کم از کم ملک کا جو حصّہ ابھی ان کے قبضہ میں تھا اس کو مسلمانوں سے محفوظ رکھیں۔ مسلمان چاہتے تھے کہ اپنی فتوحات بڑھائیں۔

اور باقی ملک بھی اپنے قبضہ میں لائیں۔ ان مقاصد میں دونوں ناکامیاب رہے۔

(۱) تالیکوٹہ کی جنگ سے ہندوؤں کا شیرازہ بکھر گیا۔ ان میں آپس میں نااتفاقی پھیل گئی۔ وہ اس قابل نہ رہے کہ ملک کی مدافعت کر سکتے۔ ہر سردار یہی چاہتا تھا کہ آزاد ہو کر جس قدر ملک ملے۔ اپنے قبضہ میں کر لے۔ اس طرح ہندوؤں نے خود اس سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔

(۲) مسلمان فتح سے سرشار تھے۔ ان کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ وہ اگر چاہتے تو اس فتح سے فائدہ اٹھا کر اسی وقت پورے ملک پر قبضہ کر سکتے تھے۔ لیکن فتح کے بعد پھر ان میں نااتفاقی پھیل گئی۔ ان کی متحدہ قوت پریشان ہوگئی۔ اور ان کی سلطنتیں پھر ایک دوسرے کے خلاف ہوگئیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جنوب پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ ۲۰ سال کے عرصہ میں صرف اتنا ہوا کہ مشرق میں گولکنڈہ والے دریائے کرشنا کے جنوب میں کرنول اور نلور پر قبضہ کر سکے۔ اور بیجاپور والے موجودہ میسور کی شمالی سرحد تک پہونچے۔ اور ان مفتوحہ ممالک میں کہیں کہیں ان کی نوآبادیاں بھی قایم ہوگئیں۔

دوسرا دور ۱۵۹۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سال مسلمانوں کی توجہیں جنوبی ہندوستان کو چھوڑ کر دکن کو واپس چلی گئیں۔ کیونکہ ان کے مقابلہ میں شمالی سرحد پر ایک زبردست طاقت جو مغلوں کی تھی۔ صف آرا ہو چکی تھی۔

یہ ایک ایسا نادر موقع تھا۔ کہ اگر ہندو چاہتے تو پھر دریائے کرشنا تک کا پورا ملک ان کے قبضہ میں آجاتا۔ ان کے سد راہ کوئی طاقت نہیں تھی۔ تمام ملک مسلمانوں سے خالی تھا۔ ڈھائی سو سال پیشتر سلطان محمد بن تغلق کے بعد جب دکن میں مسلمان ایک دوسرے سے جنگ میں مصروف تھے۔ تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہندوؤں نے وجیانگر کی سلطنت قایم کی تھی۔ لیکن اب ایک ایسا ہی موقع جب انہیں حاصل ہوا تو انہوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ اس کے عوض

ان کی آپس کی نااتفاقی اور خانہ جنگی اور بھی بڑھ گئی۔ اور خود انہوں نے وجیانگر کی جھلملاتی شمع کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ بے شمار چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں پیدا ہوئیں۔ جن کے حاکموں کو جنوبی ہند میں پالیگار کہا جاتا ہے۔ ان پالیگاروں میں بعض تو اس قدر چھوٹے تھے کہ ان کے ماتحت صرف چند دیہات کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ اور بعض طاقتور اور ایک وسیع رقبہ کے مالک تھے۔ ان میں تنجاور، مدورا اور میسور کی ریاستیں بہت زیادہ نمایاں ہوئیں۔ ملک میں ہندوؤں کی یہ خانہ جنگی اسی طرح جاری تھی کہ ۱۶۳۰ء میں مسلمان جنوب پر پھر حملہ آور ہوئے تو تمام ملک صرف ایک سال کے عرصہ میں فاتحین کے قبضہ میں آگیا۔

جنوبی ہند میں مغلوں کی آمد

اس تمام عرصہ میں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ دکن کی مسلمان سلطنتیں نہ صرف مغلوں سے جنگ میں مصروف نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے سے بھی لڑتی رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۶۰۰ء میں احمد نگر کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے ۳۰ سال بعد بیجا پور اور گولکنڈہ مغلوں کے باجگذار بن گئے۔ اس وقت دکن کا صوبہ دار شہزادہ عالمگیر اورنگ زیب تھا۔ اس نے جنوبی ہند پر توجہ کی۔ اور بیجا پور کی اسلامی فوجوں کو اس ملک کو فتح کرنے کا حکم دیا۔ بیجا پور کی فوج ۱۶۳۷ء میں بیجا پور سے نکلی۔ ایک طوفان تھا جو بیجا پور سے اٹھا۔ اور جنوبی ہند پر چھا گیا۔ اس فوج کی کمان بیجا پور کے مشہور جنرل رن دولہ خاں کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس کا نائب مشہور مرہٹہ سردار شاہ جی تھا۔ رن دولہ خاں بیجا پور سے نکلا اور ایک سال کے اندر اندر بنکاپور، ہری ہر، بسواپٹن، تریکرہ، کاولدرگ سب اس کی زد میں آگئے۔ یہاں سے وہ سرنگاپٹم پر بڑھا۔ سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا گیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ محاصرہ اٹھا کر رن دولہ خان نے میکوٹ پر چڑھائی کی۔ اس کو فتح کرنے کے بعد بیجا پور کی فوج بنگلور پر بڑھی۔ اس وقت یہاں ماگڑی کیمپے گوڈا کی حکومت تھی۔ جنگ میں کیمپے گوڈا کو شکست ہوئی۔ ۱۶۳۸ء میں بنگلور پر قبضہ کر لیا گیا۔ بنگلور سے نکلکر ہسکوٹہ، کولار، ویلور اور جنجی کو قبضہ میں کرکے رن دولہ خاں پھر بنگلور واپس ہوا۔ اور یہاں سے بڑا بالاپور، سرا اور چتلدرگ پر اسی سال قبضہ کر لیا گیا۔ اس کا صدر مقام بنگلور تجویز ہوا لیکن بعد میں سرا کا انتخاب کیا گیا۔ بنگلور اور جنجی شاہ جی کو خدمات کے صلے میں بطور جاگیر دیدیے گئے۔ اس طرح ایک سال کے اندر اندر جنوبی ہندوستان کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ

میں آ گیا۔ اور ان کی نو آبادیاں یہاں قایم ہو گئیں (بلاری، اننت پور، میسور اور پائیں گھاٹ میں ضلع جنوبی ارکاٹ تک جس قدر مسلمان آبادی پائی جاتی ہے۔ وہ سب کی سب بیجاپور سے آئے ہوئے مسلمانوں کی ہے۔ اور انہیں مسلمانوں میں ملے جلے اہل نوایط بھی جنوبی ہند میں آئے اس سے پہلے اہل نوائط مرہٹواڑی اور کوکن کے ساحل پر آباد تھے۔ اور ان کے بہت سے خاندان بہمنی سلطنت اور دکن کی دوسری پانچ سلطنتوں میں بڑے بڑے عہدوں پر تھے۔ فرشتہ کی تاریخ میں ان خاندانوں کے بہت سے نام ملتے ہیں۔ اہل نوایط جب جنوب میں آئے تو ان کی کثیر تعداد ضلع جنوبی ارکاٹ یعنے جنجی اور ویلور کے قرب وجوار میں آباد ہوئی۔ بنگلور کی جاگیر مرہٹہ شاہ جی کو دیدی گئی تھی۔ اس لئے مرہٹے بھی جنوب میں آکر آباد ہونے شروع ہوئے)

مورخ ولکس لکھتا ہے:۔

"مرہٹوں سے مراد وہ مرہٹے نہیں جو شہروں میں درزی کا پیشہ کرتے ہیں۔ یہ نام یو مرہٹے ہیں۔ یہاں مرہٹوں سے مراد وہ جنگی قوم ہے جو راجپوت النسل سے ہیں اور اب بھی میسور وغیرہ کی فوج میں ملازم ہیں"

مغلوں کی پالیسی

جنوب پر یہ حملہ اورنگ زیب کے حکم سے ہوا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی اگلی جنگوں میں کس طرح ملک تباہ ہو گیا تھا۔ اس لئے اس وقت اورنگ زیب نے حکم دیا کہ جس ملک پر قبضہ کیا جائے۔ اس کے عوض وہاں کے حاکم کو دوسرا نسبتاً غیر آباد علاقہ دیدیا جائے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علاقے بھی جو غیر آباد تھے آباد ہو گئے۔

میسور گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۸ پر لکھتا ہے:۔

" حملہ آوروں کی پالیسی یہ تھی کہ صدر مقام پر قبضہ کرنے کے بعد اس علاقہ کا مالی انتظام اپنے ہاتھ میں لیکر وہاں کے مقامی سردار کو اسی علاقہ میں ایسی جگہ دی جائے جو زیادہ زرخیز نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام بنجر اور غیر مزروعہ زمینیں بھی قابل زراعت بن گئیں۔ اور لوگ وہاں آکر آباد ہونا شروع ہوئے۔ حملہ آوروں نے بسواپٹن لیکر وہاں کے پالیگاروں کو ترکیرہ دیدیا۔ بنگلور لیکر کیپے گوڑا کو ماگڑی دیا گیا۔ ہسکوٹ کے عوض آنیکل، کولار کے عوض پنگنور اور سرا کے عوض رتن گیری دئے گئے اس طرح تمام ملک آباد ہوگیا۔ اور زمینیں قابل زراعت بن گئیں"

مرہٹے اور مسلمان

جنوب کی فتوحات اور سرا کی صوبہ داری کو قایم ہوئے ابھی چند ماہ نہ گذرے تھے کہ عالمگیر اورنگ زیب کو دکن سے نکالکر گجرات کی صوبہ داری پر بھیجدیا گیا۔

" عالمگیر کی اس پالیسی کو اس کے بھائی داراشکوہ نے پسند نہیں کیا۔ اس نے اپنے باپ شاہجہاں سے کہہ کر عالمگیر کو گجرات کی صوبہ داری پر بھیجدیا۔

(تاریخ ہند از کرشنا سوامی اینگار)

عالمگیر کے جاتے ہی جنوب میں فتوحات بھی رک گئیں۔ اور ایک ایسا انقلاب آیا جس نے آئندہ مسلمانوں کو سالہا سال جنگوں میں مصروف رکھا۔ دکن سے عالمگیر کی گجرات کو تبدیلی شہنشاہ شاہجہاں کی ایک ایسی سیاسی غلطی تھی۔ جس کا خمیازہ شاہیہ سلطنت کو بری طرح بھگتنا پڑا۔ یہی معمولی سی غلطی عظیم الشان سلطنت مغلیہ کے زوال کا باعث بن گئی۔ داراشکوہ

شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا اور ولی عہد تھا۔ لیکن امور سلطنت وسیاست میں بالکل کورا تھا۔ بخلاف اس کے عالمگیر نہایت دور بین اور ماہر سیاست تھا۔ اس نے جنوب میں آئندہ پیدا ہونے والے خطرہ کو اسی وقت بھانپ لیا تھا۔ اور یہ بھی جان چکا تھا کہ یہ اسلامی سلطنتیں مرہٹوں کے عروج کا باعث ہو رہی ہیں۔ اس لئے وہ انہیں مٹا دینا چاہتا تھا۔ لیکن شاہجہاں نے اس کو ایسا نہ کرنے دیا ۔

دکن کی تاریخ دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے ملک مہاراشترا کو جو دکن کے مغربی جانب ہے۔ علاؤالدین کے زمانہ میں ہی فتح کر لیا تھا۔ اور بعد میں بہمنی سلطنت کا اس پر تسلط ہوگیا۔ اس سلطنت کے زوال پر احمدنگر، بیجاپور، بیدر اور گولکنڈہ کی سلطنتوں نے اس کے مختلف حصّوں پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سالہا سال سے مسلمانوں اور مرہٹوں کی یکجائی نے لازمی طور پر مسلمانوں کے تمدن و معاشرت پر اثر ڈالا۔ دکنی مسلمان آہستہ آہستہ اس اثر کو قبول کر رہے تھے ۔

ان سلطنتوں میں مرہٹے جاگیردار بڑے بڑے عہدوں پر مقرر تھے۔ لیکن پھر بھی دونوں قوموں میں غیریت باقی تھی۔ لیکن اس وقت جب دکن پر مغلوں کے حملے شروع ہوئے تو دکن کی ان سلطنتوں نے ایک نئی پالیسی اختیار کی۔ اور مغلوں کو غیر ملکی کہنے لگے۔ ان کے شاعروں نے اس وقت جو نظمیں لکھیں۔ اس میں مغلوں کو غیر ملکی اور مرہٹوں کو اپنا حلیف اور ملکی لکھا گیا ہے۔ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ دکن ان کا وطن بن گیا تھا۔ اور یہ کوئی غلطی نہیں تھی کہ مغلوں کو انہوں نے اگر غیر ملکی کہا۔ لیکن انہوں نے جو غلطی کی وہ یہی تھی کہ انہوں نے اس پالیسی سے یہ سمجھ لیا کہ مرہٹے اور جنوب کے ہندو وطنیت کے لحاظ سے ان کا ساتھ دیں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بلکہ انکی اس پالیسی سے جس نے فائدہ

اٹھایا وہ مرہٹوں کی ہندو قوم تھی۔ یعنے عالمگیر کو جس بات کا خطرہ تھا۔ آخر وہی ہو کر رہا۔

اس پالیسی کو عمل میں لانے کے لئے ضروری تھا کہ مرہٹوں سے اور زیادہ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ انہوں نے اپنی باقاعدہ فوج میں مرہٹوں کو داخل کیا۔

کرنل ولکس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"ان کی باقاعدہ فوج کا بیشتر حصہ مرہٹوں پر مشتمل تھا۔"

ان تعلقات کا اثر یہ ہوا کہ ان کے تمدن و معاشرت میں مرہٹی اثر جو آہستہ آہستہ نفوذ کر رہا تھا۔ اور زیادہ نمایاں ہوگیا۔ نہ صرف ان کی شادی بیاہ وغیرہ کی رسموں میں مرہٹی رسم و رواج نے دخل پالیا۔ بلکہ محرم جو صرف غم حسینؓ کی مجلسوں تک محدود تھا۔ پورا مرہٹی رنگ میں رنگا گیا۔

(نوٹ :- اس رسم و رواج کا اثر ابھی تک دکن اور جنوبی ہند کے مسلمانوں میں باقی ہے۔ اس کے متعلق اس کتاب کے اخیر میں ایک ضمیمہ دیا گیا ہے)

دکن سے عالمگیر اپنے باپ شاہجہاں کے حکم سے جب واپس چلا گیا۔ تو بیجاپور اور گولکنڈہ والوں نے خراج بھیجنا بند کر دیا۔ اور باغی بن بیٹھے۔ لیکن ان کی آپس کی سیاسی رقابت اسی طرح جاری تھی۔ اور اپنے اپنے فائدہ کے لئے انہوں نے مرہٹوں کو تائید دینی شروع کی۔ دکن میں حالات بد سے بدتر ہونے شروع ہوئے۔ مرہٹوں نے جو اب کافی زور پکڑ چکے تھے مغلوں کے علاقوں پر بھی چھاپے مارنا شروع کر دیئے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ والے خفیہ طور پر ان کی مدد پر تھے۔ اور اس مدد سے ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح مغلوں کو دکن سے نکال دیں۔ جب یہ حالات قابو سے باہر ہو گئے تو شاہجہاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے عالمگیر کو دوبارہ ۱۶۵۳ء میں دکن میں بھیجا۔ اب پانی سر سے گذر چکا تھا۔ عالمگیر نے اس وقت بھی چاہا کہ بیجاپور

اور گولکنڈہ کو جو مرہٹوں کی طاقت کا اصلی سرچشمہ ہیں خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن شاہ جہاں نے پھر وہی غلطی کی اس نے عالمگیر کو حکم دیا کہ ان اسلامی سلطنتوں سے تعرض نہ کیا جائے۔ بلکہ مرہٹوں پر توجہ کرے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹی طاقت مغلوب نہ ہو سکی ابھی یہ لڑائیاں ہو ہی رہی تھیں کہ شاہجہاں بیمار پڑا۔ اور بھائیوں میں تخت کے لیئے جنگ چھڑ گئی۔ عالمگیر ۱۶۵۶ء میں دکن چھوڑ کر دہلی واپس چلا گیا۔

مرہٹے

جنوبی ہند اور سیواجی

گذشتہ باب میں مرہٹوں کا تذکرہ آچکا ہے جو اس تاریخ میں ایک نیا عنصر ہے۔ اور کہیں یہ لکھا گیا ہے کہ ۱۶۳۷ء میں عالمگیر کے حکم سے جب بیجاپوری جنرل رن دولہ خاں نے جنوب پر حملہ کیا۔ تو مرہٹہ سردار شاہ جی اس کا نایب تھا اور اس کی خدمات کے صلے میں اسکو بنگلور اور جنجی کے علاقے بطور جاگیر دئے گئے تھے۔

شاہ جی نے دکن اور جنوب کے حالات کا غور سے مطالعہ کیا اور مسلمانوں کی آپس کی نااتفاقی سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی ہندو سلطنت قایم کرنے کی تجویز کرنی شروع کی۔ کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور کے صفحہ ۴۶ پر لکھتا ہے:۔

"شاہ جی ملک سے بہت زیادہ لگان حاصل کرتا تھا۔ اس کا ایک حصہ تو بیجاپور بھیجدیا جاتا تھا۔ اور دوسرا حصہ آئندہ بغاوت کے لئے محفوظ رکھتا تھا۔ جنوب میں آنے سے پہلے ہی اس کی ایک جاگیر پونہ میں تھی۔ یہاں اس کا بڑا لڑکا سیواجی

تربیت پا رہا تھا۔ اس جاگیر کا انتظام دادا جی پنتھ کے ہاتھ میں تھا۔ جو نہایت رازداری سے کام کرتا ہوا سیوا جی کو فوجی تربیت دے رہا تھا۔ سیوا جی خود بھی نہایت ذہین تھا۔ اس نے اپنی عمر کے سترہ سال میں ایک جتھا جمع کر کے لوٹ مار شروع کر دی اور رفتہ رفتہ اس قدر طاقت حاصل کر لی کہ دکن کی اسلامی سلطنتوں کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گیا۔ بیجا پور کے چند امرا نے بھانپ لیا کہ سیوا جی جو کچھ کر رہا ہے وہ باپ کے اشارے سے کر رہا ہے۔ شاہ جی کو دربار میں طلب کیا گیا۔ لیکن اس نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ سیوا جی کی ماں کو وہ پہلے ہی چھوڑ چکا ہے۔ اور سیوا جی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن بیجا پور والوں نے اسے قید کر دیا۔"

شاہ جی کا اپنے بیٹے سیوا جی سے تعلق تھا یا نہیں اس کے متعلق یہی مورخ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

" شاہ جی کا ایک خط اس کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کا تعلق اپنے بیٹے سے ضرور تھا۔ اس خط میں اس نے سیوا جی کو لکھا تھا کہ " اگر تو میرا بیٹا ہے تو مدھول کے جاگیردار باجی راؤ گھوڑ پوڑے کو ضرور سزا دینا۔" باجی راؤ گھوڑ پوڑے ایک دوسرا مرہٹہ جاگیردار تھا۔ بیجا پور والوں نے شاہ کو اسی کے حوالے کیا تھا۔ شاہ جی کو قید میں اس نے سخت تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ بیجا پور نے شاہ جی کے قتل کا حکم بھی دیدیا تھا۔ لیکن رن دولہ خان نے سفارش کر کے اس کی جان بچا لی۔"

اس کے بعد شاہ جی نے دربار میں پھر رسوخ حاصل کر لیا۔ اور اس نے اپنی شمالی جاگیر جو پونا میں تھی سیوا جی کو دیدی۔ اور جنوب کی جاگیریں جو بنگلور اور جنجی میں تھیں۔ یکو جی کو دیدی گئیں۔ یکو جی نے بعد میں باپ کے حکم سے تنجاور پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح شمال میں پونا اور

جنوب میں تھا اور اس نئی ہندو سلطنت کے مستقر قرار پائے جسکا تخیل شاہ جی کے دماغ میں پیدا ہوا تھا۔

سیواجی کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ وہ دن بدن طاقت پکڑ رہا تھا۔ اور اسی طاقت کے مٹانے کے لئے شاہ جہاں نے عالمگیر کو بھیجا تھا۔ اور یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ ۱۶۵۶ء میں عالمگیر دکن چھوڑ کر دہلی چلا گیا تھا۔

اِدھر تو عالمگیر شمالی ہندوستان میں بھائیوں سے لڑ رہا تھا اور اُدھر سیواجی نے اور زیادہ طاقت حاصل کرتے ہوئے مغلیہ سلطنت کے علاقوں پر چھاپے مارنے شروع کر دئے۔ عالمگیر ۱۶۵۸ء میں تخت نشین ہوا۔ اور اس نے اپنے جنرل شائستہ خان اور راجہ جسونت سنگھ کو دکن بھیجا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ راجہ جسونت سنگھ غداری کرتے ہوئے سیواجی کو خفیہ طور پر مدد دیتا رہا۔ جس کی وجہ سے شائستہ خان کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ شائستہ خان کے بعد شاہزادہ اعظم دکن کا صوبہ دار بن کر آیا۔ اب جسونت سنگھ نے یہی مناسب سمجھا کہ سیواجی کو کسی طرح راضی کر کے مغلیہ سلطنت کا ایک سردار بنا دے۔ آخر سیواجی کو ۱۶۶۶ء میں دہلی بھیجدیا گیا۔ جہاں اس کو پانچہزاری کا منصب عطا ہوا۔ لیکن سیواجی نے اس کو اپنی توہین سمجھی۔ سیواجی کو قید کر دیا گیا۔ لیکن وہ قید سے فرار ہو کر پھر ۱۶۶۶ء میں مہاراشٹرا پہونچگیا۔ اور از سر نو مغلوں کا مقابلہ شروع کیا۔ اس وقت اس کے ہاتھ سے بیجاپور اور گولکنڈہ کے علاقے بھی محفوظ نہیں رہے۔ یہ اس قدر طاقتور ہو گیا کہ راجہ کا خطاب اختیار کرتے ہوئے ۱۶۷۴ء میں ستارہ میں تخت نشین ہوا۔ اس کی تخت نشینی پر مبارکباد دینے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اپنا ایک نائب شہر سورت سے روانہ کیا تھا۔ اس کا نام سر ہنری آکسنڈن تھا۔

تخت نشینی کے بعد اس نے جنوبی ہند پر توجہ کی۔ اس وقت بیجاپور اور گولکنڈہ میں نااتفاقی تھی۔ سیواجی نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے گولکنڈہ کے بادشاہ ابوالحسن "تاناشاہ" کو اپنی خدمات پیش کیں۔ اور اس میں اس کو کامیابی بھی ہوگئی۔ "تاناشاہ کو یقین دلایا گیا۔ کہ بیجاپور کے ماتحت جنوب میں جس قدر ملک ہے اس پر قبضہ کرکے گولکنڈہ کے حوالے کر دیا جائیگا۔ بیجاپور سے تو دشمنی تھی۔ اس لئے تاناشاہ نے اس کو قبول کرلیا۔ سیواجی کو یہ کامیابی گولکنڈہ کے ہندو وزیر کی طرف سے ہوی۔ "تاناشاہ کا وزیراعظم مادنا پنڈت تھا۔ جس نے سیواجی سے سازش کر رکھی تھی۔ اس سازش کا مقصد کرنل ولکس اپنی "تاریخ میسور" میں لکھتا ہے:-

> "مادنا پنڈت اور سیواجی کے درمیان جو خفیہ عہدنامہ ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بظاہر سیواجی گولکنڈہ کی مدد سے جنوبی ہند کے تمام علاقوں پر قبضہ کرلے۔ اور در باطن تمام مسلمانوں کو جنوبی ہند اور دکن سے نکال دے۔ اور آخر میں گولکنڈہ پر بھی قبضہ کرلے۔"

بہرطور سیواجی اب گولکنڈہ کی ملازمت میں داخل ہوگیا۔ زمانہ کی یہ کس قدر ستم ظریفی تھی۔ کہ مسلمانوں کو ملک سے خارج کرنے کے لئے مسلمانوں ہی سے مدد لی گئی۔ گولکنڈہ کی فوج کا سپہ سالار ہوکر اس نے ۱۶۷۶ء میں جنوب پر حملہ کیا۔ اس کے ساتھ مرہٹی فوج کی بھی بہت بڑی تعداد تھی۔ اس وقت بیجاپور اپنی اندرونی سازشوں میں گرفتار تھا۔ اس نے جنوب میں اپنے مقبوضات پر توجہ نہ کی۔ جس کی وجہ سے مقامی حکام بھی بالکل کمزور ہوچکے تھے۔ سیواجی کرنول اور کڑپہ کے علاقوں سے نکلکر جنوب میں جنجی تک فتوحات کرتا ہوا پہونچ گیا۔ جنجی کے قلعہ دار سدی عنبر نے نہایت سختی سے مدافعت کی۔ لیکن سیواجی نے جو عیاری میں یکتا تھا۔ دہوکہ سے

اس کو قتل کر دیا۔

یہاں تک تو بظاہر سیواجی گولکنڈہ کی ملازمت میں ہونے کا یقین دلاتا رہا۔ جنجی کا مضبوط قلعہ ہاتھ آتے ہی اس نے گولکنڈہ سے سرکشی اختیار کر لی۔ اور ہر جگہ گولکنڈہ کے مسلمان افسروں کو نکالکر مرہٹہ افسروں کو مقرر کر دیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدراس کے رکارڈس میں لکھا ہے :۔

"چھٹی جون تک تو سیواجی اپنے آپ کو گولکنڈہ کا ملازم ظاہر کرتا رہا۔ تیسری جولائی کو معلوم ہوا کہ وہ گولکنڈہ کے افسروں کو نکال کر ہر جگہ اپنے مرہٹہ افسر مقرر کر رہا ہے"۔ (چنگل پٹ ڈسٹرکٹ گزیٹیر)

ان واقعات کی خبر جب تاناشاہ کو پہونچی تو اس کی آنکھیں کھلیں۔ لیکن وہ کوئی عملی کارروائی نہ کر سکا۔ صرف اتنا ہوا کہ فوجی اخراجات کے لئے جو روپیہ بھیجا جاتا تھا۔ وہ بند کر دیا گیا۔ مرہٹے تو لوٹ اور غارتگری میں مشہور ہی تھے۔ انہوں نے ملک کو اس قدر لوٹا کہ ۔ مدراس کے مذکورۂ بالا رکارڈس میں بتاریخ ۲۳ راکٹوبر لکھا گیا ہے :۔

"اگر یہ کہا جائے تو بالکل موزوں ہوگا کہ ملک کی ہڈیاں تک چوس لی گئی تھیں سیواجی اپنے فن میں نہایت درجہ ماہر تھا۔ اسکے ہاتھ سے زمین میں گڑے ہوئے خزائن بھی محفوظ نہیں رہے۔ اس کا خفیہ محکمہ نہایت چست اور اعلےٰ درجہ کا تھا۔ یہ وہ طاقت تھی جس نے توہم پرست لوگوں کے دلوں میں اسکی عظمت کو بڑھا دیا"۔

جنجی کے بعد ویلور پر قبضہ کرتے ہوئے سیواجی تنجاور پر بڑھا۔ جہاں اس کا سوتیلا چھوٹا بھائی یکوجی حکمران تھا۔ یکوجی نے سیواجی کی مخالفت کی۔ ابھی یہ لڑائیاں ہو ہی رہی تھیں کہ سیواجی اپنے ایک سردار کو جنوب میں چھوڑ کر پونہ کو واپس ہوا۔ اس کی واپسی کا راستہ اس

وقت ویلور سے ہسکوٹہ، بنگلور، بالاپور، سرا سے ہوتا ہوا ساونور پر سے مرہٹواڑی کو تھا۔ اس نے ان تمام مقامات پر قبضہ کرکے یہاں سے بیجاپور کے حاکموں کو نکالکر اپنے حاکموں کو مقرر کیا۔ اس طرح ایک نئی ہندو حکومت قایم ہوگئی۔ جس کا ایک سرا تنجاور میں تو دوسرا پونا میں تھا۔ اور ہندوؤں نے سمجھ لیا کہ وہ جس فاتح اور نجات دلانے والے کے منتظر تھے وہ آگیا ہے۔

کرنل ولکس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"اس زمانے میں جب رن دولہ خاں کی فوجیں جنوبی ہند پر قبضہ کر رہی تھیں تو کسی ہندو نے یہ پیشین گوئی کی تھی" ایک زمانہ آئیگا کہ زمین پر آسمانی بلائیں نازل ہونگیں۔ کالی جی زمین پر اتر آئیں گی۔ اور اس وقت ان کے غضب سے کوئی نہیں بچے گا۔ بچہ ہو یا بوڑھا۔ شریف ہو یا رذیل، سرمایہ دار ہو یا مزدور سب تباہ ہو جائیں گے۔ انسانیت کا نام تک باقی نہیں رہیگا۔ ترک لوگ شریفوں کو بھی بکروں کے مانند قتل کردیں گے۔ جب اس حالت پر ایک عرصہ گذر جائیگا تو ایک فاتح اور نجات دینے والا آئیگا جو ہندوؤں کو اس ظلم و ستم سے نجات دیگا"۔ سیواجی کو ہندوؤں نے وہی نجات دہندہ سمجھ لیا"۔

سیواجی کے اس حملہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرا کی مسلمان صوبہ داری ختم ہوگئی۔ اور تمام جنوبی ہند پھر ایکبار مرہٹی ہندوؤں کے قبضہ میں آگیا۔

جنوبی ہند اور مغل

سیواجی پونا ۱۶۶۶ء کے اخیر میں واپس ہوا اس وقت مغل فوج بیجاپور پر حملے کر رہی تھی۔ بیجاپور والوں نے گولکنڈہ اور سیواجی سے مدد چاہی۔ یہ جنگ اسی طرح جاری تھی۔ کہ سیواجی کی وفات ۱۶۸۰ء میں ہوگئی۔ اور اس کا بیٹا سنبھاجی اس کا جانشین ہوا۔ دکن کے معاملات کو سلجھتے نہ دیکھکر خود عالمگیر اورنگ زیب ۱۶۸۲ء میں دکن میں آیا۔ اور بیجاپور کا محاصرہ کرلیا۔ بیجاپور ۱۶۸۶ء میں فتح کرلیا گیا۔ اور اس کے دوسرے سال یعنے ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ بھی مغلوں نے فتح کرلیا۔ دکن کی یہ دونوں اسلامی سلطنتیں ہمیشہ کے لئے ختم کردی گئیں تمام انگریزی مورخوں نے بہ اختلاف الفاظ لکھا ہے کہ:۔

"اگر یہ سلطنتیں باقی رہتیں تو مرہٹی طاقت ترقی نہ کرسکتی۔ ان سلطنتوں کو تباہ کرکے عالمگیر نے مرہٹی طاقت کو ترقی کرنے کا موقع دیا۔"

جنوبی ہند کے بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ:۔

"عالمگیر نے ان اسلامی سلطنتوں کو مٹاکر کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ دکن کی یہ سلطنتیں اگر باقی رہتیں تو جنوب میں اسلام کو بہت ترقی ہوتی۔"

لیکن اگر واقعات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عالمگیر نے جو کچھ کیا وہ عین مصلحت اور سیاستِ وقت کے مطابق تھا۔ ہاں اس بات کے ماننے سے انکار نہیں کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں بہت دیر میں فتح ہوئیں۔ یہ سلطنتیں اگر اسی وقت فتح ہو جاتیں۔ جب وہ دکن کا صوبہ دار ہوکر آیا تھا تو اس کے دو نتیجے نکلتے:۔

(۱) مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی طاقت اسی وقت ختم ہو جاتی۔

(۲) تمام جنوبی ہند مغلوں کے قبضہ میں اسی وقت آ جاتا۔

لیکن زمانہ اس کے خلاف تھا۔ پہلے تو اس کے باپ شاہجہاں نے اسکی مخالفت کی۔ بعد میں تخت نشینی کیلئے خانہ جنگی، اور پھر راجہ جسونت سنگھ کی غداری نے مرہٹوں کو اس قدر طاقتور بنا دیا تھا کہ ان سلطنتوں کے ختم کرنے کے بعد بھی وہ مرہٹوں کے خلاف پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ اور اس کی ناکامیابی کا بڑا سبب یہی دو سلطنتیں تھیں۔

بیجاپور اور گولکنڈہ فتح ہونے کے بعد عالمگیر نے جنوبی ہند پر توجہ کی۔ ممکن تھا کہ عالمگیر کچھ عرصہ تک اس طرف توجہ نہ کرتا۔ یہ تو عالمگیر کو معلوم تھا کہ جنوب میں سرا کی صوبہ داری کا سیواجی نے خاتمہ کر دیا تھا۔ اور تمام ملک پر مرہٹے حکمران تھے۔ یہ لکھا جا چکا ہے کہ تنجاور میں سیواجی کا بھائی یکوجی حکمران تھا۔ شاہ جی نے بنگلور کی جاگیر اسی کو دی تھی۔ لیکن سیواجی نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ سیواجی کی وفات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یکوجی نے چاہا کہ بنگلور کی جاگیر میسور کے راجہ کے ہاتھ فروخت کر دی جائے۔ معاملہ طے ہو گیا۔ صرف قبضہ دلانا باقی تھا اس لئے یکوجی نے تنجاور سے فوج بھیجی۔ کہ بنگلور کو سیواجی کے اہل کاروں کے ہاتھ سے نکال کر میسور کے راجہ کے قبضہ میں دیدیا جائے۔ دوسری طرف میسور کے راجہ کی فوج سرنگاپٹم سے قبضہ لینے کے لئے نکلی۔ تیسری طرف مرہٹواڑی میں سیواجی کے جانشینوں کو جب معلوم ہوا کہ یکوجی اس جاگیر کو فروخت کر رہا ہے تو انہوں نے جنجی کے مرہٹہ سردار کو لکھا کہ بنگلور کی حفاظت کی جائے۔ جنجی سے مرہٹہ فوج بنگلور طرف بڑھ رہی تھی۔

شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب اس وقت گولکنڈہ فتح کر کے اس کے قرب و جوار میں تھا بنگلور کی اہمیت سے وہ واقف تھا کہ کس طرح اس شہر پر قبضہ رکھنے سے تمام بالاگھاٹ اور پائیں

گھاٹ پر اثر پڑ سکتا ہے۔ اس نے اپنے جنرل قاسم خاں کو حکم دیا کہ دن رات کوچ کرکے بنگلور پر قبضہ کر لیا جائے۔

قاسم خاں برقی سرعت سے بڑھا۔ اور ۱۶۸۷ء میں ایک معمولی جنگ کے بعد اس کا قبضہ بنگلور پر ہو گیا۔ جب مخالف فوجوں کو جو بنگلور کی طرف آ رہی تھیں۔ معلوم ہوا تو وہ پیچھے ہٹ گئیں۔ بنگلور کی فتح کے بعد قاسم خاں نے سرا پر قبضہ کر لیا۔ میسور میں اس وقت راجہ چک دیو حکمران تھا۔ یہ مغلوں کا باجگذار بن گیا۔ قاسم خاں نے صدر مقام کے لئے سرا ہی کو منتخب کرتے ہوئے بنگلور کو راجہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس کے بعد قاسم خاں نے ان تمام مقامات کو جو بالاگھاٹ میں مرہٹوں اور پالیگاروں کے قبضہ میں تھے۔ فتح کر لیا۔ سرا کی صوبہ داری از سر نو قایم ہوئی۔ قاسم خاں پہلا صوبہ دار تھا۔ اور اس کو فوجدار دیوان کا خطاب دیا گیا۔ سرا کے ماتحت مندرجۂ ذیل ریاستیں باجگذار تھیں۔

بدنور، بسواپٹن، چتلدرگ، ہاکل واڑی، بالاپور، یلہنکا (ماگڑی) ساگتور، میسور اماتور، یلندورا اور کلالی۔

ان ریاستوں میں صرف ایک میسور ہی ایسی ریاست تھی جو بہ نسبت دوسری ریاستوں کے طاقتور تھی۔

بیجاپور سے نیچے میسور تک تمام ملک جب ایک سال کے اندر مغلوں کے ماتحت آ گیا۔ اور سرا کی صوبہ داری بھی قایم ہو گئی تو عالمگیر نے پائیں گھاٹ پر توجہ کی۔ اور جنرل ذوالفقار خاں کو ۱۶۹۱ء میں پائیں گھاٹ پر بھیجا۔ پائیں گھاٹ میں اس وقت تنجاور میں سیواجی کا بھائی یکوجی، مدورا کا نایک اور جنجی کا مرہٹہ سردار باقی دوسرے راجاؤں اور پالیگاروں سے زیادہ زبردست تھے۔ دوسال کے اندر اندر ذوالفقار خاں نے جنوب کے تمام ملک کو فتح

کرلیا۔ مدورا اور تنجاور والے خراجگذار بن گئے۔ ذوالفقار خاں کے ماتحت مغلوں کی فوج نے جنوب میں جو فتوحات حاصل کیں اور جس قدر جنگیں لڑیں اس کے متعلق کرنل ولکس لکھتا ہے :-

"چھ ماہ کے اندر اندر مغلوں کی فوج نے تین ہزار کوس مسافت طے کی۔ اور ۱۹ خونریز جنگیں لڑیں"۔

جنوبی ہند میں صرف ایک جنجی کا ہی مضبوط قلعہ تھا۔ جس پر مرہٹے قابض تھے۔ ذوالفقار خاں نے ۱۶۹۳ء میں اس کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ نے طول کھینچا۔ ذوالفقار خاں کو کئی بار محاصرہ اٹھا کر ان مرہٹوں کے تعاقب میں جانا پڑا۔ جو جنجی کے مرہٹوں کی تائید میں مرہٹواڑی سے آرہے تھے۔ پانچ سال کے محاصرہ کے بعد ۱۶۹۸ء میں جنجی کا قلعہ فتح ہوگیا۔ اس طرح جنوب کا تمام ملک راس کماری تک مغلیہ سلطنت کے زیر اثر آگیا۔ یہ سلطنتِ مغلیہ کا انتہائی عروج تھا۔

جنوبی ہند اور اہلِ نوایط

کل جنوبی ہند کے فتح ہو جانے پر شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے انتظام کیلئے دکن اور جنوبی ہند کو چھ حصوں پر تقسیم کیا۔

(۱) خاندیس (۲) اورنگ آباد (۳) بیدر

(۴) برار (۵) حیدر آباد (۶) بیجاپور

ان میں آخرالذکر دو صوبے یعنے حیدر آباد اور بیجاپور جنوبی ہند سے تعلق رکھتے ہیں پھر ان دونوں صوبوں میں بھی ہر ایک کے دو حصے کئے گئے۔ صوبہ حیدر آباد کے دو حصوں میں

ایک حصہ حیدرآباد کرناٹک، بالاگھاٹ۔ اور دوسرا حصہ پائیں گھاٹ کے نام سے معروف ہوا۔

حیدرآباد بالاگھاٹ کے ماتحت مندرجہ ذیل اضلاع یا سرکار تھے:۔

سدہوٹ، گنجی کوٹہ، گوتی، گرم کنڈہ اور کھم۔

پائین گھاٹ کے ماتحت وہ تمام ملک تھا جو ساحل سمندر سے لگا ہوا جنوب میں تناولی تک چلا گیا ہے۔ یعنے موجودہ اضلاع گنٹور، نلور، چنگل پیٹ، مدراس، جنوبی ارکاٹ وغیرہ۔ اس کے انتظام کے لئے ایک نائب صوبہ دار مقرر ہوا۔ جس کا صدر مقام جنجی میں تھا۔ جنجی کی آب وہوا ناموافق ہونے کی وجہ سے بعد میں ارکاٹ کا انتخاب کیا گیا۔ بیجاپور کے دو حصوں میں ایک بیجاپور کرناٹک بالاگھاٹ تھا۔ اور دوسرا بیجاپور کرناٹک پائین گھاٹ۔

بیجاپور کرناٹک بالاگھاٹ کے ماتحت مندرجۂ ذیل اضلاع یا سرکار تھے۔

شمال میں دریائے تنگ بھدرا سے شروع ہوکر اضلاع بلاری، اننت پور، موجودہ ریاست میسور اور تمام مغربی ساحلی علاقہ جس میں اضلاع شمالی وجنوبی کنارا، ملیبار، کوچین۔ وغیرہ ہیں۔

پائیں گھاٹ کے ماتحت بارامحل یعنے سیلم، کوئمتور، شمالی ارکاٹ اور ویلور، جنوب میں مدورا تک۔

اس علاقہ کے انتظام کے لئے سرا کو صدر مقام بنایا گیا۔ اور یہاں ایک نائب صوبہ دار رہتا تھا

اس تقسیم میں کڑپہ، کرنول، ادہونی اور نندیال باقی رہ گئے ان میں اول الذکر دو کو حیدرآباد کرناٹک کے ماتحت اور آخرالذکر دو کو بیجاپور کرناٹک کے ماتحت کیا گیا۔

شروع میں یہ انتظام کیلئے صرف ذوالفقار خاں ایک ہی صوبہ دار تھا۔ جس کو فوجدار و دیوان کا خطاب حاصل تھا۔ ۱۷۰۷ء میں عالمگیر کی وفات پر ذوالفقار خاں دہلی چلا گیا۔ اور

اس کے عوض داؤد خاں صوبہ دار مقرر ہوا۔ جس نے جنوب میں اپنی نیابت کے لئے محمد سعید یعنے سعادت اللہ خاں کو جواہل نوائط سے تھا۔ فوجدار دیوان مقرر کیا۔ چار سال کے بعد انتظامی نقطہ نظر سے سرا کی صوبہ داری پر ۱۷۱۵ء میں امین خاں کا تقرر ہوا۔

سعادت اللہ خاں کے ماتحت اس وقت تک سرا اور ارکاٹ دونوں علاقے تھے۔ سرا کی صوبہ داری پر امین خاں کا تقرر اس کو پسند نہ آیا۔ وہ اس علاقے کو اپنے ہی قبضہ میں رکھنا چاہتا تھا۔

کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے :۔

"سرا کے ماتحت میسور کا زرخیز علاقہ تھا۔ اس لئے سعادت اللہ خاں اس علاقہ کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتا تھا۔"

سرا اور ارکاٹ میں رقابت شروع ہوگئی۔ اس کی واضح مثال اس سے ملتی ہے کہ میسور سے خراج حاصل کرنے کیلئے سرا کی فوجیں ایک طرف سے بڑھیں تو دوسری طرف سے ارکاٹ کی فوج بھی سرنگا پٹم پر چڑھائی کی۔ ممکن تھا کہ مسلمانوں کی دونوں فوجیں ایک دوسرے سے جنگ آزما ہوتیں۔ لیکن عین وقت پر دونوں میں سمجھوتہ ہوگیا۔ اور خراج لیکر انہوں نے باہم تقسیم کرلیا۔ اس وقت سعادت اللہ خاں کی کمک پر نوابان کڑپہ کرنول اور سانور کے علاوہ گٹی کا مقامی مرہٹہ حاکم سدوجی گھوڑ پڑے بھی تھا۔

(نوٹ :۔ کڑپہ، کرنول اور سانور کے حاکم پٹھان تھے۔ دراصل یہ نواب وہاں کے مقامی حاکم تھے۔ جنہیں صوبہ دار دکن نے مقرر کیا تھا۔ کڑپہ کا پہلا حاکم عبدالنبی خاں تھا۔ جس نے مقامی طور پر بہت ناموری پیدا کی ہے۔ اس نے ملک کی ابتر حالت سے فائدہ اٹھاکر اپنے علاقہ کو بہت وسیع کرلیا تھا۔ جنوب میں اس کی حدداری سیلم تک پہونچ گئی تھی۔ مغرب طرف پورا اننت پور اس کے قبضہ میں آچکا تھا۔ یہ وہ

زمانہ ہے کہ پٹھانوں کے قافلے کے قافلے شمالی ہندوستان بلکہ افغانستان اور ترکستان تک سے آکر جنوب میں آباد ہونے شروع ہو گئے تھے۔ کڑپہ اور کرنول کے اضلاع میں اب بھی پٹھانوں کی بہت زیادہ آبادی ہے۔ کدری ضلع اننت پور کے قریب تو پورا ایک گاؤں خالص ان پٹھانوں سے آباد ہے اور وہ ابھی تک اپنی قدیم روایات پر چلتے ہیں اور تمام کے تمام قبا کوئے تا جر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شہر سرا میں بھی بارہ ہزار پٹھان تھے۔ اور پورا محلہ پٹھان واڑی کہلاتا تھا۔ نواب حیدر علی کے زمانے میں کڑپہ اور کرنول کی نوابیاں ختم ہو گئیں)

سرنگاپٹم پر یہ حملہ ۱۷۱۳ء میں ہوا تھا۔ تاریخ ہند کے جاننے والے جانتے ہیں کہ اس زمانے میں شمالی ہندوستان کی کیا حالت تھی۔ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کو وفات پائے ہوئے صرف چھ سال کا عرصہ گذرا تھا۔ کہ دہلی میں تخت کے لئے خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر حاکم اور ہر گورنر اپنی اپنی جگہ آزاد ہونا شروع ہو گیا۔

جس طرح شمالی ہند کے حاکموں نے آزاد ہو کر اقتدار حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح سرا اور ارکاٹ کے حاکموں نے بھی کیا۔ وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھنے لگے۔ لیکن سرا کی آزادی اور صوبہ سرا کا علیحدہ ہو جانا ارکاٹ والوں کو پسند نہیں تھا۔ اس لئے دونوں صوبہ داروں میں کش مکش ہونے لگی۔ جس کی مثال اوپر دی گئی ہے۔ اس اختلاف کو ختم کرنے کے لئے صوبہ دار دکن آصف جاہ اول نے سرا کی فوجداری دیوانی بھی ارکاٹ کے نواب سعادت اللہ خاں کو تفویض کر دی۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سرا والوں نے اس فرمان کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ جس کی وجہ سے سرا اور ارکاٹ میں اختلاف بڑھتا رہا۔ لیکن ایس خاں کے بعد اس کے جانشین کمزور ہو گئے۔

اس کمزوری سے سعادت اللہ خاں نے فائدہ اٹھایا۔ اور سرا کی صوبہ داری بھی حاصل

کرنی چاہی۔ نظام الملک آصف جاہ بھی موقع کی تلاش میں تھا۔

ولکس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے :۔

" جب آصف جاہ نظام الملک نے جنوب میں اپنی آزاد حکومت قائم کرنی چاہی تو کامیابی کے لئے یہ ضروری تھا کہ خاندان تیمور سے تعلق رکھنے والوں کا یا ایسے امرا کا جو خود آزاد ہونا چاہتے تھے۔ خاتمہ کر دیا جائے "

بہرطور نظام الملک کی اجازت سے نواب سعادت اللہ خاں نے سرا کی صوبہ داری طاہر خان کے لئے حاصل کر لی۔ ارکاٹ کی فوج سرا پر بڑھی۔ اس وقت سرا میں امین خاں کا جانشین عبدالرسول خاں تھا۔ جنگ میں سرا والوں کو شکست ہوئی۔ عبدالرسول خاں مارا گیا۔ طاہر خاں سرا کا صوبہ دار ہوا۔ سعادت اللہ خاں کی مراد بر آئی۔ وہ اب کل جنوبی ہند کا فوج دار دیوان تھا۔

۱۷۳۲ء میں سعادت اللہ خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال پر دوست علی خان اس کا جانشین ہوا۔ دوست علی خاں کی مسند نشینی سعادت اللہ خاں کے حسب وصیت تو تھی لیکن نظام الملک آصف جاہ کی اجازت نہیں لی گئی تھی۔ اس لئے نظام الملک کو دخل اندازی کے لئے موقع کی تلاش تھی۔ لیکن شمالی ہندوستان کے واقعات اور مرہٹوں سے جنگوں کی وجہ سے نظام الملک کو کوئی موقعہ ایک عرصہ تک ہاتھ نہ آیا۔ اس لئے ارکاٹ میں دوست علی خان کی حکومت مستحکم ہو گئی۔

اسی سال یعنی ۱۷۳۲ء میں ترچناپلی کا راجہ مر گیا۔ اسکی بڑی رانی جانشین ہوئی۔ لیکن ریاست کے وزیر اعظم نے ایک اور دعویدار تخت کے لئے کوشش شروع کی۔ رانی نے تنگ آکر دوست علی سے مدد مانگی۔ دوست علی نے ایک بڑی فوج اپنے داماد حسین دوست عرف چندا صاحب

اور اپنے فرزند صفدر علی کے ماتحت ترچنا پلی کو بھیجدی۔

وِلکس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

" چندا صاحب نے ترچنا پلی کے قلعہ میں داخل ہونے سے پیشتر رانی کے آگے قسم کھائی کہ وہ ترچنا پلی کو فتح کرنے کے بعد رانی کو تخت پر بٹھا کر واپس ہو جائیگا۔

(بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رانی کو مسلمانوں سے مدد چاہتی تھی۔ لیکن وہ بدگمان بھی تھی کہ کہیں مسلمان خود ترچنا پلی پر قبضہ نہ کر لیں۔)

رانی نے اس قسم کا اعتبار کر لیا۔ اور چندا صاحب نے قلعہ میں داخل ہو کر رانی کو قید کر لیا۔ اور قلعہ پر اسلامی عَلم لہرانے لگا۔

وِلکس لکھتا ہے :-

" چندا صاحب نے قرآن مجید پر قسم نہیں کھائی۔ بلکہ ایک اینٹ کو کپڑے میں لپیٹ کر رانی کو دھوکا دیا تھا "

رانی کی مخالف پارٹی نے بھی اس وقت اطاعت اختیار کر لی۔

ترچنا پلی کی فتح کے بعد صفدر علی ارکاٹ کو واپس ہو گیا۔ صرف چندا صاحب وہاں رہا۔ اور اس وقت تمام ملک دریائے کاویری سے نیچے چندا صاحب کے تصرف میں تھا۔

اس وقت ارکاٹ کی وزارت میر آسد کے ہاتھ میں تھی۔ اس کو چندا صاحب سے دشمنی تھی۔ اس کو یہ پسند نہیں تھا کہ چندا صاحب اقتدار حاصل کرلے۔

امور سلطنت سے نواب دوست علی کی غفلت اور صفدر علی کی کم سنی سے فائدہ اٹھا کر میر اسد خود اپنا اقتدار بڑھانا چاہتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ صفدر علی چندا صاحب کو ترچنا پلی میں تنہا چھوڑ کر واپس آ گیا ہے تو اس کو خوف ہوا۔ اس نے صفدر علی سے کہا کہ جب تک

چندا صاحب زندہ ہے۔ امارت صفدر علی کو نہیں مل سکتی۔ صفدر علی اس دھوکے میں آگیا۔ اب دونوں نے مل کر سازش کی۔ انہوں نے پہلے نواب دوست علی خاں کو کہا کہ چندا صاحب کو ترچنا پلی سے واپس بلا لیا جائے۔ جب نواب نے انکی بات نہیں مانی تو بعد میں انہوں نے مرہٹوں سے خفیہ خط و کتابت شروع کی۔ بظاہر اس لئے کہ مرہٹے ترچنا پلی پر حملہ کریں۔ لیکن بہ باطن مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں سے مل کر چندا صاحب کا خاتمہ کردیں۔

دوسری طرف نواب کو دھوکا دینے کیلئے یہ کارروائی کی گئی کہ مرہٹوں سے مقابلہ کرنے کے لئے فوج تیار کی گئی۔ اور اس فوج کو صفدر علی کی زیر کمان رکھا گیا۔ میر اسد کو معلوم تھا کہ بوڑھا نواب میدان جنگ میں نہیں جائیگا۔ جب مرہٹے قریب آجائیں تو صفدر علی فوج کی ناکافی ہونے کا بہانہ کرکے ویلور میں قلعہ بند ہو جائے۔ اس طرح مرہٹے آگے بڑھ جائیں۔ اس خفیہ عہدنامہ کی روسے مرہٹی فوج پائین گھاٹ میں آگئی) خلاف توقع بوڑھا نواب خود میدان جنگ میں آنے کا ارادہ کرلیا۔ اس نے کہا کہ یہ کفر و اسلام کا مقابلہ ہے۔ اس نے اپنے فرزند صفدر علی کو جو اسوقت ارکاٹ سے باہر تھا۔ لکھا کہ آکر اس کے ساتھ مل جائے۔ ترچنا پلی میں چندا صاحب کو لکھا گیا کہ وہ بھی آکر ملے۔ چندا صاحب ہر ممکن سرعت سے آکر نواب سے مل گیا۔ صفدر علی نے دیکھا کہ باپ نے خلاف توقع خود میدانِ جنگ میں آنے کا ارادہ کرلیا ہے تو وہ لیت و لعل کرنے لگا۔

مرہٹی فوج میدانِ جنگ میں عہدنامہ کی روسے آئی تھی۔ لیکن ان کا ارادہ کچھ اور تھا ارکاٹ کی اسلامی فوج اور مرہٹوں کا مقابلہ دامل چری کے پاس ہوا۔ میدان جنگ میں بوڑھا نواب دوست علی مارا گیا۔ مرہٹوں نے میر اسد کو قید کرلیا۔ چندا صاحب شکست کھاکر ترچنا پلی چلا گیا۔ صفدر علی یہ دیکھ کر ویلور میں قلعہ بند ہو گیا۔ اور مرہٹوں سے خط و کتابت

شروع کی۔

مرہٹوں نے بھانپ لیا کہ وہ صفدر علی سے من مانی رقم وصول کر سکتے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ وہ اگر مطلوبہ رقم نہ دیگا تو وہ چندا صاحب سے مل جائیں گے۔ صفدر علی نے مرہٹوں کی شرائط منظور کرلیں۔ جس کی رو سے یہ طے پایا کہ آئندہ وہ اضلاع جو چندہ صاحب کے قبضہ میں ہے۔ مرہٹوں کو مستقل طور پر دیدئے جائیں گے۔ مرہٹے اس وقت روپیہ لیکر ویلور کے مضافات سے ہٹ گئے لیکن انہوں نے بجائے مرہٹواڑی کو واپس ہونے کے ترچناپلی پر حملہ کردیا۔ چندا صاحب نے تین ماہ تک مدافعت کی۔ لیکن جب سامان رسد کی کمی اور قحط سالی شروع ہوگئی تو اس نے اپنے آپ کو مرہٹوں کے حوالے کردیا۔ اس کو اور اس کے لڑکے رضا صاحب کو مرہٹوں نے ستارا کے مقام پر بھیجدیا۔ اور گوتی کے حاکم مراری راؤ کو اس تمام علاقہ کا حاکم مقرر کردیا۔ جو چندا صاحب کے قبضہ میں تھا۔

اس کے چند دن بعد صفدر علی کا انتقال ہوگیا۔ صفدر علی کو خود اس کی بہن نے زہر دیکر ہلاک کرڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ صفدر علی نے ماہ رجب کی عید (کندوری) منانے اپنی بہن کے یہاں ویلور گیا تھا۔ بہن نے پوریوں میں زہر ملا کر کھلا دیا۔ جس کی وجہ سے صفدر علی کا انتقال ہوگیا صفدر علی کی بہن اپنے شوہر مرتضیٰ خان کیلئے مسند امارت حاصل کرنا چاہتی تھی۔

صفدر علی کے انتقال پر ارکاٹ میں اہل نوابط نے اس کے چھوٹے لڑکے محمد سعید کو امارت کے لئے منتخب کیا۔ ادھر ویلور والوں نے مرتضیٰ خاں کو چنا۔ ویلور اور ارکاٹ میں رقابت بڑھنے لگی۔ اس موقع پر نظام الملک آصف جاہ نے حیدرآباد سے ارکاٹ آکر محمد سعید کی امارت کو منظور کرلیا۔ اور آئندہ جھوٹے دعویداران نوابی کا سدباب کرنے کیلئے حکم دیا کہ ہر اس شخص کو جو نواب کہلائے سر دربار لاکر پیٹا جائے۔

ولکس لکھتا ہے :۔

"ملک کی حالت اس وقت اس قدر خراب تھی کہ ہر وہ شخص جس کے قبضہ میں ایک مٹی کا بنا ہوا چھوٹے سے چھوٹا قلعہ بھی تھا۔ نواب کہلاتا تھا۔"

آصف جاہ نے جنوب میں مرہٹوں سے خونریز لڑائیاں لڑیں اور تمام ملک سے مرہٹوں کو بے دخل کیا۔ صرف مراری راؤ کو بطور باجگذار حاکم گوتی میں رہنے دیا گیا۔ نظام الملک آصف جاہ اول کو سلطنت مغلیہ کے معاملے میں مورخ گو ہزار الزام دیں۔ لیکن جنوبی ہندوستان کو جس شخص نے اس وقت مرہٹوں سے بچایا وہ آصف جاہ کی شخصیت تھی۔ نظام الملک واپس جاتے ہوئے خواجہ عبداللہ کو ارکاٹ کا عارضی نواب مقرر کرتا گیا کہ محمد سعید کے بالغ ہونے تک حکومت کرے۔ لیکن خواجہ عبداللہ حیدرآباد جاکر واپس نہ آیا۔ وہاں اس کا انتقال ہوگیا۔ خواجہ جہاں کے عوض انوارالدین کو عارضی نواب مقرر کیا گیا۔ اس نے محمد سعید کو ۱۷۴۲ء میں زہر دیکر ختم کر دیا۔

ولکس لکھتا ہے :۔

"خود اہل نوائط انوارالدین کو ملزم نہیں گردانتے۔ بلکہ وہ اس کا الزام محمد حسین خاں طاہر اور غلام حسین خاں پر لگاتے ہیں۔ جو اہل نوائط سے ہی ہیں۔"

لیکن عام طور پر جو روایت مشہور رہے۔ وہ یہی ہے۔ کہ محمد سعید کے قتل کے معاملہ میں اس کے ماموں مرتضیٰ خان اور انوارالدین کا ہاتھ تھا۔ اول الذکر خیال کرتا تھا کہ محمد سعید کے مرجانے پر امارت اس کو مل جائیگی۔ اور آخرالذکر خود اپنے لیئے امارت چاہتا تھا۔ آخر انوارالدین کامیاب ہوگیا۔ نظام الملک نے اس کی امارت کی تصدیق بھی کردی۔ اس طرح اہل نوائط کی حکومت کا ۲۲ سال بعد ۱۷۴۳ء میں خاتمہ ہوگیا۔ انوارالدین نے نواب ہوتے ہی انگریزوں

کی جانب اپنا میلان طبع ظاہر کرنا شروع کر دیا۔

جنوبی ہند اور خاندان انوری

۱۷۴۳ء۔ انوارالدین کی مسندنشینی کا یہ وہ زمانہ تھا کہ فرانسیسی اور انگریزی قومیں دونوں ساحل کورومنڈل پر مدراس اور پانڈیچری میں عرصہ سے تجارت کر رہی تھیں۔ اور ان دونوں میں تجارتی رقابت کی وجہ سے جنگیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن انہوں نے اب تک ملکی معاملات میں دخل نہیں دیا تھا۔ مگر اب انوارالدین کی وجہ سے وہ میدان سیاست میں بھی اتر آئے۔ کہا جاتا ہے کہ انوارالدین کے والد نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز میں سفر کیا تھا۔ اس وقت انگریزوں نے اس کی بہت آؤ بھگت کی تھی۔ اس کے بعد جب انوارالدین ارکاٹ کا نواب بنا تو انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں نے دعوت دی۔ انوارالدین نے انگریزوں کی دعوت قبول کی۔ محمد علی والا جاہ اپنی ایک یادداشت میں لکھتا ہے :۔

"والد من نظر برہماں رابطہ دیرینہ اول دعوت انگریزاں قبول فرمودند۔ نزد انگریزاں رفتند و اخلاص ایں قوم مضمر داشتند۔"

اس کے صلہ میں انوارالدین نے میلاپور کی جاگیر انگریزوں کو دی۔ اس سے پہلے وہ صرف مدراس میں قلعہ تک محدود اور وہیں تجارت کرتے تھے۔ اس کے بعد جب انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ گئی تو انوارالدین نے انگریزوں کو مدد دی۔ اس کی یہ کارروائی فرانس والوں کو ناگوار گذری۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی حکام ان کے اور انگریزوں کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ اس جنگ میں جس میں انوارالدین نے انگریزوں کو فوج سے مدد دی تھی۔ انوارالدین

کی فوج کو فرانس والوں نے شکست دی ۔ لیکن پھر بھی ان کے گورنر ڈوپلے نے یہ ہی کہ .. لیکن اب بھی ان کے اور انگریزوں کے معاملات میں دخل نہ دے ۔ چنانچہ اس نے انوارالدین کو خط لکھا اور اس میں اس شکست کا حوالہ بھی دیا جو انوارالدین کی فوجوں کو فرانس والوں کے ہاتھ سے ملی تھی ۔ ڈوپلے نے لکھا تھا :۔

" برظاہر است کہ فی مابین انگریز و فرانسیس مدام جنگ و جدال می باشد ۔ و بائد موافقت ہم بہ میان می آید ۔ آں مشفق را لازم است کہ نفع و نقصان ہر دو فرقہ مساوی دارند و باعانت یکطرفہ نہ پردازند ۔ بلکہ محاربہ ہر دو طرف تماشا کنند برادر بزرگ گرامی از مقابلہ من مضرت یافتہ خفیف گردید ۔ بیک حملہ مردانہ قلعہ چینا پٹن بدست آوردم ۔ می ترسم کہ از تعفیہ و ہنگامہ طرفین مبادا مضرتے بآں مشفق برسد ۔ لہٰذا لازم و ضرور است کہ خیال آمدن ایں طرف نہ کنند وگرنہ برق توپ اندازی من بے اختیار است و شعلہ باروت خانہ و بنادیق من از زائلہ منطفی نمی شود ۔ زیادہ چہ برطراز د " (تحفۃ الاخبار)

لیکن انوارالدین پر انگریزوں کا اثر بہت زیادہ تھا ۔ اس نے ڈوپلے کی بات نہ مانی ۔ بلکہ اس کو جواب میں لکھا :۔

" خط مراسلہ کہ مطلبش بے معنی و گزاف لایعنی بود رسید ۔ از خیالات لاف زنی ایشاں تعجب گردانید ۔ جناب مالک الملک حقیقی سکہ حکومت ایں ملک بدست من دادہ و تیغ بے دریغ مارا بنا بر قتل و تلف متمردان و گردن کشان قوت و برش بخشیدہ ۔ دریں صورت لازم و ضرور شدہ کہ بہ حمایت متوسلان و فرماں برداران خود بکوشم و تا مقدور جہت اعانت مطیعان و دوستان خود بجوشم ۔ نمی توانم دید

کہ کسے بر طرف وفا داران من نظر کند وپسندمی توانم کرد۔ کہ اعدے بر مخلصان من بدشمنی سبقت نماید۔ توقع از اظہار مطلق دارم کہ در عوض خا لفتے کہ بادو ستان من بو قوع آمدنام فرقہ فرانسیس دریں ملک باقی نماند۔ ودست درازی کہ بہ تعمہ چینا پٹن کردہ اند۔ در بدلہ آن بنیاد و بندر پھلچری (پانڈیچری) از نہیں بر دارم۔ تحریر وتسطر من بے غلاف است۔ وتقریر من تیغ بے غلاف۔ زیادہ چشم غفلت . . . . . . باد" (تحفۃ الاخبار)

اب فرانسیسیوں کے لئے کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔

انہوں نے اس خط کی پرواہ تک نہ کی۔ گو بعد میں انہیں انگریزوں اور انوارالدین کی متحدہ فوجوں سے شکست بھی ملی۔ لیکن ان کے دل میں انوارالدین کی جانب سے کدورت بیٹھ گئی۔ اس لئے انہوں نے اب اہل نوائط کے اس خاندان کی حمایت شروع کردی۔ جس کے وارث محمد سعید کو انوارالدین نے زہر دیکر ختم کر دیا تھا۔ اب اس خاندان میں چندا صاحب اور اس کا بیٹا علی رضا تھے۔

گذشتہ باب میں یہ کسی جگہ لکھا جا چکا ہے۔ کہ مرہٹوں نے چندا صاحب اور اس کے فرزند علی رضا کو ستارا میں قید کر رکھا تھا۔ ان کے قید ہونے کے بعد ان کے اہل خاندان نے پانڈیچری میں پناہ لی تھی۔ اب ڈوپلے نے انوارالدین کو نیچا دکھانے کیلئے چندا صاحب کی رہائی کی کوشش شروع کی۔ اور وہ کامیاب ہوگیا۔ مرہٹوں نے چندا صاحب کو ڈوپلے کی سفارش پر رہا کر دیا۔ چندا صاحب رہا ہوکر پانڈیچری آگیا اور یہاں اس نے فرانس والوں کی حمایت میں ارکاٹ کی نوابی کا دعویٰ کیا۔

جنوبی ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ۱۷۴۸ء ایک نہایت اہم سال ہے۔ اس سال

چندا صاحب نے ارکاٹ کی نوابی کا دعویٰ کیا۔ اُدھر حیدرآباد میں نظام الملک آصف جاہ کا انتقال ہوگیا۔ جس کی وجہ سے ناصر جنگ اور مظفر جنگ میں تخت کے لئے جنگ چھڑ گئی۔ انوارالدین اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کیلئے ناصر جنگ کے ساتھ مل گیا۔ یہ دیکھ کر چندا صاحب مظفر جنگ کی حمایت میں آگیا مظفر جنگ نے ارکاٹ پر چڑھائی کردی۔ اس وقت فرانس والے مظفر جنگ اور چندا صاحب کے ساتھ تھے ۱۷۴۹ء میں انوارالدین مظفر جنگ کے حملے کو روکنے کیلئے آمبور کے قریب دو پہاڑیوں کے درمیان خیمہ زن ہوا۔ مظفر جنگ اور چندا صاحب اگر چاہتے تو دوسرا راستہ اختیار کرکے ارکاٹ پر قبضہ کرلیتے۔ لیکن چندا صاحب کی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا۔ وہ انوارالدین کی فوجوں پر حملہ آور ہوا۔ میدان جنگ میں انوارالدین مارا گیا۔ اس کا بڑا بیٹا محفوظ خاں اسیر ہوگیا۔ اور چھوٹا والا جاہ محمد علی ترچناپلی کو فرار ہوا۔ اگر مظفر جنگ اور چندا صاحب اسی وقت بڑھکر ترچناپلی پر قبضہ کرلیتے تو محمد علی کا خاتمہ تھا۔ لیکن وہ ارکاٹ میں فتح کا جشن منانے میں لگ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی نے ترچناپلی پہونچکر نواب ناصر جنگ کو تمام کیفیت سے اطلاع دی اور انگریزوں سے بھی مدد چاہی۔ نواب ناصر جنگ جنوب میں آگیا۔ وہ ایک محب وطن حکمران تھا۔ اس نے بھانپ لیا کہ انگریزوں کے ارادے کیا ہیں۔ اس نے محمد علی کو امتناعی حکم دیدیا کہ انگریزوں سے کوئی مدد نہ لی جائے۔ بلکہ اس نے کڑپہ کے پٹھان نواب کو حکم دیا کہ مدراس پر قبضہ کرکے انگریزوں کو شہر بدر کردے۔ لیکن محمد علی نے راجہ رام داس کی معرفت ان کی سفارش کی۔ جس سے انگریز اس وقت بچ گئے۔ ناصر جنگ کے ساتھ اس وقت نوابان کڑپہ، کرنول، ساونور اور گوتی کا مرہٹہ حکمران مراری راؤ اور میسور کے راجہ کی فوج بھی تھی۔ مظفر جنگ نے یہ دیکھکر ہتھیار ڈالدئے۔ چندا صاحب پانڈیچری کو چلا گیا۔ اور بظاہر تمام معاملات ختم ہوگئے۔ لیکن ہندوستان کی قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ معاملات کو یکسو کرکے

نواب ناصر جنگ جب ارکاٹ سے حیدرآباد واپس ہوا تو راستہ میں کرٹپہ کے پٹھان نواب ہمت بہادر خان نے موقع پاکر اس کو شہید کر دیا۔ جس کی وجہ سے پھر مظفر جنگ آزاد ہو گیا۔

ناصر جنگ کی شہادت

صبح کا وقت تھا۔ ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا۔ کہ ناصر جنگ اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر فوج کے معائنہ اور احکام جنگ دینے کے لیئے نکلا۔ جب ہاتھی کرٹپہ کے نواب کے ہاتھی کے مقابل پہنچا تو ناصر جنگ جو کرٹپہ کے نواب سے سلام کا متوقع تھا۔ اپنا ہاتھ اٹھایا۔ چونکہ ابھی کچھ کچھ اندھیرا ہی تھا ناصر جنگ نے سمجھا کہ کرٹپہ کے نواب نے اس کو دیکھا نہیں۔ اس لیئے یہ اپنے ہودے میں اٹھ کھڑا ہوا لیکن اسی وقت دوسری طرف سے دو گولی متواتر مارے گئے۔ جس کی وجہ سے ناصر جنگ فوراً شہید ہو گیا۔

(**نوٹ**:۔ یہ ایک گتھی ہے جو ابھی تک سلجھی نہیں۔ انگریزی مورخ فرانس والوں کو الزام دیتے ہیں۔ کہ انکی سازش سے ناصر جنگ شہید ہو گیا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کرٹپہ کے نواب ہمت بہادر خان کا تعلق انگریزوں سے زیادہ تھا۔ اس لیے کہ ناصر جنگ نے اسی کو اس پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ جو عمل میں نہیں آیا۔ بلکہ اس کے عوض اس نے ناصر جنگ کو ہی شہید کر دیا۔)

اب پھر چندا صاحب کی بن آئی۔ جس نے پانڈیچری سے نکلکر ترچنا پلی کا محاصرہ کر لیا۔ محمد علی نے یہ دیکھکر مدراس کے ایسٹ انڈیا کمپنی (انگریزوں) سے مدد مانگی۔ جہاں سے میجر لارنس کو بھیجا گیا۔ محمد علی نے اس وقت تنجاور اور میسور کے راجہ سے بھی مدد مانگی اور اس کے عوض ڈونڈگل کا ضلع دینا قبول کر لیا تھا۔ میسوری فوج بھی ترچنا پلی پہنچ گئی محاصرہ نے طول کھینچا۔ یہ دیکھ کر مدراس کے گورنر نے یہ تجویز سوچی کہ اگر ارکاٹ پر حملہ کیا جائے تو

چنداصاحب ترچناپلی کا محاصرہ اٹھالیگا۔ اس لئے ۱۷۵۱ء میں ارکاٹ پر چڑھائی ہوئی۔ کلایو نے جو انگریزی جنرل تھا ارکاٹ کو فتح کرلیا۔ جس کے بعد ہی ارکاٹ کا چنداصاحب نے محاصرہ کرلیا

محاصرۂ ارکاٹ

ہمارے مدارس کی مروجہ تاریخوں میں ارکاٹ کے محاصرہ کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ اور کلایو کی جوانمردی کو اتنا بڑھا چڑھا کر لکھ گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مافوق الفطرۃ ہستی تھی جس نے ارکاٹ کی مدافعت کی۔

لکھا جاتا ہے کہ کلایو کے ساتھ صرف دو سو گورے اور تین سو دیسی سپاہی تھے۔ جنہوں نے جان پر کھیل کر ارکاٹ کی مدافعت کی لیکن اس کے بعد ہی جب چنداصاحب کی فوجوں نے ارکاٹ کا محاصرہ کرلیا۔ اور کلایو اور اس کی فوج محصور ہوگئی۔ تو اس محاصرہ میں جو ۵۱ دن تک رہا۔ سامان رسد کی قلت سے مجبور ہو کر دیسی سپاہیوں نے صرف چاول کی پیچ پینے پر اکتفا کی۔ اور لیلے ہوئے چاول انگریزوں کو کھانے کے لئے دئے۔ یعنے کلایو اس قدر ہر دلعزیز تھا کہ دیسیوں نے اس کیلئے اس قدر سختیاں اٹھائیں اور آخر میں کلایو نے محاصرین کو بھگا دیا لیکن ارکاٹ کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں لکھا ہے کہ ارکاٹ کے محاصرہ کے متعلق آج تک تاریخوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ صرف مکالے کے دماغ کی ایجاد ہے۔ ورنہ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔

سر علیپس گبس لکھتا ہے :-

"مراری راؤ (ایک مرہٹہ سردار تھا جو (والاجاہ محمد علی کے خلاف چنداصاحب کی مدد پر آیا تھا مراری راؤ کی فوج بھی ارکاٹ کے محاصرہ میں چنداصاحب کی فوج کے ساتھ شامل تھی۔

محاصرہ کرتے ہوئے گیارہ ہفتے گذر گئے۔ محصورین یعنے انگریزوں کی حالت بالکل سقیم ہو چکی تھی۔ کلایو سامان رسد نہ ملنے سے مایوس ہو چکا تھا۔ نوج بھوک سے پریشان تھی یہ دیکھ کر کلایو نے مراری راؤ کو یول بھیجا کہ کچھ سامان رسد بھیج دیا جائے۔ (یعنے سازش کرکے مراری راؤ کو اپنے ساتھ ملالیا گیا) مراری راؤ نے سامان رسد بھیجتے ہوئے شب میں چندا صاحب کی فوج سے بھی علیحدہ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر چندا صاحب کی فوج نے محاصرہ اٹھا لیا۔ اور انگریزوں اور کلایو کی جان بچ گئی"

یہ وہ بنیادی پتھر تھا جو انگریزی سلطنت کا ہندوستان میں پہلی بار رکھا گیا۔ چندا صاحب کو ترچناپلی کے محاصرہ میں کامیابی نہیں ہوئی۔ خود اس کی فوج نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تو اس نے تنجاور اور میسوری فوج میں پناہ لی۔ لیکن یہاں اس کا سر کاٹ کر سرنگاپٹم بھیجا گیا۔ جہاں اس سر کو عرصہ تک قلعہ کے میسوری دروازہ پر آویزاں رکھا گیا۔ اس طرح اہل نوایط کا آخری چشم و چراغ ختم ہو گیا۔ اور والاجاہ محمد علی ارکاٹ کا نواب مقرر ہوا۔ اور یہ تقرر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت اور سرپرستی میں ۱۷۵۱ء میں ہوا۔

گو اس کے بعد بھی فرانس والوں نے چندا صاحب کے بیٹے رضا صاحب کے لئے بہت کوشش کی۔ لیکن ان کو کامیابی نہیں ہوئی مزید یہ کہ فرانسیسی گورنمنٹ نے اپنے اولوالعزم گورنر ڈوپلے کو فرانس واپس بلا لیا۔ اس کے بعد جو گورنر آتے وہ اس دل و دماغ کے نہیں تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلسل دس سال کی کش مکش کے بعد ۱۷۶۱ء میں فرانسیسی اقتدار کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔)

یہ لکھا جا چکا ہے کہ والاجاہ محمد علی کرناٹک کا نواب بن گیا تھا۔ اس نے انگریزوں کو اس تائید کے صلے میں ۱۵ تعلقے انعام دئیے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے جب ۱۷۵۸ء میں انگریزوں کی

اسی بنگالہ میں سراج الدولہ کے رحم و کرم پر منحصر ہوگئی تو اس نے اپنی فوجوں سے انگریزوں کی مدد کی۔ اس نے اپنی فوج جہازوں میں سوار کرکے کلکتہ کو بھیجی۔ جس کی مدد سے انگریز مرشد آباد پر قابض ہوئے۔ اور ملک بنگالہ ان کے ہاتھ آگیا۔

تصرو والا جاہی کا مصنف لکھتا ہے :۔

" ہمگی فوج بنگان عالی متعینہ قلاع و مقامات کرناٹک سوائے فوج مایحتاج قلعہ چنا پٹن ہمراہ مسٹر کلیوس سواری جہازات برائے مہم کلکتہ روانہ شدہ بود"

تحفۃ الاخبار کا مصنف لکھتا ہے :۔

" بلکہ برعکس آں حسب تجویز ہر دو مشیر جہۃ استیصال کوٹھی انگریز از بنگالہ بہ نواب سراج الدولہ ناظم وقت بنگالہ نگارش نمود۔ سراج الدولہ قائل انا نیتی کردہ بہ حیلہ تصفیہ یک نفر گجراتی کہ بہ کوٹھی انگریز پناہ گرفتہ بود۔ کوٹھی انگریز از بنگالہ خارج گردانید۔ چوں در آں اوقات اہل انگریز اقتدار فوج زیادہ نداشتند جارج پگٹ گورنر چنا پٹن بنا بر کمک افواج مطلوبہ از نواب والا جاہ مستدعی گردید نواب مستطاب بامداد و اعانت افواج پرداختہ۔ پس جارج پگٹ مع جمعیت علاقہ خود مصحوب مسٹر کلیوس المخاطب بہ لارڈ کلیف از سواری جہازات بہ سمت بنگالہ روانہ گردانید۔ نواب والا جاہ تا انجام آں مہم و قیام کوٹھی انگریز در بنگالہ ہرگونہ مدد بعمل آورد۔ و مدام در فکر انصرام آں کار می بود۔ بلکہ ازیں تفکر و تشویش آرام و آسایش خود ترک کردہ بود۔ چنانچہ بہ سبب ایں مہم ضروری توابعان و متعلقات را از متھر نگر طلب داشتہ در فرنگی کونڈہ سکونت ورزید"

محمد علی کو کرناٹک کا نواب بن گیا۔ لیکن فرانسیسی اقتدار اب بھی حیدرآباد میں زوروں پر تھا۔ اب انگریز اور محمد علی دونوں نے حیدرآباد میں سازش کا جال پھیلایا۔ مظفر جنگ کے بعد صلابت جنگ نظام ہوا۔ سازشوں نے صلابت جنگ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد بسالت جنگ اور میر نظام علی خاں دو دعویدار تخت کے لئے نکل آئے۔ جن کی حمایت پر فرانس اور انگریز تھے۔ نظام علی خان کو کامیابی ہوئی۔ یہ کامیابی گویا انگریزوں کی کامیابی تھی۔ محمد علی نے حیدرآباد کی اس ابتر حالت سے خود بھی فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اس کے انگریز دوست اس کی مدد کریں گے۔ اس کا ارادہ تھا کہ حیدرآباد پر خود قابض ہو جائے۔

ماڈرن میسور کا مصنف اپنی کتاب میں میسور کی پہلی جنگ کے اسباب بیان کرتا ہوا لکھتا ہے:

"محمد علی نے نہ صرف حیدرآباد کے خلاف سازش کی تھی بلکہ اس کی بڑھتی ہوئی ہوس حیدرآباد کو بھی اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی۔"

لیکن محمد علی اگر سازشی اور عیار تھا تو اس کے دوست اس سے بڑھکر سازشی اور عیار تھے۔ انہوں نے محمد علی کو تسلی دیدی کہ مناسب موقع کے انتظار میں رہے۔ لیکن اسی وقت میسور میں ایک نئی طاقت ظہور میں آئی (جس کا آغاز بتلا رہا تھا کہ تمام جنوبی ہندوستان پر چھا جانے والی ہے) اور یہ طاقت حیدر علی کی تھی۔ جس نے محمد علی، انگریز اور نظام تینوں کی توجہ کو اپنی جانب جذب کر لیا۔

(۱) محمد علی اپنے آپ کو تمام جنوبی ہند کا حکمران سمجھتا تھا۔ اس کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ صوبہ سرا بلکہ جنوبی ہندوستان ایک دوسری طاقت کے ہاتھ میں چلا جائے۔

(۲) انگریزوں کو خوف ہو چلا تھا کہ ان کے منصوبے خاک میں ملنے والے ہیں۔

(۳) حیدرآباد۔ محمد علی اور انگریزوں کے جال میں پھنس کر حیدر علی کے خلاف ہو گیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اگر حیدر علی کا آغاز نہ ہوتا تو حیدرآباد اسی وقت مٹ جاتا۔ لیکن اب محمد علی اور انگریزوں کی توجہ میسور کی جانب ہو جانے سے حیدرآباد نظام علی خان کے لئے محفوظ ہوگیا۔ اور ان تینوں نے مل کر اس نئی طاقت کے خلاف جو کچھ کیا۔ وہ ایک علیحدہ تفصیل کا محتاج ہے۔ اور یہ تفصیل "تاریخ سلطنت خداداد میسور" میں دیکھی ہے اور مختصر طور پر تاریخ میسور کے عنوان سے ضمیموں میں دی گئی ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ محمد علی اور انگریز حیدرآباد سے غافل تھے۔ ادھر تو حیدرآباد کو ملاکر حیدر علی کے خلاف سازش کرتے رہے تو دوسری طرف نظام علی خاں کی مجبوریوں سے فائدہ بھی اٹھاتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود نظام علی خاں بھی محمد علی کی سازشوں سے تنگ آگیا تھا۔ اس کا ثبوت اس عہدنامہ سے ملتا ہے۔ جو جنرل کالاڈ نے ۱۷۶۶ء میں محمد علی کے ایجنٹ کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس عہدنامہ کی رو سے جنوب کا تمام ملک پانچ لاکھ روپیوں کے عوض محمد علی اور اس کی اولاد کی حکومت میں نسلاً بعد نسل دیدیا گیا۔ اور اس کے عوض محمد علی کی جانب سے کمپنی نے حیدرآباد کو یقین دلایا کہ آئندہ وہ حیدرآباد کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریگا۔

یہ اوپر کہیں لکھا گیا ہے کہ اگر محمد علی سازشی اور عیار تھا تو اس کے دوست اس سے زیادہ چالاک تھے۔ اب انہوں نے چاہا کہ خود محمد علی سے فائدہ اٹھائیں۔ انہوں نے پہلے محمد علی سے اور بعد میں حیدرآباد سے یہ تسلیم کرالیا کہ کمپنی محمد علی کی ایجنٹ ہے۔ اس کے ساتھ ایک تیسرا معاہدہ بھی ہوا۔ جس میں ملک کرناٹک، سرا وغیرہ کی دیوانی انگریزوں کو تفویض کردی گئی۔ اور ان تمام سندات و اعزازات کو جو بسالت جنگ نے حیدر علی کو شہنشاہ ہند سے دلائے تھے۔ منسوخ قرار دیدیا گیا۔ اور محمد علی کو سرا کا بھی صوبہ دار مان لیا گیا (سندس انڈ ٹریٹیز)

(یہاں یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ اس وقت حیدرآباد میں انگریزوں کا جوسب سے زیادہ دوست تھا۔ وہ رکن الدولہ وزیر تھا۔ جس کی وجہ سے حیدرآباد ان سازشوں کا شکار ہوکر رہ گیا۔ اور کرناٹک سے دست برداری بھی دیدی)

محمد علی کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ وہ اپنے آپ کو اب عام جنوبی ہند کا حکمران سمجھنے لگا۔ (یہ وہ خواب تھا جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا) ایسٹ انڈیا کمپنی بھی اس کو یہی یقین دلاتی رہی کہ وہ جو کچھ بھی کر رہی ہے۔ اسی کے لئے کر رہی ہے۔ اور محمد علی کو اس پر یقین بھی تھا۔ اور اس کے لئے اس کے پاس وجوہات بھی تھیں۔ اس لئے کہ جارج سوم (George III) شاہ انگلستان بذاتِ خاص اس سے بحیثیت ایک ذاتی دوست کے خط وکتابت کرتا تھا۔ ایک خط میں جارج سوم نے محمد علی کو لکھا :-

" آپ کی اور آپ کے بچوں کی تصویر ہم کو ہمیشہ اس محبت کی یاد دلائیگی۔ جو آپ کو ہماری قوم سے ہے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہی محبت آپ کی اولاد بھی ہم سے کریگی۔ اور ہماری بھی ہر وقت یہی کوشش ہوگی کہ آپ کی اور آپ کی اولاد کی نسلاً بعد نسل اسی طرح حفاظت کرتے رہیں "

۱۷۶۹ء میں مدراس کے فورٹ سنٹ جارج میں جو میٹنگ ہوئی۔ اس کی روداد لکھتے ہوئے پرسیڈنٹ نے لکھا :-

" ہماری تمام تر توجہ اور امداد نواب کے حق میں ہونی چاہئے۔ جو ہمارا قدیم اور پُرخلوص دوست ہے "

اس ظاہری محبت آمیز سلوک کا جواب محمد علی نے جس طرح دیا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے۔

"وائز آف کرسچین پوران انڈیا" کا مصنف لکھتا ہے :۔

" جب لارڈ مکارٹنی مدراس کا گورنر ہو کر آیا تو محمد علی نے اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ۔ اور جس وقت لارڈ مکارٹنی دربار میں پہونچا تو اس کو پوری سلامی دی گئی اور نواب نے ۳۰ ہزار پونڈ بطور تحفہ اس کو دیئے ۔"

اس پُر خلوص دوستی کو تین سال نہ گذرے تھے کہ میسور کی تیسری جنگ میں ٹیپو سلطان کو ۱۷۹۲ء میں شکست ہوئی ۔ اور انگریز مظفر و منصور ہوئے ۔ گویا اب جنوبی ہند میں ان کی طاقت مسلم تھی ۔ اور وہ سب سے بڑھ گئی تھی ۔ اب انہیں محمد علی کی دوستی کی ضرورت نہیں رہی ۔ ٹیپو سلطان سے جو ملک حاصل ہوا تھا ۔ اس پر انہوں نے براہ راست اپنی حکومت قایم کر لی ۔ محمد علی نے اس موقع پر احتجاج بھی کیا ۔ لیکن ایک معاہدہ کے ذریعہ اس کو سمجھا دیا گیا کہ ملک کے بہترین نظم و نسق کے لئے ایسا کیا جا رہا ہے ۔

انہیں حالات میں ۱۷۹۵ء میں محمد علی نے ترچناپلی میں وفات پائی ۔ محمد علی کا آغاز جن حالات میں ہوا تھا اور خاتمہ بھی جن حالات میں ہوا ۔ اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسکی حیثیت کبھی شاہ شطرنج سے بڑھکر نہیں رہی ۔ لیکن اس نے اس طویل مدت میں یعنے ۱۷۴۹ء سے ۱۷۹۵ء تک جو کچھ کیا ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام ملک دوسروں کا غلام بن گیا ۔

ارکاٹ کا حشر

محمد علی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عمدۃ الامراء مسند نشین ہوا ۔ اس وقت تک ملک میں ارکاٹ کے عامل بھی تھے ۔ اور انگریزوں کے بھی ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اب اس دو عملی کا بھی خاتمہ کر دینا چاہا ۔

لارڈ ولزلی نے جو اس وقت گورنر جنرل ہو کر آیا تھا۔ ۲۴ را پریل ۱۷۹۹ء میں عمدۃ الامرا کو خط لکھا :-

" یہ آپ کو معلوم ہے کہ ٹیپو سلطان سے جنگ چھڑنے والی ہے۔ اگر یہ جنگ چھڑ جائے تو اس جنگ کو بہترین طور پر انجام۔ دینے کے لئے ضروری ہے کہ تمام ملک کرناٹک کو کمپنی اپنے قبضہ میں کر لے "

ولزلی کو معلوم تھا کہ عمدۃ الامراء آسانی سے اس پر راضی نہ ہوگا۔ اس لئے اس نے خط میں عمدۃ الامراء کو اس قرضہ پر توجہ دلائی۔ جو ارکاٹ کی جانب سے واجب الادا تھا۔ یہ وہ رقم تھی جو کمپنی نے کرناٹک کی مدافعت کیلئے اپنی فوج رکھنے کے لئے خرچ کی تھی۔ قرضہ اس لئے واجب الادا تھا کہ محمد علی کی فوج نہ جنگ کے قابل تھی اور نہ انتظام کے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ میسور کی پہلی، دوسری بلکہ تیسری جنگ بھی محمد علی کے ملک کی حفاظت کے لئے ہی کی گئی تھی۔ اس قرضہ کا مطالبہ کرتے ہوئے لارڈ ولزلی نے ملک کی حالت پر بھی توجہ دلاتے ہوئے عمدۃ الامراء کو اسی خط میں لکھا :-

" دوعملی کی وجہ سے ملک میں بے حد بدنظمی موجود ہے۔ اسکی وجہ سے آپ کو بھی محاصل برابر وصول نہیں ہوتے۔ اور ہمیشہ پریشانی رہتی ہے۔ اگر کمپنی ملک کا پورا انتظام لے لے تو آپ کو بغیر کسی تکلیف کے محاصل کی خالص آمدنی میں سے پانچواں حصہ دیدیا جائیگا "

اس کے جواب میں عمدۃ الامرا نے لکھا کہ ۱۷۹۲ء کے معاہدہ میں اس نے کوئی علاقہ کمپنی کے لئے مخصوص نہیں کیا تھا۔ اور یہ کہ اس کو اس ملک اور مال غنیمت میں بھی حصہ ملنا چاہئے۔ جو ٹیپو سلطان سے حاصل ہوا تھا۔ کیونکہ وہ ہر سال نو لاکھ طلائی ہن انگریزی فوجوں پر خرچ کر رہا ہے۔

اور انہی فوجوں نے ٹیپو سلطان سے جنگ کی تھیں۔ اس خط کا جواب ولزلی کی جانب سے کچھ نہیں ملا۔ وہ اس وقت میسور کی چوتھی جنگ میں مصروف تھا۔ جنگ ختم ہوگئی۔ سلطنت خداداد کا خاتمہ ہوگیا اب اس کے بعد لارڈ ولزلی نے کرناٹک پر توجہ کی۔ ادھر سے مدراس کے گورنر ہنری ڈ نڈاس نے بھی دوبارہ ۵ راگست ۱۷۹۹ء میں گورنر جنرل کو کرناٹک کی دولت کا خاتمہ کرنے کیلئے لکھا ولزلی پہلے ہی سے سودا تیار کر رکھا تھا۔ اب اس نے عمدۃ الامراء پر الزام لگاتے ہوئے لکھا۔

"وہ اور اس کے باپ محمد علی نے میسور کی تیسری جنگ کے بعد ٹیپو سلطان سے خط و کتابت اور انگریزوں کے خلاف سازش کی تھی۔ یہ تمام خط وکتابت اب ٹیپو سلطان کے کاغذات میں ملی ہے۔"

عمدۃ الامراء نے اس سے انکار کیا۔ اور اسی خط میں اس نے لارڈ ولزلی کو ٹیپو سلطان پر کامل فتح پانے کی مبارک باد دی۔

عمدۃ الامراء کے انکار پر لارڈ ولزلی نے کچھ کارروائی کرنی مناسب نہیں سمجھی اسلئے کہ اسکی تمام تر توجہ اسوقت مرہٹوں کی جانب تھی لیکن وہ ارکاٹ سے غافل بھی نہیں تھا۔ بالکل اسی طرح انگریز اس سے غافل نہیں تھے وہ لارڈ ولزلی کو برابر توجہ دلاتے رہے۔ اور وہ بھی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے مدراس کے گورنر ہنری ڈنڈاس کے ایک خط کے جواب میں لکھا:۔

"رائز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا" کا مصنف لکھتا ہے:۔

"جب تک عمدۃ الامراء اور انگلستان کی براہ راست خط وکتابت رہے گی۔ ہم اس کے ملک پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم اس وقت تک انتظار کرتے رہیں کہ عمدۃ الامراء کی وفات پر مسند نشینی کے لئے جھگڑے پیدا ہوں۔"

ہنری ڈنڈاس کو یہ خط لکھنے کے بعد اس نے انگلستان کے وزیر اعظم کو لکھا کہ:۔

"ہندوستان میں کمپنی کے مفاد کے خیال سے شاہ انگلستان کو عمدۃ الامراء سے خط وکتابت کرنے سے روک دیا جائے۔"

یہ خط وکتابت بند ہوگئی۔ اور اب ایسٹ انڈیا کمپنی کو صرف عمدۃ الامراء کی موت کا انتظار تھا۔ اور خوش قسمتی سے یہ موقع بہت جلد آ گیا۔

۱۸۰۱ء میں عمدۃ الامراء بیمار ہوا۔ مورخ باسو لکھتا ہے :۔

"۵ جولائی ۱۸۰۱ء میں کرنل میاک نیل نے فوج بیکرچی باک (مدراس) کے محل کا محاصرہ کرلیا۔ جس میں عمدۃ الامراء بیمار پڑا تھا۔ عذر کیا گیا کہ نواب کی جانشینی کے لئے محل میں ممکن ہے کہ ہنگامہ ہو جائے۔ صرف اس کو روکنے کیلئے یہ فوج آئی ہوئی ہے۔ میجر گرانٹ جب محل میں گیا تو بوڑھا نواب اپنے بستر سے اٹھا۔ اور میجر گرانٹ سے التجا کی کہ اس آخیر وقت میں اس کو اس طرح اس کی رعایا کے سامنے ذلیل نہ کیا جائے کہ فوج آکر اس کے محل پر قبضہ کرلے۔ میجر گرانٹ نے کرنل میاک نیل سے جب یہ بات جاکر کہی تو اس نے انسانیت کو کام میں لاکر فوج کو اندر داخل ہونے سے روک دیا۔ لیکن محاصرہ بدستور جاری رہا۔ آٹھ دن کے بعد عمدۃ الامراء کا انتقال ہوگیا۔ نواب کے انتقال ہوتے ہی اس کے جانشین کو اس کے کمرہ سے کھینچکر لایا گیا۔ اور اس سے کہا گیا کہ اس کے دادا نواب والاجاہ محمد علی اور باپ نواب عمدۃ الامراء اور ٹیپو سلطان کے درمیان جو خط وکتابت اور سازش ہوئی ہے۔ اس کا جواب دیا جائے۔"

(نوٹ :۔ بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ والاجاہ محمد علی نے سازش کی تھی تو یہ کس قدر ستم ظریفی تھی کہ اس کا جواب اس کے پوتے سے طلب کیا جائے)

بے قصور شہزادہ آخر اس کا جواب کیا دے سکتا تھا۔ اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ لیکن کمپنی نے دادا کے مفروضہ جرم پر پوتے کو محروم کر کے ۲۸ر جولائی ۱۸۰۱ء میں اعظم الدولہ کو منتخب کیا جس نے کمپنی کی تمام شرائط کو منظور کر لیا۔ اعظم جاہ کو نواب کرناٹک کا خطاب دیا گیا۔ اور نوابی کی تمام ظاہری شان قایم رکھی گئی۔ دوعملی کا خاتمہ کر کے انگریزوں نے ملک پر مکمل قبضہ کر لیا۔ سلطنت خداداد کے تمام مقبوضات یعنی میسور وغیرہ کمپنی کے قبضہ میں آچکے تھے۔ اب جنوبی ہند میں صرف چار اضلاع بلاری، کڑپہ، کرنول اور انت پور باقی تھے۔ جو حیدرآباد کو دیدے گئے تھے۔ لیکن کمپنی نے اسی سال ایک معاہدہ کے ذریعہ ان اضلاع کو بھی لے لیا۔ اسطرح تمام جنوبی ہند مسلمانوں کے قبضہ سے نکلکر ۱۸۰۱ء میں انگریزوں کے ماتحت آگیا۔ اور اسی سال تنجاور کی مرہٹی ریاست کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ جو پہلے نواب ارکاٹ کی اور بعد میں براہِ راست ایسٹ انڈیا کمپنی کی باجگذار بنی ہوی تھی۔

سلطنت خداداد اور ارکاٹ کے خاتمہ کے بعد ملک میں جو ریاستیں باقی رہ گئیں۔ وہ یہ ہیں :- میسور، ٹراونکور، کوچین، پدوکوٹہ، سندور اور بنگن پلی۔ ان ریاستوں کی مختصر تاریخ ضمیمہ میں دی گئی ہے۔ ان ریاستوں کے علاوہ ملک میں کئی ایک زمینداریاں بھی ہیں۔

نوابانِ ارکاٹ کی ظاہری شان وشوکت لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ تک رہی۔ اور یہ بھی صرف اس لئے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی پوری توجہ شمالی ہند کی تسخیر پر تھی۔ اس کے بعد ۱۸۵۵ء میں انہوں نے نوابان ارکاٹ کی ظاہری شان وشوکت کو بھی ختم کر دینا چاہا۔ لارڈ ہارس نے جو اس وقت مدراس کا گورنر تھا۔ لارڈ ڈلہوزی کو لکھا۔

" نوابان ارکاٹ کو ملک کے اصلی وارث مانتے ہوئے ان کی ظاہری شان وشوکت

کو اسی طرح قایم رکھا گیا تو احتمال ہے کہ آئندہ اس ملک میں سازش اور بغاوت ہو۔"

اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لارڈ ڈلہوزی نے ارکاٹ کی برائے نام نوابی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ نواب غلام غوث خاں ارکاٹ کا آخری نواب تھا۔ اس کی وفات پر اسکے جانشین کو نواب کے خطاب سے بھی محروم کر دیا گیا۔ اور تمام ظاہری شان وشوکت کو ختم کر کے اس کے جانشین کو پرنس آف ارکاٹ (Prince of Arcot) کا خطاب دیتے ہوئے پنشن دیدی گئی۔

اس پر رائے زنی کرتے ہوئے مورخ باسو لکھتا ہے ۔

"کمپنی نے عظیم جاہ کو بھی نواب کے خطاب سے محروم کر دیا۔ اگرچہ قانونی طور پر وہ نواب کے جانشین تھے اور انہیں نوابوں کی دی ہوئی سندات سے وہ ملک پر حکومت کر رہے تھے۔

خاتمۃ الکتاب

اس کتاب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح ملک کی دو بڑی قوموں میں سیاسی برتری کیلئے پانچسو سال تک خونین ہنگامے برپا رہے اور جب ملک مسلمانوں کے ہاتھ آگیا تو کس طرح ان کی آپس کی نااتفاقی رشک و حسد اور خود غرضی سے انکی بنی بنائی حکومتیں غیروں کے ہاتھ میں چلی گئیں اور وہ حاکم سے محکوم بنکر رہ گئے۔

اب پہلا سوال یہ ہے کہ دونوں قومیں کبتک اسطرح ایک دوسرے سے علیحدہ رہینگی؟ مسلمان اس ملک کو اپنا بنا چکے ہیں۔ ہزار سالہ رہائش نے انہیں یہ حق دیدیا ہے کہ اس ملک کو وہ اپنا ہی سمجھیں۔ اسکے باوجود بھی اگر یہ کہا جائے کہ یہ ملک مسلمانوں کا نہیں ہوسکتا تو ساتھ ہی یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ملک ہندوؤں کا بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ بھی تو کسی زمانے میں باہر ہی سے آئے ہوئے تھے۔ جس طرح مسلمانوں نے ملک ہندوؤں سے حاصل کیا۔ اسیطرح ہندوؤں نے قدیم جنگلی اقوام سے حاصل کیا تھا اس لئے یہ مسئلہ ہی خارج از بحث ہے کہ ملک ہندوؤں کا ہے یا مسلمانوں کا۔ خصوصاً ایک ایسے وقت جب ملک پر ایک دوسری ہی قوم حکمران ہے۔

مصنف کتاب اس سے بھی آگاہ ہے کہ دن بدن ملک میں یہ جذبہ ترقی کر رہا ہے کہ غیروں کی محکومی سے نجات حاصل کیجائے لیکن جبتک ان دونوں قوموں میں حقیقی اتحاد نہ ہو یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہوسکتا۔ تقریروں اور رزولیوشنوں سے اتحاد قایم ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ زاویۂ نگاہ کو بدلا جائے قلب میں وسعت پیدا ہو۔ اور ایک دوسرے کے جائز حقوق کا احترام کیا جائے۔

دیباچہ میں میں نے لکھ آیا ہے:۔

"آج ہندوؤں کے ایک طبقہ میں پھر وہی جوش وخروش پایا جاتا ہے۔ جو آج سے
چھ سو سال پیشتر موجود تھا۔ آج پھر وہی آواز ملک میں گونج رہی ہے کہ ہندوستان
ہندوؤں کیلئے ہے۔ اور مسلمانوں کو کوئی حق نہیں کہ اس ملک کو اپنا سمجھیں۔"

اسلئے ابتدا جب ہندوؤں سے ہوئی ہے تو ضروری ہے کہ اتحاد کرنے کیلئے وہ خود پیش قدمی کریں۔ مجھے امید ہے کہ جب حقیقی اتحاد کیلئے ہاتھ بڑھایا جائیگا تو مسلمان ضرور خوشی سے خیر مقدم کرینگے۔

اب دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ملک میں ایک حقیقی اتحاد پیدا ہونے اور غیروں کی محکومی سے آزاد ہونے کیلئے ضروری ہے کہ خود مسلمان ایک نقطۂ نظر پر متحد ہو جائیں ورنہ جبتک ان میں اتحاد پیدا نہیں ہوگا مقصد براری مشکل ہے۔ میں نے یہ اس لئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ انہیں نہ صرف مذہبی اختلافات ہیں بلکہ سیاسی طور پر بھی مسلمان علیحدہ علیحدہ جماعتوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔

"تاریخ ہمارے آگے ہے۔ وہ بتلا رہی ہے کہ کس طرح دکن کی اسلامی سلطنتیں مذہبی اختلافات کی آگ میں بھسم ہو کر رہگئیں۔ کس طرح سیاسی اختلافات اور خودغرضیوں نے ارکاٹ، سرا اور سلطنتِ خداداد کو تباہ کرکے رکھدیا۔

دیباچہ میں میں نے یہ بھی لکھ آیا ہے کہ :-

"میرا کام صرف واقعات پیش کرنا تھا"

میں نے پورا کر دیا ہے۔ تسلسل کا لحاظ کرتے ہوئے متن میں جن واقعات کو بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ضمیموں میں اس کمی کو پورا کر دیا گیا ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کتاب کو شائع کرتے ہوئے میں نے ایک علمی و قومی خدمت انجام دی ہے۔ مقبولیت اسی کارساز حقیقی کے ہاتھ ہے۔ جس نے مجھے اسکے پورا کرنے کی توفیق بخشی۔

بنگلور مورخہ ۳۰ ر اکتوبر ۱۹۳۹ء

[signature]

ضمیمے

ضمیمہ (۱)

تاریخِ میسور

موجودہ زمانے میں میسور سے مراد وہ تمام علاقہ لیا جاتا ہے۔ جو ریاستِ میسور کہلاتا ہے۔ اور جس کا رقبہ ۲۹۳۲۶ مربع میل اور آبادی پینسٹھ (۶۵) لاکھ ہے۔ جس میں مسلمان چار لاکھ، عیسائی ایک لاکھ اور باقی ساٹھ (۶۰) لاکھ ہندو ہیں۔ جن میں چار لاکھ کے قریب برہمن ہیں۔ بجٹ قریباً چار کروڑ ہے۔ اس ریاست کی تشکیل سلطنت خداداد کی تباہی کے بعد عمل میں آئی۔ لارڈ ولزلی نے ۱۷۹۹ء میں سقوط سرنگاپٹم اور ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد مناسب سمجھا کہ سلطان کے بچوں کو سلطنت سے محروم کرکے ایک ہندو ریاست قایم کرے۔ جو انگریزی مفاد کی ممد و معاون رہے۔ ورنہ موجودہ خاندانِ میسور کے زیرِ حکومت جو ملک قدیم زمانے میں تھا۔ اس کی وسعت چند میل سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس کا رقبہ موجودہ شہر میسور، کروگ ہلی اور ہڑناڈ کی جاگیروں تک محدود تھا۔

بہرطور میسور کی موجودہ ریاست جن علاقوں پر مشتمل ہے ساحلی علاقوں کی قدیم تاریخ جنوبی ہند کی تاریخ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ وہ تمام خاندان سوائے دو چار کے جن کا ذکر اس کتاب کے پہلے باب میں آچکا ہے۔ اس ملک کے مختلف حصّوں میں حکمران رہ چکے ہیں۔ لیکن جس طرح جنوبی ہند کی قدیم تاریخ قعرِ گمنامی میں پڑی ہوئی ہے۔ میسور کی تاریخ کی بھی۔ یہی

حالت ہے۔ مذہبی روایات نے اس سرزمین کو راماین اور مہابھارت سے وابستہ کر رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ راجندر جی شمال سے آکر اس ملک ہی میں سرینگری کے مقام پر ٹھہرے تھے۔ کتاب مہاوساسے پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ اسوکا نے تبلیغ مذہب کے لئے اس ملک میں بھی مبلغین کو روانہ کیا تھا۔ (امپیریل گزیٹیر آف انڈیا)

میسور میں اس زمانہ کا جو کتبہ دستیاب ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "تیسری صدی میں اس ملک کا شمال مشرقی حصہ مہاراجہ اسوکا کی سلطنت کا ایک حصہ رہا تھا"۔(تاریخ میسور)

لیکن بعض مورخین کہتے ہیں کہ اسوکا نے صرف تبلیغ مذہب کے لئے یہاں مبلغین کو روانہ کیا تھا۔ اس کے بعد آندھرا اور ستیاون خاندان یہاں حکمران رہے ہیں۔ تیسری صدی عیسوی میں چولا اور ہوسے سالا خاندانوں کی حکومت اس ملک میں رہی۔ بعد میں ہوسے سالا خاندان ملک پر پوری طور پر قابض ہوگیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت زبردست راجدھانی تھی۔ جس کا تمام جنوبی ہند پر نہایت مستحکم اثر قایم تھا۔ اس خاندان میں بٹی دیوا جس کا عہد ۱۱۰۴ء سے ۱۱۴۱ء تک ہے۔ نہایت زبردست راجہ گذرا ہے۔ اسی خاندان میں راجہ بلاسوم بھی ہوا ہے۔ جس پر ملک کافور ۱۳۱۰ء میں حملہ آور ہوا تھا۔ اس وقت اس راجدھانی کا پایۂ تخت دوارسمندرم میں تھا۔ جس کو اب ہلے بید کہا جاتا ہے۔ راجہ بلالاسوم کو اس جنگ میں شکست ہوئی۔ ملک کافور نے اس کو قید کر کے دہلی بھیجدیا۔ جہاں شہنشاہ علاؤالدین نے باجگذاری کا عہد لیکر اس کو رہا کردیا۔ شہنشاہ علاؤالدین کے بعد جب پھر راجہ نے سرکشی کی تو مبارک شاہ خلجی نے اس پر دوبارہ فوج کشی کی۔ تیسرا حملہ اس ملک پر محمد بن تغلق کے زمانہ میں ہوا۔ جب راجہ نے اس کے بھتیجے گشتاسپ کو پناہ دی تھی۔ شہنشاہ محمد بن تغلق کا حملہ اپنے اثر کی وجہ سے ایک یادگار حملہ ہے۔ شہنشاہ ترکی النسل تھا اور راسی

لحاظ سے آج بھی مسلمانوں کو نہ صرف میسور بلکہ کل جنوبی ہند میں "ترک" کہا جاتا ہے۔

شہنشاہ محمد بن تغلق کا ہی آخری زمانہ تھا کہ اس کے گورنر دکن۔ مدورا، ملیبار وغیرہ میں باغی ہوگئے۔ اور ہندوؤں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنتِ وجیانگر کی بنیاد ڈالی۔ سلطنت وجیانگر کے ابتدائی زمانہ میں ہوسے سالا سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا اور سلطنت وجیانگر نے جنوبی ہند اور ملک میسور پر بتدریج قبضہ کر لیا۔ اور اس کی جانب سے حکمرانی کے لئے ہر جگہ وائسرائے اور گورنر مقرر ہوئے۔ میسور میں بھی ایک وائسرائے مقرر ہوا۔ جس کا مستقر سرنگا پٹم تھا۔ ملک کے تمام چھوٹے چھوٹے راجہ جنہیں پالیگار کہا جاتا ہے اس وائسرائے کو خراج دیتے تھے۔ ان راجاؤں یا پالیگاروں کی حکومت کا رقبہ چند میل سے زیادہ نہیں تھا۔

وِلکس اپنی تاریخ میسور کے صفحہ ۲۲ پر لکھتا ہے:۔

"جب میسور کا راجہ نجن گڈھ کے تیرتھ کو جانا چاہتا تو اس کو راستے میں دو دوسرے راجاؤں سے اجازت لینی پڑتی۔"

میسور اور ننجن گڈھ کا درمیانی فاصلہ ۱۶ میل کا ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان پالیگاروں کی حکومت کہاں تک وسیع تھی۔ تمام ملک ان پالیگاروں سے بھرا ہوا تھا۔ انہیں میں ہڈناڈ کی بھی ایک مختصر ریاست تھی۔ (جو موجودہ شہر میسور کے بالکل قریب ہے)

وڈیر خاندان

وجیانگر کی سلطنت کو قایم ہوئے نصف صدی سے کچھ زیادہ عرصہ گذرتا ہے کہ ۱۳۹۹ء میں اس گاؤں میں جس کو ہڈناڈ کہا جاتا ہے۔ دوارکا (گجرات) سے دو بھائی قسمت آزمائی کے

لئے آکر مقیم ہوئے۔ ان دو بھائیوں کے نام وجیا اور کرشنا تھے۔ یہاں انہیں معلوم ہوا کہ ہڈناڈ کا پالیگار چامراج دیوانہ ہوکر کہیں چلا گیا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمسایہ ریاست کروگ ہلی کا پالیگار چامراج کی بیٹی دیواجی منی سے جبریہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ کروگ ہلی کا خاندان ذات کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ کا تھا۔ اس لئے ہڈناڈ کی رانی اس شادی سے ناراض تھی۔ لیکن وہ بے بس تھی۔ رانی کی اس بے بسی کو دیکھ کر ان دونوں بھائیوں نے اس کی امداد کرنی چاہی۔ دونوں بھائی اپنے ساتھیوں کو لیکر محل میں چھپ گئے۔ اور جب شادی کی رسومات ادا کرنے کے لئے نوشاہ اور اس کے رفقا آئے۔ تو انہیں قتل کر دیا گیا۔ اس غیر متوقع کامیابی سے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور انہوں نے کروگ ہلی پر حملہ کر دیا۔ اور اس گاؤں کو اپنے قبضہ میں لاکر ہڈناڈ کو واپس ہوئے۔ جہاں بڑے بھائی وجیا سے اس لڑکی یعنے دیواجی منی کی شادی ہوگئی۔ اور وجیا ہڈناڈ اور کروگ ہلی کا حاکم بن گیا۔ اور یہی وجیا موجودہ خاندان میسور کا مورث اعلیٰ ہے۔

مورخین نے پتہ لگایا ہے کہ وجیا کا دورِ حکومت ۱۳۹۹ء سے ۱۴۲۳ء تک تھا۔

وجیا کے بعد اس خاندان میں مندرجۂ ذیل پالیگار گذرے ہیں۔

ہری بٹاڈا چامراج	۱۴۲۳ء	سے	۱۴۵۸ء	تک
تمارراج اوڈیر اول	۱۴۵۸	"	۱۴۷۸ء	"
ہرے چامراج اوڈیر دوم	۱۴۷۸	"	۱۵۱۳	"
بٹاڈا چامراج اوڈیر سوم	۱۵۱۳	"	۱۵۵۲	"
تمراج اوڈیر دوم	۱۵۵۲	"	۱۵۷۱	"

(اوڈیر:۔ مورخ رئیس لکھتا ہے کہ یہ ایک کنٹری لفظ ہے۔ جس کی معنی صاحب یا آقا کے ہیں۔ ولکس لکھتا

ہے کہ اس زمانے میں جب یہ لقب مروج ہوا۔ اوڈیر اس حاکم کو کہتے تھے۔ جس کے ماتحت ۲۳ گاؤں ہوتے تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں یہی خطاب چولا خاندان کے راجہ اپنے لیے استعمال کرتے تھے۔ بعد میں وجیانگر کے راجاؤں نے بھی اختیار کر لیا تھا۔)

اس تمراج اوڈیر کا زمانہ ہی تھا۔ کہ سلطنت وجیانگر میں انقلاب آیا۔ ۱۵۶۴ء میں دکن کی اسلامی سلطنتوں نے متحد ہوکر تالیکوٹہ میں ہندوؤں کو شکست دی۔ اس کے بعد سے ہی اس سلطنت پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ اور وجیانگر کے حکمران اپنی راج دھانیاں کو منتقل کرتے رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ان کی یہ بھی کوشش رہی کہ پھر ہندوؤں کو ایک مرکز پر جمع کریں۔ اس کوشش میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ تالیکوٹہ کی جنگ نے سلطنت کی دھاک جو دور دور تک بیٹھ چکی تھی۔ رفتہ رفتہ کم کرنا شروع کر دیا۔ اور اس کے وائسرائے یا گورنر جہاں جہاں تھے۔ ان کا اقتدار فنا ہوتا چلا گیا۔ ہندوؤں کی اس عظیم الشان سلطنت کی تباہی کے راز کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تالیکوٹہ کی جنگ کے بعد اجزائے سلطنت کی پریشانی میں ان ماتحت راجاؤں اور پالیگاروں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ جو پہلے اس سلطنت کے زیرنگین اور اب آزاد ہونا چاہتے تھے۔ ان راجاؤں یا پالیگاروں میں سب سے نمایاں حیثیت مدورا کے نایک اور میسور کے راجا کو حاصل ہے۔

تالیکوٹہ کی جنگ ۱۵۶۴ء میں ہوئی تھی۔ میسور کا راجہ تمراج وڈیر ۱۵۷۱ء تک زندہ رہا۔ اس نے اپنی زندگی تک وجیانگر کے وائسرائے کو جو سرنگاپٹم میں مقیم تھا۔ خراج ادا کرتا رہا۔ لیکن اس کے بعد اس کے جانشین بول چامراج وڈیر نے خراج دینا بند کر دیا۔ یہ پہلی بغاوت تھی۔ جو حاکم اعلیٰ سے میسور والوں نے کی۔ گو اس وقت خراج ادا نہ کرنے کے لئے یہ بہانہ اٹھایا گیا کہ حفاظتی دیوار کے نہ ہونے سے جنگلی جانوروں نے فصلات تباہ کر دی ہیں۔

لیکن جب حفاظتی دیوار تیار ہو گئی۔ تو وائسرائے کے نمایندوں کو میسور سے نکال دیا گیا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے وائسرائے نے راجہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ لیکن اس نے کوشش کی کہ بول چامراج کو گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی بول چامراج نے اخیر وقت تک خراج ادا نہیں کیا۔ اس کی وفات ۱۵۷۶ء میں ہوئی۔ اس کے بعد بیٹا ڈوا چامراج اس کا جانشین ہوا۔ دو برس کے بعد امراء نے اس کو معزول کر کے اس کے چھوٹے بھائی راج وڈیر کو حاکم بنایا۔ راج وڈیر کے زمانے میں حالت یہ رہی کہ کسی سال میں خراج ادا کیا جاتا اور کسی میں نہیں۔

جب راج وڈیر کو پورا یقین ہو گیا۔ کہ وائسرائے برائے نام ہی رہ گیا ہے تو اس نے سرنگاپٹم پر قبضہ کرنا چاہا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف ذرائع استعمال کئے گئے۔ جنہیں سازشوں کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی کتب میں ان سازشوں کا مبہم الفاظ میں ذکر آیا ہے۔

رئیس اپنی کتاب کے صفحہ ۲۶۴ پر لکھتا ہے :-

"سرنگاپٹم سے وائسرائے کو رخصت کرنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے گئے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ذرائع کیا تھے"۔

ولکس اپنی تاریخ کے صفحہ ۲۷ پر لکھتا ہے :-

"اس زمانے کے حالات مختلف مسودوں میں ملتے ہیں۔ لیکن بیانات اس قدر مختلف ہیں کہ ان سے کوئی نتیجہ نکالا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس قدر تو ثابت ہوتا ہے کہ ایسے ذرائع اختیار کئے گئے جو ہمعصر مورخوں کی سمجھ سے باہر تھے"۔

عام طور پر جو روایت مشہور رہی ہے وہ یہ ہے کہ "وائسرائے بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اور

اس کو مرض سرطان ہوگیا تھا۔ جب اسے زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے حکومت راج وڈیر کے تفویض کر دی اور خود تالکاٹ کو چلا گیا۔ لیکن یہ ہدایت کر گیا کہ اس کی وفات کے بعد حکومت آماتور کے پالیگار کے حوالے کر دی جائے۔"

ولکس کو اس روایت پر یقین نہیں آتا۔ وہ اپنی تاریخ کے صفحہ ۲۷ پر لکھتا ہے :-

"وائسرائے اور راج وڈیر کے سالہا سال کے تعلقات کو دیکھتے ہوئے اور اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ تین سال پیشتر ہی وائسرائے نے راج وڈیر کی جان لینی چاہی۔ یہ بات غیر منطقی معلوم ہوتی ہے کہ وائسرائے نے اسی شخص کو حکومت تفویض کر دی ہو۔"

بہر طور وجیانگر کا وائسرائے ۱۶۱۰ء میں سرنگاپٹم سے رخصت ہوگیا اور راج وڈیر نے سرنگاپٹم پر قبضہ کرتے ہوئے اس کو اپنی راجدھانی کا پایۂ تخت بنایا۔ اس کے بعد اس نے اطراف کے پالیگاروں کو مطیع کر کے ریاست کو ترقی دی۔ خاندان میسور میں راج وڈیر ہی پہلا حکمران تھا جس نے اپنے قدیم جنگم عقائد کو چھوڑ کر وشنو عقائد اختیار کئے۔

راج وڈیر کی وفات ۱۶۱۷ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اس کا پوتا چامراج وڈیر مسند نشین ہوا۔ اس نے ۱۶۳۰ء میں چن پٹن پر جو سرنگاپٹم سے قریباً ۳۰ میل شمال میں واقع ہے۔ قبضہ کر لیا اس زمانہ میں ان پالیگاروں میں جنگ جس طرح ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ ولکس کی اس تحریر سے ہوتا ہے جو اس نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۹ پر لکھا ہے :-

"میسوری فوج گدیون کوٹہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلی۔ اس وقت یہاں چن راج وڈیر حاکم تھا۔ میسوری فوج کی آمد کی خبر سن کر چن راج وڈیر کے وزیر نے حملہ آوروں سے کہا: "میرا آقا شکار کے لئے باہر گیا ہے۔ اور فوج بھی اس کے ساتھ ہے۔ محل

رانی خاطر ہے۔ اور اس حملہ کی خبر سن کر نہایت خوف زدہ ہے۔ صرف پچاس سپاہی
محل کی حفاظت کے لئے موجود ہیں۔ اور آج کل بارشوں کی وجہ سے قلعہ کی فصیل میں
بھی دو بڑے بڑے شگاف پڑ گئے ہیں۔ ایسے وقت میں جب راجہ اور فوج یہاں نہیں
ہے تو آپ کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اس وقت حملہ کریں۔"

چامراج وڈیر کا عہد بیس سال تک رہا ۱۶۳۷ء میں اس کے انتقال پر اس کا چچا امامڈی چامراج وڈیر مسند نشین ہوا۔ ابھی اسکی مسند نشینی کو ڈیڑھ سال بھی نہ گذرا تھا کہ اس کے وزیر نے اس کو زہر دیکر ختم کر دیا۔ اور کنٹ ریوا نرسراج وڈیر کو مسند نشین کیا گیا۔ وزیر اس کو بھی اپنا مطیع نہ پاکر اسے بھی ختم کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن نرسراج نے ہی خود وزیر کا خاتمہ کر دیا۔

بیجاپور کا حملہ میسور پر

۱۶۳۸ء

ابھی نرسراج وڈیر کو مسند نشین ہوئے ایک سال بھی نہ گذرا تھا۔ کہ جنرل رن دولہ خان کے ماتحت بیجاپور کی اسلامی فوجیں میسور پر چھا گئیں۔ یہ ایک طوفانی حملہ تھا جو عالمگیر اورنگ زیب کے حکم سے ہوا تھا۔ عالمگیر اس وقت دکن کا وائسرائے تھا۔ بیجاپور نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ بیجاپوری فوج جو اب تک مغلوں کے خلاف جنگ آزما تھی جنوب پر حملہ کرے۔ اس حملہ کے سلسلے میں رن دولہ خان نے سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ نے اطاعت قبول کر لی۔ اور اس طرح میسور بیجاپور کا باجگذار بن گیا۔ بیجاپور کے وائسرائے کا صدر مقام سرا تھا۔ جو بنگلور سے ۷۰ میل شمال میں ہے۔ رن دولہ خان کے ساتھ اس وقت ایک مرہٹہ افسر بھی تھا۔ جس کا نام شاہ جی تھا۔ اس کی خدمات کے صلہ میں بنگلور اس کو بطور

جاگیر دیا گیا۔ بیجا پور والوں کو صرف خراج سے تعلق تھا۔ انہوں نے پایگاروں اور راجاؤں کے اندرونی معاملات میں کوئی دخل نہیں دیا۔ اس لئے نرسراج وڈیر نے دوسرے پالیگاروں سے جنگ کر کے بہت سا علاقہ فتح کر لیا۔ اسی سلسلے میں اس نے ماگڑی کیمپے گوڈا کو جس کو موجودہ بنگلور کا بانی کہا جاتا ہے۔ یلہنکا کے معرکہ میں شکست دی، اور جنوب میں ستی منگل تک ملک کو اپنے قبضہ میں لے آیا۔ ان فتوحات سے جو مال غنیمت حاصل ہوا۔ اس سے اس نے سرنگاپٹم کے قلعہ کو مستحکم بنایا۔ دربار میں شاہانہ رنگ پیدا ہو چلا۔ اسی راجہ نے پہلے پہل ٹکسال قائم کی۔ اور جو طلائی سکے رائج ہوئے وہ کنتی رایا ہن کہلاتے تھے۔ اس راجہ کا انتقال ۱۱۵۵ھ میں ہوا۔

نرسراج کے بعد دعویدار حکومت دو شخص تھے۔ ان میں ڈوڈ دیوراج منتخب ہوا۔ اور دوسرے چکدیوراج کو ہنگالہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ ڈوڈ یوراج کی حکومت میں وجیانگر کا برائے نام نمایندہ سری رنگا رایا جواب تک تالکاٹ میں مقیم تھا۔ فرار ہو کر بدنور کے راجہ کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ یہ آخری ضرب تھی جو میسور نے وجیانگر کے دم توڑتے ہوئے اقتدار پر لگائی۔ اور اس کے بعد سے وجیانگر کا نام میسور کی تاریخ سے محو ہو جاتا ہے۔ اس مفرور وایسرائے کی حمایت لیکر بدنور والوں نے میسور پر حملہ کیا۔ لیکن انہیں شکست ہوئی۔ اس کے بعد ہی مدورا کے نایک نے بھی میسور کے علاقے پر حملہ کیا۔ لیکن اس کو بھی پسپا ہونا پڑا۔ ڈوڈ یوراج کا انتقال مقام چک نائن ہلی میں ۱۱۶۷ھ میں ہوا۔ اور چک دیوراج وڈیر جو نظر بند تھا مسند نشین ہوا۔ اس راجہ کے عہد میں ریاست میسور کو بہت ترقی ہوئی۔ تاریخ جنوبی ہند میں یہ وہ زمانہ ہے کہ سیواجی کو پورا عروج حاصل ہو چکا تھا۔ اور اس کے اور بیجا پور کے درمیان خونریز معرکے ہو رہے تھے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر چکدیو رائے نے اپنی فتوحات کو وسعت دینی

شروع کی۔ لیکن وہ اس قدر محتاط تھا کہ اس علاقہ پر جس پر بیجا پور یا مرہٹوں کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ بالکل دخل نہیں دیا۔ یا بالفاظ دیگر مرہٹے اور بیجا پور والے اپنی باہمی لڑائیوں میں اس قدر مصروف تھے کہ وہ ادہر توجہ نہ کر سکے ۱۶۸۰ء میں سیواجی کا انتقال ہوا۔ اس کے سات سال بعد عالمگیر اورنگ زیب نے جو اس وقت شہنشاہ تھا۔ بیجا پور پر قبضہ کر لیا۔

میسور

سلطنتِ مغلیہ کی باجگذار ریاست

یہ لکھا جا چکا ہے کہ بیجا پور کی جانب سے مرہٹہ شاہ جی کو بنگلور کی جاگیر دی گئی تھی شاہ جی نے اپنے انتقال کے وقت اس جاگیر کو اپنے دوسرے بیٹے یکوجی کو جو تنجاور کا حاکم تھا دیدیا تھا۔ لیکن سیواجی اور اس کے جانشینوں نے جو پونا اور جنجی میں تھے۔ یکوجی کے اس قبضہ کو تسلیم نہیں کیا۔ اور ان کی نظر برابر بنگلور پر لگی رہی ۱۶۸۷ء میں یکوجی نے بنگلور کو اپنی راجدہانی تنجاور سے بہت دور سمجھ کر اس کو میسور کے راجہ کے ہاتھ ۳ لاکھ روپیوں میں فروخت کر دینا چاہا اور ایک مختصر سی فوج بھی بھیجدی کہ بنگلور کو باقاعدہ راجہ کے حوالے کر دیا جائے۔

بنگلور کے اس خرید و فروخت کی خبر کسی طرح شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کو بھی پہونچ گئی۔ عالمگیر اس وقت دکن میں تھا۔ اس نے اپنے جنرل قاسم خاں کو حکم دیا کہ فوراً بنگلور پر قبضہ کر لیا جائے۔ قاسم خاں نے شبانہ روز کوچ کر کے بنگلور پر قبضہ کر لیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ایک جانب سے یکوجی کی فوج بنگلور کی طرف بڑھ رہی تھی تو دوسری طرف سے میسور کے

راجہ کی فوج قبضہ کرنے کے لئے آ رہی تھی۔ ان فوجوں کو جب معلوم ہوا کہ مغلو ... نے بنگلور پر قبضہ کر لیا ہے تو دونوں پیچھے ہٹ گئیں۔ بنگلور پر قبضہ ہو جانے کے بعد ... قاسم خان کو فوجدار دیوان مقرر کرتے ہوئے عالمگیر نے حکم دیا کہ تمام پالیگاروں پر ... کشی کی جائے۔ قاسم خان نے یکے بعد دیگرے تمام پالیگاروں کو مطیع کر لیا۔ اور اسی سلسلہ میں میسور کا راجہ بھی سلطنت مغلیہ کا باجگذار بن گیا۔ قاسم خان سے بنگلور کو تین لاکھ روپیوں میں راجہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس کے بعد میسور کے راجہ چک دیورایا نے اظہار اطاعت کے طور پر شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے دربار میں تحائف بھیجے۔

(نوٹ ۱۔ راجہ کے اس اظہار اطاعت کے متعلق ایک سنگین کتبہ بڑے بالاپور میں نصب ہے)

اس راجہ چک دیورا کا انتقال ۱۷۰۴ء میں ہوا۔

چک دیورایا کے انتقال پر وزیروں نے اپنا اقتدار جما لیا۔ وہ جس کو چاہتے تھے راجہ بناتے تھے۔ چک دیورایا کے بعد وزیروں نے راجہ کنٹی ریوا کو مسند پر بٹھایا اس کے بعد اور تین راجہ ہوئے۔

کنتی ریوا وڈیر	۱۷۰۴ء سے ۱۷۱۳ء تک
ڈوڈ کرشنا راج وڈیر اول	۱۷۱۳ " ۱۷۳۱ "
چامراج وڈیر ہفتم	۱۷۳۱ " ۱۷۳۴ "
کرشنا راج وڈیر ثانی	۱۷۳۴ " ۱۷۶۶ "

یہ کرشنا راج وڈیر ثانی کا زمانہ ہی تھا کہ ایک مسلمان سپاہی کی قسمت کا ستارہ پس منظر طلوع ہو رہا تھا۔ اس مسلمان سپاہی کا نام حیدر علی تھا۔ جس نے میسور کے نام کو جو اس وقت تک صرف مقامی طور پر مشہور تھا۔ چار دانگ عالم میں شہرت دی۔

حیدر علی کا جس وقت آغاز ہو رہا تھا۔ میسور کی حالت نہایت سقیم تھی۔ مرہٹوں کے پے در پے حملے اس کے بعد ارکاٹ والوں کی چڑھائی، نواب ناصر جنگ کا حملہ اور پھر مرہٹوں کو تاوان جنگ نے ملک کا بالکل دیوالیہ نکال دیا تھا۔ اور دوسری طرف راجا اور وزیروں میں اختلاف یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ ایک وزیر نے کمل بدعنوانی اور بدانتظامی بھی کی۔ اور راجہ کو اطاعت اختیار کرلینی پڑی۔

اس کے بعد میسوری فوج کو نواب ناصر جنگ کی طلبی پر ارکاٹ کو جانا پڑا۔ اس کے بعد ارکاٹ کے نواب والاجاہ محمد علی نے وزیر نندراج کی تائید چاہی۔ اور میسوری فوج ترچناپلی کو گئی۔ حیدر علی ان دونوں مہموں میں شریک تھے۔ اس سے پہلے حیدر علی میسوری فوج میں ایک معمولی سپاہی تھے۔ دیون ہلی کے معرکہ میں انہوں نے جو نمایاں کام کئے۔ اس سے خوش ہوکر راجہ نے انہیں ایک دستہ کا افسر مقرر کردیا۔ اس عہدہ کو میسور اور جنوبی ہند میں نایک کہا جاتا ہے۔ ترچناپلی میں حیدر علی نے جو کارہائے نمایاں کئے۔ ان سے خوش ہوکر وزیر ننجراج نے انہیں ڈنڈگل کا گورنر مقرر کیا۔ حیدر علی ڈنڈگل میں تھے کہ مرہٹوں نے پھر میسور پر حملہ کردیا۔ اس سے پہلے کی جنگ میں تاوان ادا نہ ہونے کی وجہ سے میسور کا تمام علاقہ مرہٹوں کے پاس رہن تھا۔ اس وقت مرہٹوں نے اس پر مستقل قبضہ کرنا شروع کیا اور مزید تاوان بھی طلب کیا۔ خزانہ خالی تھا۔ تاوان ادا نہ ہوسکا۔ مرہٹوں نے سرنگاپٹم کے محاصرہ کی تیاری شروع کی۔ اسوقت وزیر نندراج نے جو ستی منگل میں مقیم تھا۔ کچھ رقم دیکر بھیجی۔ لیکن مرہٹے اس پر راضی نہیں ہوئے۔ یہ دیکھ کر حیدر علی کو ڈنڈیگل سے طلب کیا گیا۔ جنہوں نے آکر میسور کو مرہٹوں کے پنجے سے رہائی دلائی۔ اور یہی نہیں بلکہ رانیوں کی درخواست پر راجہ اور وزیروں کے تعلقات کو سلجھاتے ہوئے وزیروں کو علیحدہ

کردیا۔ اس سے خوش ہوکر راجہ نے حیدرعلی کو اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ فوج کو ایک عرصہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ حیدرعلی نے اس کا بھی انتظام کیا۔ جس سے فوج انکی گرویدہ ہوگئی۔ حیدرعلی کی اس بڑھتی ہوئی ہردلعزیزی کو دیکھ کر راجہ اور رانیوں کے دل میں خوف پیدا ہوگیا کہ کہیں حیدرعلی ریاست پر قبضہ نہ کرلے۔ اس لئے راجہ نے حیدرعلی کے ملازم کھنڈے راؤ سے (جو حیدرعلی کی اجازت سے راجہ کا وزیر بن گیا تھا) سازش کی کہ حیدرعلی کا خاتمہ کردیا جائے۔ دوسری طرف مرہٹوں کو لکھا گیا کہ اگر مرہٹے بہ حیثیت ہندو ہونے کے تائید نہ کریں تو یہ قدیم ہندو ریاست مسلمانوں کے قبضہ میں چلی جائیگی۔ مرہٹوں نے مدد دینے کا وعدہ کرلیا۔ اوران کی ایک فوج میسور میں آگئی۔ لیکن حیدرعلی کو بھی اس سازش کا پتہ چل گیا۔ اور وہ اپنی جان بچانے کے لئے تن تنہا سرنگا پٹم سے فرار ہوکر بنگلور میں آکر پناہ گزین ہوئے یہاں پہونچکر انہوں نے راجہ اور کھنڈے راؤ سے بدلہ لینا چاہا۔ اس لئے کہ انکی خدمات اور جاں نثاری کا صلہ یہ نہیں تھا کہ خود انکی جان لینے کی کوشش کیجائے حیدرعلی نے فوج بھرتی کی۔ دوسری طرف مرہٹے اور راجہ کی فوج کھنڈے راؤ کی سپہ سالاری میں بنگلور کی جانب بڑھیں۔ ایک خونریز معرکہ میں راجہ کی فوج اور مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ اور حیدرعلی نے ۱۷۶۱ء میں سرنگا پٹم پر قبضہ کرلیا۔ اب اس وقت میسور کی راجدھانی اس بہادر سپاہی کے رحم وکرم پر تھی۔ جس نے اپنی فیاضی سے راجہ کو تین لاکھ کی قدیم جاگیر کا علاقہ دیکر باقی ملک پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اسی سال نواب بسالت جنگ (حیدرآباد) نے فوجی تائید کے صلہ میں حیدرعلی کو شہنشاہِ مغلیہ کی جانب سے سرا کی صوبہ داری بھی دلوادی۔ اس لئے میسور کی راجدھانی قانونی طور پر بھی حیدرعلی کے ماتحت آگئی۔

حیدر علی

۱۷۶۱ء سے ۱۷۸۲ء

سرا کی صوبہ داری حاصل ہونے کے بعد حیدرعلی نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرنا شروع کیا۔ اور یکے بعد دیگرے تمام پالیگاروں کو مطیع کر لیا گیا۔ ان میں سب سے بڑی فتح حیدرعلی کو ۱۷۶۳ء میں بدنور میں ہوئی۔ یہاں انہیں بارہ کروڑ روپیہ کا خزانہ ملا۔ بدنور کے بعد حیدرعلی نے ملیبار پر فوج کشی کی۔ پونانی کی جنگ میں نائروں کو سخت شکست ہوئی۔ اور تمام ملیبار پر حیدرعلی کا قبضہ ہوگیا۔

۱۷۶۴ء میں حیدرعلی نے چتلدرگ اور شاہنور پر چڑھائی کی۔ چتلدرگ فتح نہ ہو سکا لیکن شاہنور کے نواب نے اطاعت قبول کر لی۔ ان واقعات کے دوسرے سال یعنے ۱۷۶۵ء میں مرہٹوں نے حیدرعلی پر فوج کشی کی۔ یہ فوج کشی میسور کی رانیوں کی درخواست پر ہوئی تھی۔ مرہٹوں سے مسلسل دوسال تک جنگ رہی۔ کبھی حیدرعلی کو فتح ہوتی تھی تو کبھی مرہٹوں کو۔ مرہٹے بھی ان مسلسل لڑائیوں سے عاجز آچکے تھے۔ آخر نواب حیدرعلی نے سات لاکھ روپیہ نقد اور پچاس لاکھ کے وعدہ پر صلح کر لی اور مرہٹے واپس چلا گئے۔ اس کے بعد ہی یعنے ۱۷۶۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے حیدرعلی کی جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں والاجاہ محمد علی اور نظام علی خاں نظام الملک دوم انگریزوں کے ساتھ تھے۔

والاجاہ محمد علی اور نظام الملک کو حیدرعلی کی فتوحات سے حسد اور خوف پیدا ہو چلا تھا۔ اس لئے حیدرعلی کے خلاف حیدرآباد میں ایک معاہدہ ہوا۔ جس میں نظام الملک، والاجاہ محمد علی اور ایسٹ انڈیا کمپنی شریک تھے۔ اس معاہدہ کی رو سے نظام الملک نے بہ حیثیت صوبہ

وار دکن، میسور کا تمام علاقہ انگریزوں کو سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج پر لکھ کر دیدیا۔ اور انگریزوں کو والا جاہ محمد علی کا ایجنٹ تسلیم کرتے ہوئے محمد علی کو ارکاٹ کا مستقل اور آزاد حکمران تسلیم کر لیا۔ (کتاب مدراس اندر ٹرینیز)

اس معاہدہ کے بعد نظام الملک، والا جاہ محمد علی اور انگریزوں کی متحدہ فوجیں میسور پر بڑھیں۔ اس وقت ان کے ساتھ ایک مرہٹہ سردار بھی تھا۔ مسلسل دو سال تک جنگیں ہوتی رہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک وقت حیدر علی کے فرزند ٹیپو سلطان نے مدراس کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن انگریزوں نے نہایت عیاری سے کام لیکر سلطان کے پاس ایک قاصد کو جعلی خط دیکر بھیجا۔ یہ خط گویا حیدر علی کی جانب سے تھا۔ جس میں تاکید کی گئی تھی کہ مدراس کا محاصرہ اٹھا کر فوراً حیدر علی سے آ کر ملے یہ چال کارگر ہو گئی۔ ٹیپو سلطان نے محاصرہ اٹھا لیا۔ اور واپس ہو گئے۔ لیکن اس کے بعد ہی حیدر علی نے پھر مدراس کا محاصرہ کر لیا۔ اور بزور شمشیر مدراس کا عہدنامہ لکھوایا۔ جس میں حیدر علی نے حیرت انگیز رواداری دکھلائی۔

انگریزوں سے صرف یہ شرط منوالی کہ بوقتِ ضرورت حیدر علی کو فوجی امداد دینگے

اس صلح نامہ کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۷۷۰ء میں مرہٹوں نے ترمک راؤ کے ماتحت میسور پر حملہ کر دیا۔ حیدر علی نے معاہدۂ مدراس کی رو سے انگریزوں سے مدد چاہی۔ لیکن انہوں نے مدد نہیں دی۔ مسلسل چار سال تک یہ جنگ جاری رہی۔ مرہٹوں کا یہ حملہ اس قدر خطرناک تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ حیدر علی کی سلطنت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ موتی تالاب کے میدان جنگ میں حیدر علی کو کامل شکست ہوئی۔ اور وہ اپنی جان بچا کر تن تنہا فرار ہوئے۔ سرنگاپٹم پہونچکر حیدر علی نے از سر نو تیاری کی اور مرہٹوں پر شبخون مارنے لگے۔ جن سے مرہٹی فوج عاجز آ گئی۔ آخر ۱۴ لاکھ روپیہ دیکر حیدر علی نے صلح کر لی۔ کہ کسی طرح مرہٹے ملک

سے چلے جائیں۔

مرہٹوں کی واپسی کے بعد حیدر علی نے کورگ اور کڑپہ فتح کیا۔ اسی زمانہ میں یورپ میں فرانس وانگلستان میں جنگ چھڑ گئی۔ انگریزوں نے ماہی بندر پر جو ملیبار میں فرانسیسیوں کی تجارتی کوٹھی تھی۔ قبضہ کر لینا چاہا۔ اور اس مقصد کیلئے اپنی فوج بھیجی۔ فرانسیسی حیدر علی کی امداد پہ تھے۔ اور بندرگاہ ماہی ملیبار میں واقع تھی۔ جو حیدر علی کے مقبوضات میں سے تھا۔ انگریزوں کی وعدہ خلافی اور چیرہ دستی کو دیکھ کر حیدر علی نے ۱۷۸۰ء میں ایک کثیر فوج سے کرناٹک پر فوج کشی کر دی۔ انگریز مورخین کو اعتراف ہے کہ جنوبی ہند نے اس سے بڑھکر طوفانی حملہ اور اس قدر کثیر فوج کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جنگ ابھی جاری ہی تھی کہ نواب حیدر علی کا ارکاٹ کے قریب ۱۷۸۲ء میں انتقال ہو گیا۔

حیدر علی کے انتقال کے بعد ٹیپو سلطان نے جنگ جاری رکھی۔ مسلسل دو سال کی جنگوں میں انگریزوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں۔ اور منگلور کا صلح نامہ مرتب ہوا جس میں انگریزوں نے سلطان کی تمام پیش کردہ شرائط کو منظور کر لیا۔

ابھی اس صلح پر دس بارہ دن بھی نہ گذرے تھے کہ نظام علی خاں اور مرہٹوں نے ایت گیر میں معاہدہ کرتے ہوئے سلطان کی مملکت پر حملہ کر دیا۔ سلطان نے بہت چاہا کہ نظام الملک مرہٹوں کا ساتھ چھوڑ کر اس کے ساتھ مل جائے۔ سلطان دیکھ چکا تھا کہ مسلمانوں کی آپس کی نااتفاقی کس طرح ایک طرف مرہٹوں اور دوسری طرف انگریزوں کو چیرہ دست بنا رہی ہے اس لئے اس نے تجویز کی کہ حیدرآباد اور میسور میں ایک زبردست اتحاد قائم ہو جائے۔ اس نے نظام الملک کے آگے تجویز پیش کی کہ نظام کی بیٹیوں سے اپنے بیٹوں کی اور اپنی بیٹیوں سے نظام کے بیٹوں کی شادی ہو جائے۔ لیکن نظام الملک نے اس تجویز کو یہ کہکر

ٹھکرا دیا کہ سلطان کا خاندان ایک نایک کا خاندان ہے۔

اس کے بعد سلطان کو بجز جنگ کے چارہ نہیں تھا۔ چار سال کی مسلسل جنگوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹوں اور نظام الملک کو شکست ہوئی۔ اور سلطان کے ہاتھ بہت سا ملک آیا۔ یعنے اب سلطنت خداداد کی سرحدیں حیدرآباد اور پونا کے قریب قریب پہونچ گئیں۔ ایک طرف تو یہ مذکورۂ بالا جنگ جاری تھی۔ اور دوسری طرف سلطان نے تجارت، صنعت وحرفت اور بحری طاقت پر بھی توجہ کرنی شروع کی۔ اور ملک اس قدر طاقتور اور خوش حال بن گیا کہ سلطنت خداداد اس زمانہ میں ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت مانی جاتی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز مدراس میں بیٹھے ہوئے سمجھ رہے تھے کہ مسلسل جنگوں کی وجہ سے سلطنت خداداد کمزور ہو چکی ہوگی۔ اس لئے مدراس کا گورنر میڈوز نے جس سے میسور کی رانیاں خفیہ طور پر سازش کر رہی تھیں۔ بغیر اعلان جنگ سلطنت خداداد پر فوج کشی کر دی دو سال تک یہ جنگ جاری رہی۔ میڈوز شکست کھا کر مدراس واپس ہو گیا۔ یہ دیکھ کر لارڈ کارنوالس گورنر جنرل نے سلطان کے خلاف ایک جتھہ تیار کیا۔ اس جتھے میں نظام الملک، اور مرہٹے شامل ہو گئے۔ لیکن پھر بھی خوف تھا کہ سلطان کی طاقت سے یہ متحدہ فوجیں عہدہ برآ نہ ہو سکیں گی۔ اس لئے کارنوالس نے ایک انگریزی افسر کرنل ریڈ کو خاص اسی کام پر مامور کیا کہ سلطنت خداداد کے اندر سازشوں کا جال بچھائے۔ کارنوالس کی یہ تدبیر کامیاب ہو گئی۔ کشن راؤ کی نمک حرامی سے بنگلور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور انہوں نے بڑھ کر سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں مہدی خاں نائطہ کی نمک حرامی سے گنجام کے مورچہ پر انگریز قابض ہو گئے۔ بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اور انگریزی کیمپ میں سامان رسد کی قلت ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر کارنوالس نے محاصرہ اٹھا لیا۔ لیکن عین وقت پر جب انگریز

واپس ہو رہے تھے تو مرہٹوں کی فوج ان سے آکر مل گئی۔ ان کے پاس سامان رسد بافراط تھا جس کی وجہ سے انگریزوں نے پھر سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا۔ اور آخر ۱۷۹۲ء میں امراء و وزراء کی غداری کو دیکھتے ہوئے سلطان نے مجبوری کی صلح کر لی۔ جس کی وجہ سے اس کی آدھی سلطنت ہاتھ سے نکل گئی۔

انگریزوں کے جانے کے بعد سلطان نے از سر نو فوجی تنظیم کی اور ملک میں ایک نئی روح پھونکی۔ بحری بیڑے پر زیادہ توجہ دی گئی۔ چھ سات سال کے عرصہ میں سلطنت خداداد پھر اس قدر مضبوط ہو گئی کہ دشمنوں کی نظروں میں کھٹکنے لگی۔

انگریزوں کو معلوم ہو گیا کہ اگر سلطان کو اسی طرح آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس ملک میں انکا گذر محال ہے۔ اور دوسری طرف سلطان بھی تلا ہوا تھا۔ کہ ان غیر ملکیوں کو ملک سے نکال باہر کرے۔ اس غرض سے اس نے سلطان ترکی، افغانستان وغیرہ سے خط و کتابت بھی کی۔

یہ زمانہ انگریزی گورنر جنرل ولزلی کا تھا۔ اس نے سلطان کے ارادے کو بھانپ لیا مرہٹے اور نظام الملک پھر اس کے ساتھ مل گئے۔ اور پھر ایک بار سازشوں کا وسیع جال بچھایا گیا اور اس جال میں سلطان کے امراء میر صادق، میر معین الدین، بدر الزماں خاں نائطہ، میر غلام علی لنگڑا، میر قمر الدین اور پورنیا بھی پھنس گئے۔ پورنیا کو میسور میں ہندو راج قایم کرنے کی فکر تھی۔ دوسرے غدار صرف اپنی اپنی تن پروری کے لئے انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ معین الدین اور قمر الدین کو گرم کنڈہ کی ریاست حاصل کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی۔

میر قمر الدین فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس نے اس قدر غداری سے کام لیا کہ انگریزی فوج نے بغیر کسی مقابلہ کے سرنگا پٹم پہونچکر اس کا محاصرہ کر لیا۔ اسی غدار نے شہزادہ فتح حیدر

کو بھی جنگ سے باز رکھا۔ آخر ۴ رمئی ۱۷۹۹ء کو پورنیا اور میر معین الدین کی غداری سے انگریزی فوج قلعہ پر آگئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سلطان دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ اس کو خبر ملی کہ انگریزی فوج قلعہ پر آچکی ہے وہ اسی طرح اٹھا۔ اور طاؤس نامی گھوڑے پر سوار ہوکر انگریزوں کے مقابلہ کیلئے نکلا۔ سلطان اور اس کے باڈی گارڈ نے دوپہر سے لیکر چار بجے تک انگریزوں کو شمالی فصیل پر قبضہ کرنے سے روک رکھا۔

پورنیا کی غداری کی وجہ سے انگریزی فوج جنوبی فصیل پر قابض ہوچکی تھی۔ اس طرح فوج شہر میں داخل ہوکر دوسری جانب سے سلطان پر گولیاں برسانے لگی۔

فصیل قلعہ پر سلطان کی موجودگی کی اطلاع میر صادق نے انگریزوں کو دی تھی۔

جب سلطان نے یہ دیکھا کہ انگریز اندرونی فصیل پر بھی قابض ہوچکے ہیں۔ تو وہ واپس ہوا۔ اس کا ارادہ تھا کہ محل میں پہونچکر محل کو بارود سے اڑادے۔ اسی مقصد سے اس نے محل میں بارود بچھا رکھی تھی۔ اس مقصد میں اس کو کامیابی نہیں ہوی۔ اس لئے کہ غدار میر صادق نے سلطان کی واپسی کا راستہ جو ڈڈی دروازہ سے تھا۔ بند کردیا تھا۔ ڈڈی دروازے کو بند پاکر سلطان آگے بڑھا اور شہر کے اندرونی بڑے دروازے پر پہونچا۔ یہاں سلطان تین طرف سے انگریزوں میں گھر چکا تھا۔ اس کو سخت پیاس لگ رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ غلام کے پاس چھاگل موجود تھی۔ لیکن اس نے ایک قطرہ پانی بھی نہیں دیا۔ اسکے عوض اس نے سلطان کو مشورہ دیا کہ اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کردیجئے۔ لیکن غیور سلطان نے پلٹ کر کہا:۔

"گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے"۔

مغرب کے وقت تک سلطان دست بدست جنگ کرتا ہوا شہید ہوا۔

سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے سرنگا پٹم کے باشندوں پر نہایت سخت ظلم و ستم کئے۔ یہاں تک کہ کرنل آرتھر ولزلی نے جو انگریزی فوج کا ایک افسر تھا۔ چند سپاہیوں کو پھانسی کی سزا دی۔

سلطان کی شہادت کے ساتھ ہی سلطنت خداداد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور انگریزوں نے تمام ملک پر قبضہ کرتے ہوئے مدراس کا صوبہ بنایا۔ جس کو آج مدراس پریسیڈنسی کہا جاتا ہے۔ اور یہ پہلا صوبہ ہے۔ جو انگریزوں نے بنایا۔

سلطنتِ خداداد کی تباہی کے اثرات

(الف) ہندوستان پر

انگریزی مورخین کو اعتراف ہے کہ ہندوستان میں حیدر اور ٹیپو سلطان سے بڑھ کر انہیں کوئی حریف نہیں ملا۔ حیدر علی کے زمانے میں اگرچہ انگریزوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں۔ بلکہ ان کی ہستی تک ان کے رحم و کرم پر موقوف ہو گئی تھی۔ لیکن حیدر علی میں رواداری بھی حد درجہ تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے اکھڑتے ہوئے قدم پھر ملک میں جم گئے۔ لیکن ٹیپو سلطان کا نصب العین یہ رہا کہ

"ہندوستان صرف ہندوستانیوں کے لئے ہے"۔

سلطان یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ غیر ملکی اس ملک پر حکمرانی کریں اور اس نے اپنی زندگی اسی مقصد کے لئے وقف کر دی۔ ادھر انگریزوں نے بھی اس کی سلطنت کو مٹانے کے لئے اپنا پورا پورا زور لگا دیا۔ اور ملک کی بدقسمتی سے نہ صرف مرہٹے اور نظام الملک انگریزوں کے ساتھ مل گئے۔ بلکہ سلطان کے غدار امراء و وزراء بھی سازش میں شریک ہو گئے۔

یہ ٹیپو سلطان ہی کا خوف تھا کہ انگریز ملک کے کسی حصہ پر بھی قابض ہونے سے ڈرتے تھے۔ یوں تو والا جاہ محمد علی کے ایجنٹ کی حیثیت سے وہ جنوبی ہند کے اکثر اضلاع میں حکمرانی کر رہے تھے۔ جس کو دوگانہ سلطنت یا ڈویل (Duel) گورنمنٹ کہا جاتا ہے۔ لیکن انہیں کبھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ حکومت صرف اپنے ہی نام سے کریں۔ لیکن ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد یہ خوف بالکل جاتا رہا۔ ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ انہوں نے سلطان کی شہادت کے دوسرے ہی سال ارکاٹ کی برائے نام حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ حیدرآباد کو جو ابتک آزاد تھا۔ باجگذار بنا لیا۔ اور چھ سال کے اندر اندر تمام ہندوستان پر سوائے پنجاب اور سندھ کے قابض ہو گئے۔ اور شہنشاہِ مغلیہ ان کی حفاظت میں بلکہ ماتحتی میں لے لیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ سلطان کی شہادت کے بعد جب جنرل ہارس سلطان کی لاش پر آیا تو وہ فرطِ خوشی سے چلا اٹھا۔

"آج ہندوستان ہمارا ہے۔"

اس میں کچھ شک نہیں کہ صرف چھ سال کے اندر اندر اس جملہ کا ایک ایک لفظ صحیح ثابت ہوا۔

ٹیپو سلطان کی شخصیت کس قدر عظیم المرتبت تھی۔ اور سلطنت خداداد ہندوستان میں کس پایہ کی سلطنت تھی۔ اس کا اندازہ انگریزوں نے کر لیا تھا۔

ہندوستان بھر میں صرف یہی ایک سلطنت اور اس کا جلیل القدر فرمانروا ٹیپو سلطان تھا جو انگریزوں کے راستے میں حائل تھا۔ اس کی شہادت پر خود لارڈ ولزلی نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ حسب ذیل ہیں:-

"میں ہندوستان میں اپنی فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع کرونگا کہ ڈائرکٹران کمپنی ہندوستان پر رحم کرنے کی درخواست کریں۔" (تاریخ باسو)

ولزلی کو سر جان ایٹس ٹھرو ٹر چیف جسٹس آف بنگال لکھتا ہے :-

" ہماری تاریخ ہندوستان کا سب سے نمایاں، سب سے شاندار اور سب سے بڑا کارنامہ اس طرح آپ کے ہاتھوں انجام پانے پر میں آپ کو تہِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔"

ڈاکٹر جان آر ہنڈرسن سی۔ آئی۔ اِی لکھتا ہے :-

" ٹیپو ایک عظیم المرتبت شخصیت تھا۔ ایسی شخصیت کہ ہندوستان پھر اس کی نظیر نہیں دیکھ سکے گا۔ اس کے ارادے بہت بلند۔ اس کی قابلیت حیرت انگیز۔ اس کی سلطنت بہت وسیع تھی۔ وہ ایک بہادر انسان تھا۔ اور اس نے جوانمردی کی موت حاصل کی۔"

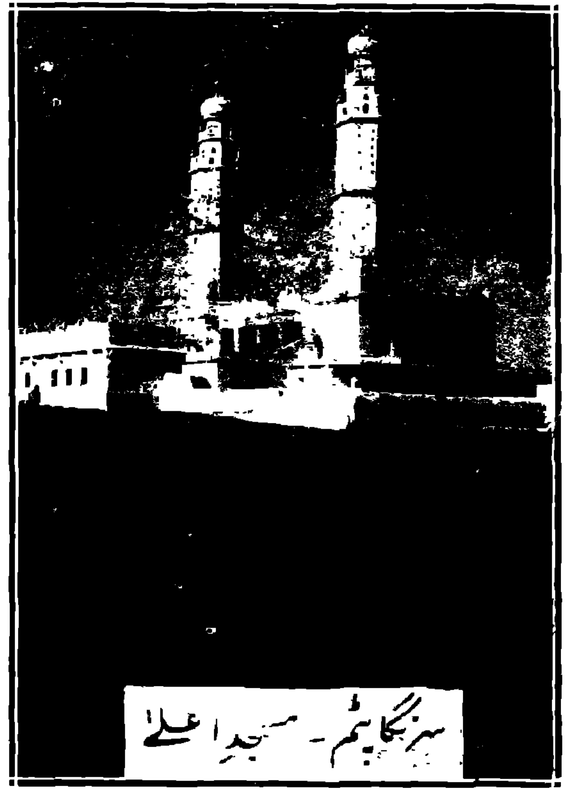
(ب) مسلمانوں پر

۴ مئی ۱۷۹۹ء کی شام تک کہا جاتا تھا کہ مسلمان ہندوستان پر حکمران ہیں۔ اور ہندوستان مسلمانوں کا ہے۔ لیکن ۵ مئی کے آفتاب نے دیکھا کہ وہ قوم جو کل شام تک آزاد تھی۔ آج غلام بنی ہوئی ہے۔ یہاں ماتم اس کا نہیں کہ ایک حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ ہندوستان میں یوں تو مسلمانوں کے ہاتھ سے بہت سی حکومتیں چھن گئیں۔ خاندانوں کا عزل ونصب ہوتا رہا لیکن مسلمان ان سے اثر پذیر نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ ایک خاندان کے بعد کوئی دوسرا خاندان برسرِ حکومت آگیا۔ دکن کی بہمنی سلطنت مٹ گئی۔ لیکن اس کا نعم البدل اور پانچ اسلامی سلطنتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اور جب یہ سلطنتیں مٹ گئیں تو مغلیہ سلطنت نے ان کی جگہ لے لی۔ لیکن سلطنت خداداد کے مٹ جانے پر مسلمانوں کا کوئی ملجا و ماویٰ نہیں رہا۔ مسلمانوں کی جو دھاک ملک میں بیٹھی ہوئی تھی پوری کی پوری ختم ہو گئی۔

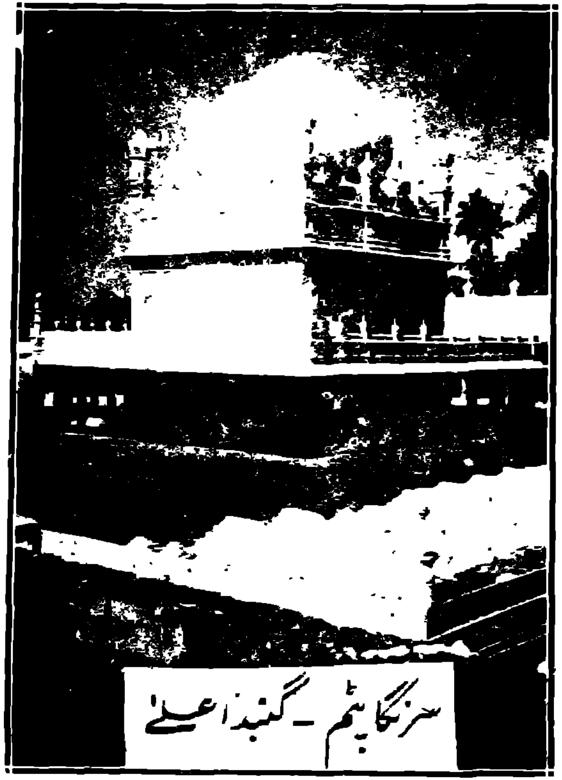
سلطنت خداداد کے خاتمہ کا اثر مسلمانوں کے علم، زبان، کلچر اور اقتصادی حالت پر نہایت بُرا پڑا۔ یوں تو جب تک سلطنت باقی تھی ایک ایک شہر علم کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ لیکن خصوصی طور پر سرنگاپٹم، سِرا، حیدرنگر (بدنور) اور ارکاٹ نہ صرف علم و فضل کا مرکز تھے بلکہ ان شہروں سے ان کا کلچر وابستہ تھا۔ ان شہروں سے کمتر درجہ پر کولار، بڑا بالاپور، کڑپہ کرنول اور گرم کنڈہ تھے۔

سرنگاپٹم کی آبادی چار اور پانچ لاکھ کے درمیان تھی۔ سرا کی اسلامی آبادی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس ایک شہر میں نوّے[۹] مساجد آباد تھیں۔ یہ شہر بیجاپور کے وائسرائے کا اور بعد میں مغلیہ گورنر کا صدر مقام رہا تھا۔ حیدرنگر (بدنور) کو سلطنت خداداد کے وائسرائے کا صدر مقام ہونے کی حیثیت سے ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور یہاں نوے ہزار مکانات تھے۔ ارکاٹ نوابان ارکاٹ کا پایۂ تخت تھا۔ کڑپہ اور کرنول میں مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی تھی۔ کولار میں اسلامی علوم کا ایک کالج قایم تھا۔ بڑا بالاپور، بیجاپور کے زمانے ہی سے مسلمانوں کا مرکز تھا۔

ان شہروں کی اسلامی آبادی کو منتشر کر دیا گیا۔ اور یک لخت دو چار سال کے بعد ہی یہ تمام شہر ویران ہوگئے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آج سرنگاپٹم میں چند سو سے زیادہ اسلامی آبادی نہیں ہے۔ سرا میں مسلمانوں کے صرف ۰۰ مکان باقی رہگئے ہیں۔ جو اپنی زندگی نہایت افلاس کی حالت میں بسر کر رہے ہیں۔ سوائے دو مسجدوں کے جن میں ایک بیجاپور کے عہد کی اور دوسری بادشاہی یعنے عالمگیر کے عہد کی بنی ہوی ہے۔ باقی ۸۸ مساجد ویران اور مسمار ہوگئی ہیں۔ حیدرنگر (بدنور) ایک بالکل معمولی گاؤں بنا ہوا ہے۔ ارکاٹ بالکل تباہ ہوگیا۔ ان شہروں سے مسلمانوں کا کلچر وابستہ تھا۔ ان کی تباہی سے مسلمانوں کے علم و کلچر پر



سرنگاپٹم - مسجد اعلیٰ



سرنگاپٹم - گنبد اعلیٰ

ہندوستان - سلطان ٹیپو کی زندگی میں

(میر جعفر کی غداری سے، صرف ملک بنگالہ پر انگریز قابض ہو گئے تھے۔)



ماخوذ از تاریخ ہند از جے۔ سی۔ آلن

انگریزی مقبوضات

سلطنت خداداد

آزاد ہندوستان

ہندوستان ۱۸۰۵ء میں

یعنے ٹیپو سلطان کی شہادت کے چھ سال بعد

(از تاریخ جے۔ سی۔ آلن)



اس نقشہ میں جس علاقہ پر خالص انگریزی حکومت تھی اس کو [✕✕✕] اس طرح دکھایا گیا ہے

اور جو صوبے ۱۸۰۶ء میں آزاد تھے۔ ان کے ناموں کے ساتھ آزاد لکھا گیا ہے۔

پر تباہی آگئی ۔

زبان سلطنتِ خداداد کے خاتمہ کے ایک سال بعد علاقہ میسور سے فارسی زبان کو جو دفتری زبان تھی نکال کر دفاتر میں کنڑی اور انگریزی کو رواج دیا گیا ۔ مدراس میں ٹمل اور انگریزی نے فارسی کی جگہ لے لی ۔

اقتصادی حالت جب تک اپنی حکومت تھی مسلمانوں کا ذریعہ معاش فوجی ملازمت تھا ۔ سلطنت کی تباہی نے مسلمانوں کو بیکاری کے عمیق غار میں ڈھکیل دیا ۔ اور ہزار ہا خاندان جو آسودہ اور خوشحال تھے ۔ افلاس میں گھر گئے ۔ ان کی محبوب سلطنت کی تباہی سے مسلمان رنج اور غم وغصہ سے بھرے ہوئے تھے ۔ انہوں نے انگریزی زبان سیکھنا پسند نہیں کیا ۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی ملازمت وہ کرنا نہیں چاہتے تھے ۔

ڈاکٹر بکانن جو سلطنتِ خداداد کی تباہی کے ایک سال بعد اس ملک میں آیا تھا ۔ اپنی اقتصادی رپورٹ میں لکھتا ہے ۔

" حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے بنگلور میں مسلمان بالکل تباہ حالت میں نظر آئے ۔ اس لئے کہ ان کی فوجی ملازمتیں ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تھیں ۔ اور یہ نئی حکومت کی فوجی ہو یا سول ملازمت کرنا نہیں چاہتے ۔ بعض مسلمانوں نے جن کے پاس کچھ روپیہ ہے تجارت شروع کر دی ہے ۔ اور باقی زراعت کر رہے ہیں ۔ (ماڈرن میسور صفحہ ۲۸۱)

ہر جگہ مسلمانوں کی یہی حالت تھی ۔

مسلمانوں کی انگریزی زبان سے نفرت اور انگریزی زبان سے بیزاری کا نتیجہ یہ نکلا ۔ کہ ہندوؤں نے تمام ملازمتوں پر قبضہ کر لیا ۔ اور مسلمان کہیں کے نہیں رہے ۔ انگریزی تو وہ پڑھنا نہیں چاہتے تھے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے علم وفضل کے مرکزوں کی تباہی سے اپنے خاص

علوم سے بھی یہ بے بہرہ ہو گئے۔

اب رہی تجارت یا زراعت ان کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ اس لئے ان کو ہندو بنیوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ سود در سود کے چکر سے مسلمانوں کے پاس جو کچھ روپیہ یا زمین تھی وہ بھی بنیوں کے ہاتھ میں پہونچ گئی۔ اور مسلمان بالکل ہی تباہ حالت کو پہونچ گئے۔

کہا جاتا ہے کہ ٹیپو سلطان نے آخری وقت اپنے غدار امرا کو مخاطب کر کے کہا تھا:-

"اس غداری کا نتیجہ تمہیں اس وقت معلوم ہوگا۔ جب تم اور تمہاری آئندہ نسلیں اس ملک میں محتاج اور ذلیل ہو کر ایک ایک دانہ چاول اور پیاز کی ایک ایک گٹھی کو ترسینگی!"

سلطان کی یہ پیشین گوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت اس کا ثبوت دے رہی ہے۔

(نوٹ :- تاریخ میسور کا یہ مضمون جس میں راجگان میسور کے حالات ہیں۔ کرنل ولکس اور رمیس کی تاریخوں سے لیا گیا ہے۔ اور حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے حالات تاریخ سلطنت خداداد سے لئے گئے ہیں۔ جس میں ہر واقعہ کے متعلق متعدد مستند حوالے دئے گئے ہیں)

جنوبی ہند کی دوسری ریاستیں

ٹراونکور

ریاست میسور کے علاوہ جو ریاستیں جنوبی ہند میں باقی ہیں۔ ان میں ٹراونکور کی ریاست جزیرہ نمائے جنوبی ہند کے جنوب مغربی انتہائی گوشہ میں ہے۔ اس ریاست کا رقبہ ۷۶۲۱ مربع میل اور آبادی تقریباً باون لاکھ ہے۔ جس میں ۳۲ لاکھ ہندو، ۱۶ لاکھ عیسائی اور چار لاکھ مسلمان ہیں۔ ٹراونکور میں عیسائیوں کی اس قدر کثیر آبادی کا سبب وہ سیرین عیسائی ہیں جو اس ملک میں عیسائی مذہب کی ابتدا ہی میں آکر آباد ہو چکے تھے۔

ٹراونکور کی تاریخ کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی ہے۔ یہاں ایک بہت ہی قدیم خاندان حکمران ہے۔ ملک کی طبعی حالت اسکی بہت بڑی ذمہ دار ہے۔ مغربی گھاٹ اس کے مشرقی حدود کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اس لئے حملہ آوروں نے اس ملک پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ اور ٹراونکور والے بھی جنوبی ہند پر جو سلطنت بھی حکمران ہوی۔ اس کو برابر خراج دیتے رہے۔ ۱۷۹۵ء میں یہ ریاست ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت آگئی۔

کوچین

کوچین ریاست ٹراونکور کی شمال میں ہے۔ یہاں بھی ایک قدیم خاندان حکمران ہے کوچین کا رقبہ ۱۴۱۷ مربع میل اور آبادی بارہ لاکھ جس میں مسلمان ۰ فیصدی ہیں۔ یہاں یہودیوں کی بھی ایک خاصی آبادی ہے ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد ۱۴۵۱ بتلائی گئی ہے۔

یہ ان یہودیوں کی اولاد سے ہیں۔ جو عیسائی مذہب کی ابتدا میں ملک شام سے آکر یہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ یہاں ان کا ایک معبد بھی ہے۔ جو ۱۵۶۷ء میں تعمیر ہوا تھا۔

۱۷۷۶ء میں نواب حیدر علی نے کوچین پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۷۹۰ء تک یہ ریاست سلطنت خداداد کی باجگذار رہی۔ اس کے بعد ۱۷۹۲ء میں انگریزوں کے ماتحت آگئی۔

پدوکوٹہ

ساحل کورومنڈل کے ضلع رامناڈ میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس کا رقبہ ۱۱۷۹ مربع میل اور آبادی چار لاکھ ہے۔ یہاں بھی ایک قدیم خاندان حکمران ہے۔

بنگن پلی

جنوبی ہند میں یہی ایک اسلامی ریاست ہے۔ اس کا رقبہ ۲۷۵ مربع میل اور آبادی قریباً چالیس ہزار ہے۔ وجیانگر کے زوال کے بعد ضلع کرنول پر جب بیجاپور والوں نے قبضہ کر لیا۔ تو بنگن پلی کا علاقہ سدی سنبل کو بطور جاگیر دیا گیا۔ بیجاپور کے بعد جب مغلوں کا تسلط ہوا تو یہاں محمد بیگ خان کو قلعدار بنایا گیا۔ محمد بیگ خان ۱۷۲۵ء تک قلعدار رہا۔ اس کے بعد جب اور تین قلعدار ہوئے۔ ان میں تیسرے قلعدار فضل علی خاں نے ریاست اپنی بہن کے داماد سیّد محمد خاں کو دیدی۔ موجودہ حکومت اسی خاندان میں چلی آتی ہے۔

نواب حیدر علی نے جب کرنول فتح کیا۔ تو سید محمد خان کے لڑکے سیّد حسن نے حیدر علی کی اطاعت کر لی۔ سید حسن کا انتقال ۱۷۸۳ء میں ہوا۔

میسور کی تیسری جنگ میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی، نظام حیدر آباد اور مرہٹے سلطنت

خداداد پر حملہ آور ہوئے تو بنگن پلی کے نواب ان سے مل گئے۔ زوال سلطنتِ خداداد کے بعد جب ملک کے حصے بخرے ہوئے تو یہ ریاست نظام حیدر آباد کے ماتحت ہو گئی۔ لیکن ایک ہی سال کے بعد جب کڑپہ، کرنول، بلاری و اننت پور کے ضلعے ایسٹ انڈیا کمپنی نے حیدر آباد سے لے لئے تو بنگن پلی کی ریاست بھی انگریزوں کے ماتحت ہو گئی۔

سنڈور

ضلع بلاری میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس کا رقبہ ۱۶۰ مربع میل ہے۔ یہاں کا خاندان مراری راؤ حاکم گتی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور گھوڑپڑے کہلاتا ہے۔ مراری راؤ کی شخصیت تاریخ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ارکاٹ کے محاصرہ میں جس میں کلایو محصور ہو گیا تھا۔ اسی مراری راؤ نے چندا صاحب کا ساتھ یکایک چھوڑ دیا تھا۔ جس سے چندا صاحب نے محاصرہ اٹھا لیا اس کے بعد میسور کی پہلی جنگ میں یہ والا جاہ محمد علی اور انگریزوں و نظام کا ساتھ دیا تھا۔ بعد میں نواب حیدر علی نے گتی پر قبضہ کر لیا اور مراری راؤ قید ہو گیا۔ لیکن سندور کا علاقہ اس کے رشتہ داروں کے قبضہ ہی میں رہا۔ اور یہ ہمیشہ مرہٹوں اور نظام کا ساتھ دیتے رہے سلطنتِ خداداد کے زوال کے بعد یہ ریاست انگریزوں کے ماتحت آ گئی۔

شانور

بنگن پلی اور سندور جیسی ایک اور چھوٹی سی ریاست شانور ہے۔ جو آج کل بمبئی علاقہ میں شمار ہوتی ہے۔ اس ریاست کے حکمران بھی ہمیشہ نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خلاف مرہٹوں کو مدد دیتے رہے ہیں۔

زوالِ سلطنتِ خداداد کے بعد اس ریاست کو مرہٹوں کے ماتحت دینے کی تجویز ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کو اپنی ماتحتی میں لے لی۔

یوروپین اقوام اور جنوبی ہندوستان

اس تاریخ کے آخری ابواب میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کی کش مکش اور انگریزوں کی کامیابی کا کچھ بیان آگیا ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس ملک میں صرف یہی دو قومیں یوروپ سے آئیں۔ ان سے پہلے پرتگال والوں کا بھی ذکر آچکا ہے۔ اس لئے اب مجمل طور پر ان تمام قوموں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس ملک میں یوروپ سے آئی تھیں۔

ہندوستان اپنی دولت سونا، چاندی اور جواہرات کے لئے زمانۂ قدیم سے اس قدر مشہور تھا کہ دنیا کے کسی اور ملک کو اس قدر شہرت حاصل نہیں تھی۔ یوروپ جب اپنے زمانۂ جہالت یا تاریکی کو ختم کر کے ترقی کے میدان میں آیا تو اس کو خواہش پیدا ہوئی کہ ہندوستان کا ایک نزدیک ترین بحری راستہ دریافت کیا جائے۔ اس سے پہلے یوروپ سے ہندوستان کی تجارت بری راستہ سے ہو رہی تھی۔ اور یہ تجارت ایران، عرب و شام کے سوداگروں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اور یہاں کے باشندے خوب نفع اٹھاتے تھے۔ اب یوروپ والوں نے چاہا کہ اس تجارت پر قبضہ جما کر آپ خود نفع اٹھائیں۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کے لئے مہمیں بھیجنی شروع کیں۔

ان مہموں سے یوروپین اقوام کی غرض ملک گیری نہیں تھی۔ صرف اپنی تجارت کو فروغ

دینا تھا۔ اس لئے کہ ہندوستان کی سوغات ان کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھیں۔ یورپ اس زمانہ میں اس قدر متمول نہیں تھا۔ جس قدر کہ آج ہے۔ بہر طور جن یورپین اقوام نے ہندوستان سے تجارتی روابط کے لئے جد و جہد کی۔ ان کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

پرتگالی

جب یورپین قوموں میں تجارت کا یہ خیال پیدا ہوا تو سب سے پہلے اسپین والوں (Spaniards) نے حرکت کی۔ لیکن کولمبس (Columbus) بجائے ہندوستان کے امریکہ (America) پہونچ گیا۔ ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کا سہرا پرتگال کے واسکوڈی گاما (Vasco de - Gama) کے سر ہے۔ وہ آفریقہ کی جنوب سے ہوتا ہوا ہندوستان کے ساحل ملیبار پر ۲۲ مئی ۱۴۹۸ء کو پہونچا۔ سامری نے اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ اس کو یہ کیا معلوم تھا کہ اس کے یہ آج کے مہمان کل اس کی حکومت کو تہ و بالا کر دیں گے۔

بہر طور ۱۵۰۰ء میں پرتگال والوں کی پہلی تجارتی کوٹھی کلیکٹ ( ) میں قایم ہوئی۔ ۱۵۱۰ء میں انہوں نے گوا پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۱۰ء میں کلیکٹ کو لوٹ کر تباہ کرتے ہوئے سامری کا محل بھی جلا دیا۔ ایک صدی کے اندر اندر ان کی کوٹھیاں کوڑیال بندر (منگلور) کوچین، سیلون، آرمز، ڈیو، گوا، اور ناگ پٹن (ناگور) ضلع جنوبی ارکاٹ میں قایم ہو گئیں۔

پرتگال والوں کے آنے سے پہلے بندوق اور آتشیں اسلحہ سے ہندوستان ناواقف تھا آتشیں اسلحہ کی بدولت ہی وہ یہاں کے باشندوں پر فتحیاب ہوئے۔ اور ان بندرگاہوں پر جن پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ طرح طرح کے ظلم کئے انہوں نے ہندوستان کی تجارت سے اسقدر

فائدہ اٹھایا کہ اس زمانے میں پرتگال یوروپ کا سب سے متمول ملک بن گیا۔ پرتگال والے ہندوستان میں مقامی حکمرانوں کو بھی مدد دینے لگے۔ بیک وقت ان کے سپاہی دو حریف حکمرانوں کی فوج میں نظر آتے تھے۔ اگلے صفحات میں لکھا جا چکا ہے کہ وجیانگر والوں کی ہندو فوج میں بھی پرتگالی نظر آتے تھے۔ اور بیجاپور کی اسلامی فوج میں بھی۔ وجیانگر کے زوال سے انکی تجارت پر بھی زوال آیا۔ لیکن اس کا ایک اور سبب بھی ہے۔ یعنے ڈچ قوم ان کی رقیب بن گئی تھی۔ اس کے اور اسباب بھی ہیں۔ ایک یہ کہ ملکی لوگوں پر انہوں نے مذہب کے نام پر حد درجہ ظلم کرنا شروع کر دیا تھا۔

پرتگال والوں نے گوا اور دوسرے ساحلی مقامات پر مسلمانوں اور ہندوؤں پر جو ظلم وستم کیا اس کی ادنی مثال سیاح فریئر کے بیان سے ملتی ہے۔ جو ۱۶۷۵ء میں گوا گیا ہوا تھا۔

سیاح فریئر لکھتا ہے :-

"میں صبح ہی صبح اس مقام پر پہونچا جو پرتگالی پادریوں کا دارالقضا کہلاتا ہے اگر اس دارالقضا کو مقتل کہا جائے تو بالکل مناسب ہوگا۔ بازار کے بیچ میں ایک بہت بھاری اور بڑا انجن سولی کی طرح کھڑا کیا گیا ہے۔ جس کر ایک چرخ لگا ہوا تھا۔ انجن پر پہونچنے کے لیئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ جن لوگوں کو سزا دینی ہوتی تھی۔ اس کو ایک شہتیر پر پڑا کر انجن کے ذریعہ اوپر کھینچ لیتے تھے۔ اور پھر وہاں سے اس کو گرا دیتے تھے۔ جس کے صدمے سے اس کی ہڈیاں چور چور ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ پادری جب کسی کو آگ میں جلانے کا حکم دیتے تھے۔ انہیں ایک قسم کا لباس پہنا کر جلادوں کے حوالے کیا جاتا تھا۔ جو انہیں لے جاکر

آگ میں زندہ ڈال دیتے تھے۔ بازار میں سوائے سور کے اور کوئی گوشت فروخت کرنا ممنوع تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس ظلم کو سہ رہے تھے۔"

(کتاب تحفۃ المجاہدین میں پرتگالیوں کے ظلم وستم کی پوری تاریخ دی گئی ہے)

ڈچ

پرتگال والوں کے تمول اور کامیابی کو ہالینڈ والے (Holland) رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے جہازات تیار کئے۔ پرتگال والوں سے بحری لڑائیاں لڑیں۔ ان کے مقبوضات اور کوٹھیوں پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ پرتگال والوں کے قبضہ میں صرف گوا، دیو اور دمن رہ گئے۔ جنوبی ہند میں ڈچ والوں نے پلیکٹ اور سدراس میں جو مدراس کے قریب ہی ہیں۔ اپنی کوٹھیاں قایم کیں۔ شمال میں بنگال میں ان کی تجارت چنسورا میں وسیع پیمانہ پر ہوتی تھی۔ چنسورا میں انہوں نے ۱۶۷۵ء میں کوٹھی قایم کی تھی آگرہ میں بھی ایک مختصر کوٹھی تھی۔ چند سال کے بعد یہ قوم ملک کی سیاست میں دخل دینے لگی۔ اس وقت انگریز بنگالہ میں قدم جمانے لگے۔ انہوں نے چاہا کہ انگریزوں کو بنگالہ سے بے دخل کردیں۔ تاریخ ہند کا مشہور غدار میر جعفر اس وقت بنگالہ میں حاکم تھا۔ گو اس نے اپنے آقا سراج الدولہ سے غداری کرکے انگریزوں کے قدم ملک میں جما دئے تھے۔ اور نواب بن گیا تھا۔ لیکن اب اس کو انگریزوں کی موجودگی گران گزرنے لگی۔ اس نے ڈچ سے سازش شروع کی۔ ڈچ نے بٹاویا سے ایک بحری بیڑا دریائے ہگلی میں بھیجا۔ کلایو نے جو اس وقت بنگالہ میں تھا۔ بھانپ لیا کہ ڈچ والوں کا ارادہ کیا ہے۔ اس نے کرنل فورڈ کو حکم دیا کہ ڈچ کے بیڑہ پر حملہ کرے۔ ڈچ کا بیڑا تباہ ہوگیا۔ اسکے ساتھ ہی انکی تجارت پر بھی زوال

آگیا۔ صرف چنسورا بنگال میں ان کی تجارت باقی تھی۔ جنوبی ہند کے بندرگاہوں پلیکٹ اور سہ راس پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں انگریزوں نے چنسورا کے عوض ملک سماٹرا ان کو دے کر چنسورا پر بھی قبضہ کرلیا۔ اور اس طرح ڈچ قوم کا تعلق ہندوستان سے منقطع ہوگیا

انگریز اور فرانسیسی

ڈچ قوم کے بعد انگریز اور فرانسیسی قومیں ہندوستان میں آئیں۔

انگریزوں نے پہلے تو ہندوستان کو آنے کیلئے ایک شمال مشرقی راستہ کی تلاش کی لیکن اس میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ۱۵۸۰ء میں ان کے ایک بحری افسر سر فرانس ڈریک نے (Francis Drake) نے ایک پرتگالی جہاز پر چھاپہ مارا۔ مال غنیمت میں اس کو ایک نقشہ ملا۔ جس میں ہندوستان کا بحری راستہ دکھایا گیا تھا۔ اس نقشہ کی مدد سے ۱۵۹۲ء میں سر جان لنکاسٹر (John Lancaster) راس امید (Cape of Good Hope) کے راستہ سے جاوا پہونچا۔ ۱۶۰۸ء میں جس انگریز افسر نے ہندوستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھا وہ کپتان ہاکنس (Hawkins) تھا۔ اس کا جہاز ۱۶۰۸ء میں بندرگاہ سورت میں پہونچا۔ وہ جیمس اول شاہ انگلستان کی جانب سے شہنشاہ جہانگیر کے نام خط لایا تھا۔

پرتگال والوں نے اس کے خلاف سازش کی۔ اس لئے ہاکنس دہلی سے سورت کو جلد واپس آگیا۔ اس کے چار سال بعد ۱۶۱۲ء میں انگریزوں نے ایک بحری بیڑہ پرتگال والوں کے خلاف بھیجا۔ اور پرتگال والوں کو شکست دی۔ ۱۶۱۳ء میں شہنشاہ جہانگیر نے انگریزی کمپنی کو بندرگاہ سورت میں تجارت کرنے کیلئے اجازت دیدی۔ یہ اجازت سر تھامس رو (Thomas Roe) کو دی گئی تھی۔ جو انگریزی سفیر بن کر آیا تھا۔ سورت کے علاوہ ملیبار کی بندرگاہوں میں بھی انہوں

نے کوٹھیاں قایم کیں ۔ ۱۶۲۸ء میں مدراس سے ستر میل جنوب میں ایک کوٹھی ارمیگاؤں میں قایم ہوی ۔ ۱۶۴۰ء میں کلکتہ میں ایک کوٹھی قایم ہوی ۔ یہاں کی تجارت اس وقت تک صرف پرتگال والوں کے ہاتھ میں تھی ۔ پرتگالی غلاموں کی تجارت کے علاوہ بنگال کے نواب سے بھی شاہجہاں کے خلاف سازباز کر رہے تھے ۔ یہ خبر جب دہلی پہونچی تو شہنشاہ شاہجہاں نے فوج بھیجکر پرتگال والوں کو بنگالہ سے بے دخل کیا ۔ ان کی کوٹھیاں تباہ کیں اور جہازات جلا دئے گئے ۔ پرتگال والوں کی تجارت پر زوال آتے ہی انگریزوں نے درخواست کی ۔ چنانچہ ان کو ہگلی کے قریب تجارت کرنے کی اجازت دی گئی ۔ انہیں حکم تھا کہ دریائے ہگلی میں ان کے جہازات نہ آئیں ۔ ان کو ایک بھاری محصول بھی ادا کرنا پڑتا تھا ۔

اس کے بعد ہی انہوں نے شاہزادہ شجاع سے جو شاہجہاں کا دوسرا لڑکا تھا ۔ ہگلی میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرلی ۔

عام طور پر تاریخوں میں لکھا گیا ہے کہ شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا بیمار تھی ۔ اس کے علاج کے لئے شہنشاہ نے ایک انگریز طبیب کو بندرگاہ سورت سے طلب کیا تھا ۔ اس کے علاج سے شہزادی اچھی ہوگئی ۔ اس کے صلہ میں شاہجہاں نے انگریزوں کو بنگالہ میں تجارت کرنے کی اجازت دیدی ۔ لیکن اکثر مورخین اس روایت کو غلط کہتے ہیں ۔ ان کا بیان ہے کہ شجاع بنگالہ کا گورنر تھا ۔ اس کی ایک حرم بیمار تھی ۔ اس وقت بغشن نے جو انگریزی جہاز میں ڈاکٹر تھا ۔ اس حرم کا علاج کیا ۔ اس صلہ میں شجاع نے انگریزوں کو بنگالہ میں تجارت کی اجازت دیدی ۔

اسی زمانہ میں انگریزوں نے جنوبی ہند میں مدراس میں اپنی تجارتی کوٹھی قایم کی ۔ اس کی سندان کو ۱۶۳۹ء میں مدراس علاقہ کے ہندو حاکم نے جو وجیانگر کے راجہ کی جانب سے یہاں حکمران تھا ۔ ملی ۔ یہاں یہ کمپنی ۱۷۴۳ء تک صرف تجارت کرنے تک محدود تھی ۔ اس سال انوارالدین نے

انہیں فرانس والوں کے خلاف مدد دی۔

اس کے بعد ہی انگریز کرناٹک اور ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے۔ جس کا کچھ حال اس تاریخ میں آچکا ہے۔ اور نتیجہ معلوم ہے۔

فرانسیسی

انگریزوں کی طرح فرانسیسی بھی ہندوستان میں ۱۶۶۴ء میں آئے۔ ۱۶۶۸ء میں بندرگاہ سورت میں ان کی پہلی کوٹھی قایم ہوئی۔ ۱۶۶۹ء میں مچھلی بندر میں انگریزی کوٹھی کے قریب اپنی کوٹھی قایم کی۔ ۱۶۷۴ء میں پانڈیچری میں ان کی ایک اور کوٹھی قایم ہوئی۔ ۱۶۹۳ء میں ڈچ نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ۱۶۹۷ء میں پھر فرانس والے پانڈیچری پر قابض ہوگئے۔ ۱۷۲۵ء میں ماہی بندرگاہ میں ایک کوٹھی قایم ہوئی۔ اور ۱۷۳۹ء میں تنجاور ضلع میں کاریکال میں بھی ان کی ایک اور کوٹھی قایم ہوئی۔

جس طرح ڈچ اور فرانسیسی لڑ رہے تھے۔ اسی طرح انگریزوں اور فرانسیسیوں میں بھی تجارتی رقابت تھی۔ اور ان میں بھی جنگیں ہوتی تھیں۔ یوروپ میں جب کبھی جنگ چھڑی تو اس کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا۔ ایک ایسی ہی جنگ ۱۷۴۳ء میں ارکاٹ کے نواب انوارالدین نے ان کے خلاف انگریزوں کی مدد کی۔ یہاں جس طرح انگریزی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی طرح فرانسیسیوں کا بھی ہوتا ہے۔ فرانسیسیوں کو ملک گیری کا بالکل خیال نہ تھا۔ یہ اپنی تجارت پر قانع تھے۔ لیکن انوارالدین کی کارروائی نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ اس کے اور انگریزوں کے خلاف کارروائی کریں۔ فرانسیسی طاقت اسی وقت تک کامیاب رہی۔ جب تک ڈوپلے گورنر رہا۔ اور یہ معلوم ہورہا تھا کہ فرانسیسی اثر تمام ملک پر مسلط ہوجائیگا۔ ڈوپلے کے واپس جاتے ہی فرانس

والوں پر زوال آگیا۔ گو ایک عرصہ تک یہ انگریزوں کے خلاف ملکی حکمرانوں سے ساز باز کرتے رہے۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ جنوبی ہند میں ان کے مقبوضات اب صرف پانڈیچری، کاریکال اور بندرگاہ ماہی ہیں ہیں۔

جرمن اور فلمش

بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ جرمن قوم نے بھی ہندوستان سے تجارتی تعلقات قائم کئے تھے۔ لیکن یہ بہت دیر بعد آئی تھی ۱۷۵۱ء میں ان کے تجارتی جہازات دریائے ہگلی میں کلکتہ کے قریب آئے۔ ان کی تجارتی کوٹھی چندرنگر کے قریب تھی۔ [illegible] فرانسیسیوں نے اس کی مخالفت شروع کردی۔ نو سال کے بعد یہ کمپنی اپنی تجارت [illegible] واپس چلی گئی۔ اسی طرح فلمش قوم بھی یہاں کامیاب نہ ہو سکی۔ گو اس نے اپنی کوٹھی ۱۷۲۷ء میں بنگالہ ہی میں قائم کی تھی۔

انگریز کیوں کامیاب ہوئے

یہ ایک حقیقت ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے پاس کوئی بحری طاقت نہیں تھی۔ عالمگیر کے عہد میں پرتگال والوں نے اپنی بحری طاقت کے ذریعہ ہندوستانی تجارت کو بہت نقصان پہنچایا اور حجاج کے جہازات کو بھی لوٹنا شروع کردیا تھا۔ انگریزوں نے یہ حالات دیکھے ہوئے تھے اور انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ بحری طاقت کے فقدان نے مغلیہ سلطنت کو کس طرح بے بس رکھا ہے۔ پرتگال والوں کی تمامتر توجہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر تھی۔ انگریز ابتدا [illegible] میں انکا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مشرقی ساحل کا رخ کیا۔ بنگالہ اور مدراس میں ان

کی کوششیں قایم ہوئیں۔ میر جعفر کی غداری سے بنگالہ کا ملک ان کے ہاتھ آگیا۔ فرانس والوں نے بھی مشرقی ساحل کو ہی اپنا آماجگاہ بنایا۔ لیکن ان کی بحری طاقت انگریزوں کے برابر کبھی نہیں ہوی۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فرانس والوں کو ملک گیری کی ہوس نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ بلکہ اپنے اولوالعزم گورنر کو بھی واپس بلا کر اپنے اقتدار کا خاتمہ کر لیا۔ اب صرف انگریز رہ گئے جو اپنی بحری طاقت سے پورا فائدہ اٹھا کر ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دیکر ملک گیری شروع کر چکے تھے۔ ارکاٹ کے خاندان نے انہیں ملک گیری سے آشنا کر دیا تھا۔ ہندوستان میں صرف دو سلطنتیں تھیں جو کامیابی سے ان کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ ایک میسور کی سلطنت خداداد تھی۔ اور دوسری مرہٹوں کی۔ جن کے پاس کچھ بحری طاقت بھی تھی۔ انگریزوں نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ سلطنت خداداد کے حکمران جب بحری طاقت پر توجہ کرتے ہوئے فرانس اور ترکی سے دوستانہ بڑھانے لگے تو انگریزوں کو خوف پیدا ہو چلا کہ اب ان کی تجارت اور ملک گیری کا خاتمہ ہو جائیگا۔ انہوں نے آخر اس سلطنت کو بھی سازشوں کے ذریعہ ختم کر دیا۔ مرہٹے بھی اسی طرح سازشوں کا شکار ہو کر ختم ہو گئے۔

اس لئے ہندوستان میں انگریزی راج قایم ہونے کے بڑے اور اصلی اسباب دو ہیں۔

(۱) انگریزوں کی بحری طاقت۔

(۲) خود ہندوستانیوں کا آپس کا نفاق۔ جس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں نے اور بڑھا دیا۔ جس کے ثبوت میں ملک کی تاریخیں بھری پڑی ہیں۔



مدورا ۔ ملک کافور کی مسجد

تاریخ مدورا

جنوبی ہند کی تاریخ اسلام کا ایک گمشدہ ورق

ساحل کورومنڈل پر ضلع مدورا کو مسلمانوں سے اوائل اسلام ہی سے تعلق رہا ہے۔ اس کا بندرگاہ کائل پٹن عرب سوداگروں کی منڈی تھی۔ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ جنوبی ہند بلکہ کل ہندوستان میں ساحل کورومنڈل اور ملیبار ہی دو ایسے خطے تھے۔ جو اسلام سے اسی وقت واقف ہوگئے تھے۔ جب اس کا ظہور عرب میں ہوا۔ اس کے علاوہ مدورا کی سیاسی تاریخ کو بھی مسلمانوں سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی حکومت کی بنیاد اسی ضلع اور اسی شہر میں پڑی تھی۔ یہ اسلامی تاریخ کا ایک بھولا ہوا سبق یا ایک گمشدہ ورق ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر سیاح ابن بطوطہ اس حکومت کا اپنے سفرنامہ میں ذکر نہ کرتا تو مدورا کی ایک اسلامی تاریخ صفحۂ علم سے بالکل محو ہو جاتی۔

تاریخ جنوبی ہند کے اگلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ کہ مسلمانوں نے ۱۳۱۰ء میں جنوبی ہند پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت ان کے پیش نظر مدورا کی راجدھانی تھی۔ جہاں دو بھائی تخت کے لئے لڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک بھائی سندر پانڈے نے سلطان علاؤالدین سے مدد مانگی تھی اور علاؤالدین نے ملک کافور کو اس کی تائید پر بھیجدیا تھا۔ اب تک جس قدر

واقعات روشنی میں آچکے ہیں۔ ان سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ملک کافور مدورا شہر کو فتح کرکے سندر پانڈے کو تخت نشین کرکے واپس ہوا۔ کافور کے واپس جانے کے بعد سندر پانڈے کے خلاف پھر ملک میں بغاوت ہوئی۔ اور ٹراونکور کے راجہ راوی ورماکل سیکرا نے مدورا پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد سندر پانڈے اور مسلمانوں کا نام تاریخ میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مختصر سی اسلامی فوج کا یہاں خاتمہ ہوگیا۔ جو کافور سندر پانڈے کی حفاظت کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ یہ خبر جب دہلی میں پہونچی تو مبارک شاہ خلجی نے ۱۳۱۸ء میں خسرو کو جنوب میں بھیجا۔ جس نے راوی ورماکل سیکرا کو شکست دیکر پھر مدورا اور ملیبار پر قبضہ کرلیا۔ (خسرو کا ارادہ تھا کہ خود حاکم بن بیٹھے۔ لیکن دوسرے مسلمان امرا جیسے ملک تیغہ ملک گل اور ملک تیمور کی موجودگی نے اس کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ لیکن خفیہ طور پر اس نے مسلمانوں کی حکومت کے خلاف جو کچھ کیا وہ پچھلے صفحات میں لکھا جا چکا ہے) اور یہی وجہ ہے کہ خسرو کی واپسی پر ہندوؤں نے پھر اس مسلمان فوج کا بھی خاتمہ کردیا جو خسرو نے اس ملک میں چھوڑی تھی۔

(نوٹ:۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں نے یہاں مستقل حکومت کی بنیاد نہیں ڈالی۔ وہ صرف سندر پانڈے کی حکومت کے محافظ کے طور پر ملک میں تھے۔ کسی تاریخ سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا۔ کہ کافور کے جانے کے بعد مسلمانوں کے کون کون سردار اس ملک میں رہ پڑے تھے)

یہ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے کہ کافور کی واپسی پر خود ہندوؤں نے سندر پانڈے کی حکومت کا خاتمہ کردیا تھا۔ اب مبارک شاہ کی اس فوج کا جس کو خسرو یہاں چھوڑ گیا تھا۔ خاتمہ ہوگیا۔ اور اس کی خبر دہلی پہونچی تو اس وقت سلطان محمد تغلق سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس نے خواجۂ جہاں کو جنوب پر فوج کشی کا حکم دیا۔

خواجہ جہاں نے مدورا کو از سر نو فتح کر کے یہاں جلال الدین احسن کو گورنر مقرر کیا۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے :۔

"بادشاہ نے معبر کے ملک (جو دلی سے چھ مہینے کے راستے پر ہے) کا حاکم سید جلال الدین احسن شاہ کو مقرر کیا تھا۔"

یہی سیاح لکھتا ہے :

"جلال الدین احسن سلطان محمد بن تغلق کے امرائے دربار سے تھا۔"

فرشتہ نے بھی اپنی تاریخ میں اسی نام کی تصدیق کی ہے۔ مورخ برنی (ضیاء الدین) نے اس نام کو سید حسین لکھا ہے۔ اور لکھا ہے کہ وہ سادات کیتھل میں سے تھا۔

جلال الدین احسن گورنر بننے کے بعد چھ سال تک محمد بن تغلق سے وفادار رہا۔ اس کے بعد وہ بغاوت کر کے مدورا کا خود مختار حاکم بن گیا۔ یہ گویا پہلا اسلامی بادشاہ ہے جو مدورا کی سلطنت پر حکمران ہوا۔ اسکی بغاوت کے متعلق ابن بطوطہ لکھا ہے :۔

"اس نے مخالفت کی اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ اور اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ اور دینار کے ایک طرف یہ عبارت نقش تھی :۔

"سلالۃ طٰہٰ ویٰسٓ ابو الفقرا والمساکین جلال الدنیا والدین"

اور دوسری طرف یہ عبارت تھی :۔

"الواثق بتائید الرحمٰن احسن شاہ السلطان"۔"

اس سکہ اور عبارت کی تصدیق ان سکوں سے بھی ہوتی ہے۔ جو مدراس کے محکمۂ آثار قدیمہ نے دستیاب کیا ہے۔ ان سکوں پر ۷۳۶ھ ہے (یعنی ۱۳۳۶ء) اس سال سے اگلے سالوں کے جو سکے ملے ہیں۔ ان پر سلطان محمد بن تغلق کا نام ہے۔ محمد بن تغلق کے جو سکے

مدورا میں مضروب ہوئے ان پر حسب ذیل عبارت تھی ۔

(۱) الواثق محمد بن

بنصر اللہ تغلق شاہ

(۲) الامام محمد بن

العادل تغلق شاہ

(۳) السلطان العادل

بہر طور سیاح ابن بطوطہ کی تحریر اور سکہ جات کے نقوش سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ سلطان جلال الدین احسن شاہ نے چھ سال وفادار رہنے کے بعد ۱۳۳۵ء میں مدورا میں ایک خود مختار اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی ۔ اور اس کی اس خود مختار حکومت کی مدت پانچ سال تک رہی ۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے :۔

"سید حسن باغی ہونے کے بعد پانچ سال تک بالاستقلال برسر حکومت رہا۔ اس کے بعد امرا نے اس کو قتل کر ڈالا"

سید احسن کی بغاوت کی خبر سن کر سلطان محمد بن تغلق دہلی سے جنوب کی جانب نکلا ۔ جب تلنگانہ کے قریب پہونچا تو بیمار ہو گیا ۔ اس وقت ملک سندھ میں بغاوت ہوی ۔ یہ خبر سن کر بادشاہ سندھ کی طرف چلے گیا ۔ سلطان محمد بن تغلق کی واپسی نے جلال الدین احسن کو ایک مستقل حکومت قایم کرنے کا اچھا موقع دیدیا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نہایت شان و شوکت سے حکومت کی ۔ اور بحری طاقت کی طرف بھی توجہ کی تھی ۔

سیاح ابن بطوطہ لکھتا ہے :۔

"اس نے مدورا شہر کی دہلی کے نمونہ پر بنیاد ڈالی ۔ اور اس میں اچھی اچھی عمارتیں بنوائیں ۔ سلاطین معبر کی عملداری میں مدورا کے بعد پٹن (کائل) کا درجہ تھا شاہان معبر کا بحری بیڑہ اس جگہ رہا کرتا تھا ۔ جس کے لئے بندرگاہ کے قریب لکڑی کا ۔۔۔ و غریب برج بنایا گیا تھا ۔ جب کبھی مخالفین کا خوف ہوتا تو اہل جہاز اس برج پر چڑھ کر محفوظ ہو جاتے تھے۔"

پانچ سال حکومت کرنے کے بعد جلال الدین احسن نے وفات پائی ۔ اسکی دو لڑکیاں تھیں ۔ ان میں بڑی کا نام حور نسب تھا ۔ جو ابن بطوطہ سے منسوب تھی ۔ دہلی میں اس کا نکاح ہوا تھا ۔ ابن بطوطہ اپنی اس بی بی کے متعلق لکھتا ہے :-

" نہایت نیک بخت بی بی تھی ۔ رات کو تہجد پڑھتی تھی ۔ پڑھنا بھی جانتی تھی ۔ لیکن لکھنا نہیں آتا تھا ۔"

جلال الدین کی وفات پر امراء نے اس کے ایک امیر علاؤ الدین اروجی کو تخت پر بٹھایا اس نے ایک سال تک حکومت کی ۔ یہ ایک سال ہندوؤں سے جنگ ہی میں گذرا ۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے :-

"اس نے حکمران ہونے کے بعد کسی ہندو راجہ پر حملہ کیا ۔ اور بہت سا مال و دولت لے کر اپنے دارالحکومت کو واپس آیا ۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد اس نے پھر اسی ہندو راجہ پر چڑھائی کی ۔ بادشاہ کو اثنائے جنگ میں ایک تیر آ کر لگا ۔ جس کے صدمے سے فوراً مر گیا ۔"

علاؤ الدین کے بعد اس کا داماد قطب الدین تخت نشین ہوا ۔ لیکن امراء اس کی عادتوں سے ناراض تھے ۔ تخت نشینی سے چالیس دن بعد اس کو قتل کر دیا گیا ۔ اس کے بعد ایک دوسرا امیر

غیاث الدین دامغانی جو ترکی النسل تھا۔ تخت پر بیٹھا۔ اس نے جلال الدین احسن گیلانی کی بیٹی سے جو ابن بطوطہ کی سالی تھی نکاح کیا۔ اس کے عہد میں راجہ بلال سوم سے برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ہر سے سالا راجہ بلالاپے در پے حملے کرتا رہا کہ مسلمانوں کو مٹا دیا جائے۔ لیکن جاں باز مٹھی بھر مسلمان برابر مدافعت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بلال سوم ایک جنگ میں مارا گیا۔ اس جنگ کی تفصیل ابن بطوطہ نے لکھی ہے۔ جس سے اس زمانے کے مسلمانوں کا جوش وخروش، ان کا جذبۂ ایمانی اور باوجود اس قدر اقلیت میں ہونے کے انکے استقلال اور جوانمردی کا پتہ چلتا ہے۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے :۔

"اس بادشاہ (دامغانی) کے قرب وجوار میں ایک راجہ بلال دیو تھا۔ یہ بڑا عظیم الشان راجہ تھا۔ اس کا لشکر ایک لاکھ کے قریب تھا۔ اس کے ساتھ بیس ہزار مسلمان تھے۔ جن میں اکثر چور اور ڈاکو اور بھاگے ہوئے غلام تھے۔ اس نے معبر پر حملہ کیا۔ اس وقت بادشاہ کے پاس فقط چھ ہزار فوج تھی۔ جن میں سے نصف تعداد تو اچھے سپاہیوں کی تھی۔ اور باقی یونہی فضول اور بے سامان تھے۔ شہر کبان کے باہر مقابلہ ہوا۔ معبر کے لشکر نے شکست کھائی۔ اور وہ سب شہر مترہ دارالخلافہ کو واپس آ گئے۔ اور راجہ نے کبان کا محاصرہ کیا۔ یہ شہر بہت بڑا اور مضبوط تھا۔ اس نے دس مہینے تک اس کا محاصرہ کیا۔ اور قلعہ والوں کے پاس صرف چودہ دن کی خوراک باقی رہ گئی۔ راجہ نے ان کو پیغام بھیجا کہ اگر تم قلعہ چھوڑ دو تو تمہیں امان ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم پہلے بادشاہ سے خبر منگالیویں راجہ نے کہا اچھا اسی چودہ دن کے عرصہ میں اجازت منگالو۔ راجہ نے سلطان

غیاث الدین کو لکھا۔ اس نے جمعہ کے دن وہ خط سب لوگوں کو سنایا۔ حاضرین سن کر روئے اور کہا۔ ہم اپنی جانیں اللہ کے راستے میں وقف کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر راجہ نے وہ شہر لے لیا تو ہمارے شہر پر آئیگا گرفتار ہونے سے تلواروں کے سامنے میں مرنا بہتر ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ عہد کیا کہ کوئی نہ بھاگے۔ اور دوسرے دن سب نکلکر اپنے عمامے گھوڑے کی گردن میں باندھ دئے۔ یہ علامت اس بات کی تھی کہ مر جائیں گے۔ بھاگ کر نہ آئیں گے۔ ان میں سے دلیر اور بہادر سب آگے بڑھے۔ وہ تعداد میں تین سو کے قریب تھے۔ میمنہ پر سیف الدین بہادر کو کھڑا کیا۔ یہ شخص بڑا عالم، پرہیزگار اور بہادر تھا۔ اور میسرہ پر ملک محمد سلحدار کو اور سلطان قلب میں تھا۔ اس کے ساتھ اس کی تین ہزار فوج تھی۔ باقی تین ہزار کو ان کے پیچھے کیا۔ اور ان پر اسد الدین کیخسرو فارسی کو سردار بنایا۔ زوال کے وقت انہوں نے سفر شروع کیا۔ دشمن بالکل غافل تھا۔ ان کے گھوڑے چراگاہ میں گئے ہوئے تھے۔ اسد الدین نے ان پر ناگہاں حملہ کیا۔ راجہ نے سمجھا کہ چور ہیں۔ اس لئے بغیر کسی تیاری کے ان کے مقابلہ کے لئے نکلا اور ان کا مقابلہ کیا۔ اتنے میں بادشاہ غیاث الدین بھی جا پہنچا۔ راجہ نے فاش شکست کھائی۔ اور ارادہ کیا کہ سوار ہو کر بھاگ جائے۔ وہ عمر میں اسی برس کا تھا۔ ناصر الدین نے جو غیاث الدین کا بھتیجا تھا۔ اس کو پکڑ لیا۔ اور چاہتا تھا کہ اس کو قتل کرے۔ کیونکہ وہ اس کو پہچانتا نہ تھا۔ لیکن اس کے ایک غلام نے کہا کہ یہ راجہ ہے۔ اس لئے ناصر الدین نے اس کو قید کر لیا۔ اور اپنے چچا کے پاس پکڑ کر لے آیا۔ بادشاہ نے ظاہر میں اسکی تعظیم کی۔ اور خراج میں بہت سامال، ہاتھی اور گھوڑے لے لئے۔ کیونکہ

اس سے وعدہ کرتا تھا کہ تجھے چھوڑ دونگا۔ جب اس کے پاس کچھ نہ رہا تو اس کو ذبح کرڈالا۔ اور اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھوسہ بھروا کر مترہ کی فصیل پر اس کو لٹکا دیا۔ میں نے بھی اسکو وہاں لٹکا ہوا دیکھا۔"

(ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ از مولوی محمد حسین ایم۔ اے)

راجہ بلالا سوم کے خاتمہ کے بعد غیاث الدین دامغانی نے ابن بطوطہ کی تحریک پر جزائر مالدیپ کی فتح کا ارادہ کیا۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے :-

"اس غرض کے لئے اس نے کئی جہاز مقرر کئے۔ اور وہاں کی ملکہ کے لئے تحفے، وامراء کے لئے خلعتیں تیار کیں۔ محتاجوں کے لئے تین جہازوں میں صدقہ بھروایا۔ لیکن یہ زمانہ مالدیپ کے سفر کا نہ تھا۔ اس لئے یہ مہم تین مہینے کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ اسی اثنا میں غیاث الدین دامغانی کا انتقال ہوگیا۔ جس کی وجہ سے اسکی تکمیل نہ ہو سکی۔"

اس اولوالعزم سلطان کا عہد صرف دو سال تک رہا۔ اس زمانے میں مدورا میں وبا پھیل گئی تھی۔ بادشاہ بھی اسی میں مبتلا ہو کر فوت ہوا۔ مشہور مغربی سیاح ابن بطوطہ اسی بادشاہ کے زمانے میں مدورا میں آیا ہوا تھا۔ اس نے یہاں کے بہت سے حالات اپنے سفرنامہ میں دئے ہیں۔ جن سے اس وقت کے رسم و رواج اور دوسرے امور پر روشنی پڑتی ہے۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے :-

"جب میں کیمپ کے قریب پہونچا تو اس نے میرے استقبال کے لئے ایک صاحب کو بھیجا بادشاہ لکڑی کے برج میں بیٹھا ہوا تھا۔ دستور ہے کہ بادشاہ کے روبرو کوئی بے موزہ پہنے نہیں جا سکتا۔ میرے پاس اس وقت موزے نہ تھے۔ ایک ہندو نے مجھے

نوزہ دئے۔ حالانکہ بہت سے مسلمان موجود تھے۔ میں نے اس ہندو کی مروت پر تعجب کیا۔ میں بادشاہ کے سامنے گیا۔ مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ اور قاضی حاجی صدرالزماں بہاؤالدین کو بلوایا۔ اور اس کے قریب تین خیمے مجھے ٹھہرنے کے لئے دئیے۔ اور فرش اور کھانا یعنے چاول اور گوشت بھجوائے۔ اس ملک میں بھی ہمارے ملک کی طرح کھانے کے بعد دودھ کی لسی پیتے ہیں"

میدان جنگ میں دامغانی کے ظلم و ستم کے متعلق ابن بطوطہ لکھتا ہے :۔

"جب ہندو رات کو کیمپ پر چھاپہ مارنے کے واسطے آتے تھے تو سارا لوگ فوراً دشمن کے تعاقب میں چلے جاتے تھے۔ اور جو قیدی شام کو پکڑ کر لاتے تھے تو ان کو چار جماعتوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ہر ایک گروہ کو کٹھگر کے ایک ایک دروازے پر لیجاتے تھے۔ اور ہر ایک دروازے کے قریب وہ لکڑی جو کل قیدی اپنے کندھوں پر جنگل سے لاتے تھے گاڑ دیتے تھے۔ پھر اس لکڑی میں ہر ایک قیدی کو پروان دیتے تھے۔ اور ان کی عورتوں کے بال اسی لکڑی سے باندھ دیتے تھے۔ اور بچوں کو ان کے گودوں میں ذبح کرتے تھے ....

یہ بے رحم اور قابل نفرین کارروائی میں نے کسی بادشاہ کو کرتے ہوئے نہیں دیکھی اور اسی وبال سے یہ بادشاہ جلد مر گیا"

غیاث الدین دامغانی کے بعد اس کا بھتیجا ناصرالدین تخت نشین ہوا۔ اس کے متعلق ابن بطوطہ لکھتا ہے :۔

" یہ ناصرالدین دہلی میں بادشاہ (محمد بن تغلق) کا ملازم تھا۔ جب اس کا چچا معبر کا بادشاہ ہو گیا تو یہ شخص دہلی سے فقیروں کا بھیس بدل کر بھاگ آیا۔ اسکی تقدیر

میں غیاث الدین کے مرنے کے بعد بادشاہ ہونا لکھا تھا۔ جب اسکی بیعت کی گئی۔ تو

شاعروں نے اس کی تعریف میں قصیدے پڑھے۔ ان کو اس نے بڑے بڑے صلے دئے۔

پھر ناصر الدین نے اپنی پھوپی کے بیٹے کو جس کے ساتھ سلطان غیاث الدین دامغانی

کی لڑکی بیاہی ہوئی تھی قتل کروا دیا۔ اور اس کی بیوہ سے آپ نکاح کر لیا۔۔۔"

ابن بطوطہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر الدین نے مالدیپ کی ملتوی شدہ مہم کو پھر بھیجنا چاہا۔ لیکن خود ابن بطوطہ کے بیمار ہو جانے سے یہ مہم رک گئی۔ اور ابن بطوطہ یہاں سے بعد صحت ہونے کے چلا گیا۔ وہ اپنی واپسی کے وقت کابل سے گذرا۔ شہر کابل کے متعلق وہ لکھتا ہے۔

" اطراف عالم کے جہاز تجارت کی غرض سے یہاں آیا کرتے تھے۔ اس شہر میں ایک خوبصورت سنگین مسجد ہے۔ اس کے صحن میں انگور اور عمدہ انار کے کثرت سے درخت ہیں۔ یہاں میں شیخ صالح محمد نیشاپوری سے ملا۔ یہ ان مجذوب فقیروں سے ہیں جو اپنے بال بڑھاتے ہیں۔ اور شانوں پر چھوڑتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک شیر رہتا تھا۔ شیخ کے ساتھ تیس فقیر بھی تھے۔ شیر انہیں فقیروں کے ساتھ کھاتا۔ اور انہیں میں مل کر سوتا تھا۔ ایک فقیر کے پاس ایک ہرن بھی تھی۔ اور سات لومڑیاں بھی تھیں۔ ہرن اور لومڑی اس شیر سے ڈرتی نہیں تھیں۔ بلکہ شیر کے ساتھ مل کر سوتی تھیں۔"

سیاح ابن بطوطہ کی تحریر سے مدورا کے اسلامی بادشاہوں کے پانچ نام معلوم ہوتے ہیں۔ گو ابن بطوطہ نے انکی مدت حکومت کے سنین نہیں بتائے ہیں۔ لیکن محکمۂ آثار قدیمہ نے جو سکے دستیاب کئے ہیں۔ ان سے ناموں کی تصدیق کے علاوہ انکی مدت حکومت کا بھی تعین ہو جاتا ہے۔

ناصر الدین کے بعد سے پھر کچھ اور حالات مدورا کے نہیں ملتے۔ ہاں سکوں کے ذریعہ اور تین نام ملتے ہیں۔ یہ عادل شاہ، فخر الدین مبارک شاہ، اور علاؤ الدین سکندر شاہ کے ہیں۔

ناصرالدین کا عہد وہ زمانہ ہے۔ کہ جنوب میں سلطنت وجیانگر نہایت مستحکم ہو چکی تھی۔ اور اب بجائے ہوئے سالا سلطنت کے اس وجیانگر کی سلطنت کے حملے مدورا پر ہونے رہے۔ اس لئے ۱۳۴۴ء سے یعنے ناصرالدین کے عہد سے لیکر آخری بادشاہ علاؤالدین سکندر کے آخری سال ۱۳۷۷ء تک مدورا کے مسلمانوں کا کوئی حال نہیں ملتا۔ اس تمام عرصہ میں وہ وجیانگر سی عظیم الشان ہندو سلطنت کا برابر مقابلہ کرتے رہے۔ اس سال یعنے ۱۳۷۷ء میں انکا خاتمہ ہوگیا۔ وجیانگر والوں نے مدورا پر قبضہ کرلیا۔ اس قبضہ کے متعلق تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے:۔

"ہمسایہ سردار باکن نے معبر پر حملہ کیا۔ تمام معبر اس کے قبضہ میں آگیا۔ مسلمان عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ مسلمانوں پر صد درجہ ظلم کیا گیا۔"

اس پر ایک ہندو مورخ لکھتا ہے:۔

"کہ ہندوؤں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر بہت سے مسلمان دشوار گزار پہاڑوں اور جنگلوں میں اپنے مذہب کو چھپا کر رہنے لگے۔"

مدورا کی سلطنت، وجیانگر کے قلب میں ایک کانٹا تھا جو نکل گیا۔

جنوبی ہند اور اس کے مسلمان حملہ آور (South India and her Mdn Invaders) کا مصنف لکھتا ہے:۔

"مدورا کی فتح کے بعد ہی راجگان وجیانگر نے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔"

مدورا کی فتح پر ہندوؤں نے جس قسم کا جشن منایا۔ اس کے متعلق نلس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"۱۳۷۷ء میں وجیانگر کے ہندوؤں نے مدورا کو فتح کرلیا۔ برہمنوں نے اس فتح کو اپنا معجزہ دکھانے کا ایک ذریعہ بنالیا۔ یعنے انہوں نے کہا کہ بتوں نے خوش ہوکر مدورا کو پھر انہیں کو بخش دیا۔ . . . . . . برہمنوں نے ہندو جنرل کمپنا کو مندر

میں لے آئے. کپتا جب مندر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ مندر اسی حالت میں ہے۔ جس طرح ۸۰۰ سال پیشتر مسلمانوں کی فتح سے پہلے تھا. یعنے وہی اگلی حالت لوٹ کر آئی ہے۔ وہی چراغ جو ۸۰۰ سال پیشتر جل رہا تھا. اب بھی اسی طرح جل رہا ہے۔ وہی صندل کا سفوف اور وہی پھول جو اس دن شام کو مندر میں پوجا کے لئے حاضر تھے۔ مرجھائے ہوئے آج بھی موجود ہیں"

غرض ۸۰۰ سال کے بعد مدورا کی یہ اسلامی سلطنت مٹ گئی۔ اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ابن بطوطہ کے سفرنامہ سے پانچ سلاطین کے نام معلوم ہوئے. اور باقی تین سکوں کے ذریعہ اگر انہیں کے ذریعہ سلاطین مدورا کی فہرست مرتب کیجائے تو حسب ذیل نتیجہ نکلتا ہے :۔

(۱) جلال الدین احسن ۱۳۳۵ء سے ۱۳۴۱ء

(۲) علاؤالدین ۱۳۴۱ء

(۳) قطب الدین ۱۳۴۲ء صرف چالیس دن

(۴) غیاث الدین دامغانی ۱۳۴۲ء سے ۱۳۴۴ء

(۵) ناصرالدین ۱۳۴۴ء (ایک ہی سکہ ملا ہے)

ان پانچوں ناموں کی تصدیق ابن بطوطہ کے علاوہ سکوں سے بھی ہوتی ہے۔

۱۳۴۴ء سے ۱۳۵۵ء تک کے سکے دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔

(۶) عادل شاہ ۱۳۵۶ء / ۷۵۶ھ صرف ایک سال کے چند سکے ملے ہیں

(۷) فخرالدین مبارک ۱۳۵۹ء / ۷۶۱ھ سے ۱۳۶۸ء / ۷۷۰ھ تمام سالوں کے سکے ملے ہیں۔

(۸) سلطان علاؤالدین سکندر ۱۳۷۲ء / ۷۷۴ھ سے ۱۳۷۷ء / ۷۷۹ھ تک

اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ ۱۳۴۴ء سے ۱۳۵۵ء تک مدورا میں آیا صرف ناصرالدین ہی اوشار رہا یا اس کے اور کوئی جانشین ہوئے. کوئی ذریعہ نہیں کہ اس کے متعلق دریافت کیا جائے

مدورا ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں لکھا ہے :-

" گوری پالیم میں (جو مدورا کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے) اس میں ایک مسجد اس زمانے کی ہے۔ جس کو مسلمان نہایت اہمیت دیتے ہیں اس کے احاطہ میں دو قبریں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سلطان علاؤالدین اور اس کے بھائی شمس الدین کی ہیں۔"

معلوم نہیں ہوتا کہ یہ علاؤالدین آیا جلال الدین احسن کا جانشین تھا یا کوئی اور جو ناصرالدین کے بعد ہوا۔ ترو پاکن رام میں (جو مدورا سے چار میل پر ہے) پہاڑ پر ایک قبر ہے جس کو مسلمان سکندر ولی کی قبر بتاتے ہیں۔ غالباً یہ اسی آخری سلطان مدورا کی ہے۔

نلسن نے بھی اپنی تاریخ مدورا میں سلاطین مدورا کے نام دئے ہیں۔ اس نے جن ناموں کو دیا ہے وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) ملک نائب کافور	سنہ ۱۳۱۰ء سے سنہ ۱۳۱۲ء تک
(۲) علاؤالدین	سنہ ۱۳۱۳ء " سنہ ۱۳۱۹ء "
(۳) اتم الدین خان	سنہ ۱۳۱۹ء " سنہ ۱۳۲۲ء "
(۴) قطب الدین داماد	سنہ ۱۳۲۲ء " سنہ ۱۳۲۷ء "
(۵) نعتال الدین	سنہ ۱۳۲۷ء " سنہ ۱۳۳۴ء "
(۶) سوادالملک	سنہ ۱۳۳۴ء " سنہ ۱۳۴۱ء "
احمد الملک	
فندق ملک	سنہ ۱۳۴۹ء " سنہ ۱۳۵۸ء "

لیکن مولوی محمد حسین صاحب ایم۔ اے مترجم سفرنامۂ ابن بطوطہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ

یہ فہرست بالکل غلط اور نام نامانوس ہیں۔

سلاطین مدورا کے سکّے

اب جس قدر سکّے (جن کا اوپر ذکر آچکا ہے) ملے ہیں۔ ان کے نقوش یہاں کتاب مبصر سے دئے جاتے ہیں۔

(۱) جلال الدین احسن (۱۳۳۴ء، ۷۳۵ھ سے ۱۳۳۹ء، ۷۴۰ھ تک)

دینار طلائی

سلالہ طہ ویٰس	الواثق
ابوالفقراء والمساکین	بتائید الرحمٰن
جلال الدنیا والدین	احسن شاہ

چاندی کا سکہ

جلال الدنیا	شاہ
والدین	احسن ۷۳۷ھ

تانبے کے سکّے

(۱)

السلطان	شاہ
الاعظم	احسن سلطان

(۲)

سلطان	شاہ
السلاطین	احسن

(۳)

السلطان	جلال الدنیا
الاعظم	والدین

چاندی کا سکہ

شاہ	الحسینی
احسن	

(۲) علاؤالدین اودجی سنہ ۷۴۰ھ ۱۳۳۹ء

مخلوط سکہ

علاؤالدین	شاہ
والدین	اودجی

تانبہ

علاؤالدین	اودجی شاہ
والدین	السلطان

(۳) قطب الدین فیروز شاہ سنہ ۷۴۰ھ ۱۳۳۹ء

قطب الدین	شاہ
والدین	فیروز

(۴) غیاث الدین محمد دامغان شاہ ۷۴۰ھ ۱۳۴۰ء سے ۷۴۲ھ ۱۳۴۱ء

چاندی

السلطان	شاہ

الاعظم غیاث — دامغان

الدنیا والدین — محمد

ثانیہ

السلطان — غیاث الدنیا

الاعظم — والدین

(۵) ناصرالدین محمود شاہ ۷۴۵ھ ۱۳۴۴ء

ناصرالدنیا — محمود غازی

والدین — دامغان شاہ السلطان

(۶) عادل شاہ ۷۵۷ھ ۱۳۵۶ء

مخلوط

السلطان الحلیم — عادل شاہ

ثانیہ

(۱) السلطان — عادل شاہ

الاعظم — السلطان

(۲) عادل شاہ — السلطان

(۲) عادل — شاہ

فخرالدین مبارک شاہ ۷۶۱ھ ۱۳۵۹ء ۷۷۰ھ ۱۳۶۸ء

ثانیہ

(۱) برگزیدہ — مبارک شاہ

اللہ فخرشاہ	شاہ جہاں
سلطان	۷۶۱ھ
(۲) برگزیدہ	خادم
اللہ	مصطفیٰ ۷۶۵
(۳) برگزیدہ	خادم
اللہ	رسول اللہ
(۴) النبی	محمد
ناصف	مصطفیٰ

علاؤالدین سکندر شاہ ۷۷۴ھ ۱۳۷۲ء ۷۷۹ھ ۱۳۷۷ء

ثانیہ

(۱) برگزیدہ	شاہ
رحمان	سکندر
	السلطان ۷۷۵ھ
(۲) علاؤالدنیا	سکندر شاہ
والدین	السلطان

ان سکوں پر کپتان ٹرنل (Toffemaeed) نے سب سے پہلے روشنی ڈالی ہے۔



اس نقشہ میں جنوبی ہند کی وہ تقسیم بتلائی گئی ہے۔ جو شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے کی تھی جنوبی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ مشرقی میدانی ملک کو پائین گھاٹ اور مغربی پہاڑی حصہ کو بالا گھاٹ کا نام دیا گیا۔ (نوٹ) جنوبی ہند میں پہاڑیوں کو گھاٹ کہتے ہیں۔

جنوبی ہند کے مسلمان

جنوبی ہند کے مسلمان بلحاظ نسل مختلف طبقوں میں منقسم ہیں

(۱) دکنی مسلمان۔

(۲) لبے، مرکیار، نیمار، راؤتھر اور موپلے وغیرہ۔

(۳) اہل نوائط۔

(۱) دکنی مسلمان

یہ وہ مسلمان ہیں جو بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجوں کے ساتھ جنوبی ہند میں آئے۔ ان میں زیادہ تر بیجاپوری مسلمانوں کی تعداد ہے۔ اضلاع بلاری، انت پور، ریاست میسور اور مشرق میں ویلور تک انہیں کی تعداد زیادہ ہے۔ مشرقی اضلاع میں کرنول، نلور اور مدراس میں ترچن پلی تک ان مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے جو گولکنڈہ سے آئے تھے۔ بہر طور موجودہ مسلمان ان مسلمانوں کی اولاد ہیں جو سلطان علاؤالدین خلجی اور محمد بن تغلق کے عہد میں شمال سے نکلکر دکن میں آئے۔

اور وہاں سے جنوب میں پھیلے۔ ان میں سیّد بھی ہیں، شیخ، مغل اور پٹھان بھی ہیں۔ ان مسلمانوں کی مادری زبان دکھنی ہے۔ جس کو اردو سمجھنا چاہیئے۔ معاشرت کے لحاظ سے ان میں ابھی تک وہی رسم و رواج ہیں جو دکن کے مسلمانوں میں ہیں۔

(۲) لبّے، مرکیار، تبنار، راوتھر اور موپلے

بلحاظ نسل لبے، مرکیار اور موپلے وغیرہ صرف جنوبی ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ان عربوں کی اولاد سے ہیں جو کبھی اس ملک میں تجارت کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ ان میں بہت سے ایسے خاندان بھی ہوں۔ جن کو عربوں سے قطعی تعلق نہ ہو۔ بلکہ بعد میں اسلام لائے ہوں۔ ان مسلمانوں کے متعلق مورخین و محققین کی جو رائیں ہیں۔ ذیل میں دی جاتی ہیں:-

(۱) لبے

مدراس سنسر رپورٹ ۱۹۰۱ء میں تحریر ہے:-

"لبے مسلمانوں کی ایک قوم ہے۔ جس میں تامل خون ہے۔ یہ قوم پان، چمڑے اور دوسری اشیا کی تجارت کرتی ہے۔ یہ مرکیاروں سے بالکل علیحدہ ہیں۔ ان کی زبان میں بہ نسبت مرکیاروں کے عربی الفاظ بالکل کم استعمال ہوتے ہیں۔"

مدراس رپورٹ بابت ۱۸۸۱ء میں مرقوم ہے:-

"لبے ڈریوڈین قوم سے ہیں۔ جن میں عرب خون کی آمیزش ہو گئی ہے۔ یہ قوم نہایت محنتی اور جفاکش ہے۔ لبے تجارت میں خوب ماہر ہیں۔"

۱۸۹۱ء کی رپورٹ میں لکھا ہوا ہے:-

"مسلمانوں کی ایک مخلوط قوم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگلے مسلمان فاتحین

اور ٹیپو سلطان نے مسلمان بنایا تھا۔"

کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے :-

" حجاج بن یوسف کے ظلم سے بنی ہاشم کے لوگوں نے عرب سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ لی تھی - ان میں ساحل کوکن پر جو اترے وہ نوائط کہلائے۔ اور راس کماری اور مشرقی ساحل کورومنڈل پر جو اترے وہ لبے کہلائے۔ یہ لفظ " لبیک " سے نکلا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ جب یہ لوگ اس ملک میں آئے تو نہایت غریب تھے۔ یہاں کے لوگ جب انہیں مخاطب کرتے تھے تو وہ جواب میں لبیک کہتے تھے۔ جس کی معنی "میں حاضر ہوں" کے ہیں۔ لفظ لبے کی ایک اور تشریح بھی کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ شروع میں ان لوگوں کی تعداد بالکل قلیل تھی۔ یہاں کے ملکی حاکموں نے جب انہیں ستانا شروع کیا تو انہوں نے لبیک کہا یعنے "ہم آپ کے غلام ہیں" ۔

ایک اور مورخ کا بیان ہے :-

"لبے ان عربوں کی نسل سے ہیں جو گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں کایل (پٹن) میں جو ساحل کورومنڈل پر ہے۔ تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ جب یہاں رہتے ہوئے ان کو ایک عرصہ گذر گیا تو انہوں نے یہاں کی دیسی عورتوں سے شادی کر لی اور لبے انہیں عربوں کی اولاد سے ہیں"

لفظ لبے حال کی ایجاد ہے۔ ورنہ تامل زبان میں جو قدیم کتابیں ہیں انکے لئے لفظ "سونگن" لکھا ہوا ہے۔ سونگن سے مراد "ملک عرب" ہے۔ اس لحاظ سے لبے عربوں اور جنوبی ہند کے باشندوں کی ایک مخلوط نسل ہیں۔

بعض مورخین لکھتے ہیں :-

"لبے عام طور پران مسلمانوں کو کہا جاتا ہے جو عرب باپ اور ڈریویڈین ماں سے پیدا ہوئے۔ انہیں میں مرکیار اور راوتھر بھی ہیں۔ یعنے وہ لبے جو سپاہی پیشہ صاحب سیف ہوئے وہ راوتھر کہلائے۔ اور جو ملاح بنے مرکیار کہلائے۔

ان تمام روایات پر اگر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ شک نہیں رہتا کہ لبے، عرب اور ٹمل قوم دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ باپ کی جانب سے انکی نسل عربوں سے ملتی ہے تو ماں کی جانب سے یہ جنوبی ہند کی ٹمل قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ان عربوں کی اولاد ہیں، جو اس ملک میں تجارت کے لئے آئے تھے۔ ان میں بعض عرب تو یہیں رہ گئے تھے۔ اور بعض ملک عرب کو آتے جاتے تھے۔ انہوں نے یہاں شادیاں بھی کیں۔ اور کنیزیں بھی رکھیں۔ اس میل جول سے جو نسل پیدا ہوئی وہ لبے کہلائی۔ ممکن ہے کہ بعض ٹمل خاندان براہ راست مسلمان ہو کر انہیں میں مل گئے ہوں۔ لبے زیادہ تر سنی مذہب کے پیرو ہیں۔ اپنے آبا و اجداد کے مسلک پر لبے صرف تجارت کرتے ہیں۔ شاذونادر ہی کوئی سرکاری ملازمت کرتا ہے۔ یہ لوگ شادیاں بھی آپس ہی میں کرتے ہیں۔ اور ہر خاندان کے ساتھ ایک نام لگا ہوا ہے۔ یہ نام یا تو ان کے وطن کو یا ماں کے سلسلۂ نسل و نسب کو ظاہر کرتا ہے۔

لبے ضلع مدورا کے بندرگاہ کایل پٹن سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ عرب زیادہ تر اسی بندرگاہ میں تجارت کے لئے آئے تھے۔ یہاں سے ان کی نسل پھیلتے پھیلتے مندرجہ ذیل اضلاع میں پھیل گئی۔

مدورا، ترچناپلی، تنجاور، تناولی، شمالی و جنوبی ارکاٹ، سیلم اور علاقۂ میسور کے جنوب مشرقی حصہ میں گرگیسوری، نرسی پور وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

(ii) مرکیار

مدراس سنسر رپورٹ ۱۹۱۱ء میں لکھا ہے:-

"مسلمانوں کا ایک قبیلہ ہے۔ جس میں عربوں اور ہندوؤں کے خون کی آمیزش ہے یہ اکثر تاجر پیشہ اور لباین سے بالکل علیحدہ ہیں"

مورخ جے ڈبلیو فرانسز لکھتا ہے:-

"مرکیار بڑے تاجر ہیں۔ جزیرہ سیلون اور سٹریٹ سٹلمنٹس یعنے ملایا وغیرہ سے انکی تجارت ہے۔ اکثر دیسی جہاز ان کے قبضہ میں ہیں۔ ان کی زیادہ تر تعداد پورٹو نوو یعنے محمود بندر میں ہے۔ مرکیار لفظ "مرکب" سے نکلا ہے۔ جس کی معنی کشتی کے ہیں۔ روایت ہے کہ جب عرب اپنے ملک میں ظلم وستم کی زیادتی نہ سہہ سکے تو ہندوستان کے ساحل پر آئے تو ان سے مقامی باشندوں نے ان کے متعلق دریافت کیا۔ تو انہوں نے اپنی کشتیاں دکھلائیں۔ جنہیں وہ مرکب کہتے تھے۔ اسی طرح ہندوؤں نے ان کا نام مرکیار رکھدیا۔ مرکیار اپنے آپ کو لباین سے برتر مانتے ہیں۔ اس لئے لبایین میں شادی نہیں کرتے"

(iii) نینار

کیاسٹس اینڈ ٹرائبس آف سدرن انڈیا میں لکھا ہے:-

"ہندو قوم میں جو نینار ہیں۔ وہ ویلاذات کے ہندوؤں کا ایک فرقہ مانا گیا ہے"

نینار کی معنی بھی وہی ہیں جو نایک کے ہیں۔ یعنے "آقا، سردار" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈیریڈین کا یہ طبقہ کبھی اس ملک میں حکمران یا کم از کم اعلیٰ فوجی ملازمت میں تھا۔ ورا کی تاریخ میں بہت سے ایسے نام پائے جاتے ہیں۔ ہندوؤں کی اس قوم سے جو لوگ مسلمان ہوئے

انہوں نے اپنے نام کے ساتھ اس ملکی و فوجی اعزاز کو باقی رکھا۔

بعض مصنفوں نے نینار کو لفظ ناویار سے تبلایا ہے۔ جس کی معنی ملاح کے ہیں۔ اور وہی روایت پیش کرتے ہیں جو مرکیاروں کے متعلق مشہور ہے۔ یعنے عرب ناؤ کے ذریعہ ہندوستان آئے۔ اور ناویار کہلائے گئے۔ یہ روایت بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ جنوبی ہند کی ہندو قوموں میں نینار پہلے سے موجود تھے۔ اور ان میں جو مسلمان ہوئے انہوں نے اپنے قدیم لقب کو اپنے نام کے ساتھ باقی رکھا۔

(۱۷) راوتھر

یہ بھی نینار کی طرح جنوبی ہند کی تمل قوم کا ایک قبیلہ ہے۔ انہوں نے جب اسلام قبول کرلیا تو اپنے نام کے ساتھ اپنے قدیم لقب کو باقی رکھا۔

راوتھر کی معنی گھوڑا سوار کے ہیں۔

مدورا کے ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں لکھا ہے :۔

"اگلے دنوں میں ملک کے راجاؤں کے پاس جو سوار فوج تھی وہ راؤتھر کہلاتی تھی۔ اس لئے راوتھر ایک جنگی قوم ہے"

کیاسٹس انڈٹرائبس کا مصنف لکھتا ہے :۔

"قدیم زمانہ میں شاہی فوج میں سواروں کو راوتھر کہا جاتا تھا"

(۷) موپلے

یہ بھی عربوں اور ہندوؤں کی ایک مخلوط نسل ہے۔ جو مغربی ساحل پر اضلاع ملیبار ٹراونکور، کوچین اور کنارا میں پائی جاتی ہے۔ مسلمان عرب تاجر جو ان ملکوں میں آتے تھے۔ یہاں انہوں نے شادیاں بھی کیں۔ اور کنیزیں بھی رکھیں۔ اس لئے موپلے انہیں عربوں کی اولاد

سے ہیں۔ ان کے اوضاع واطوار اوران کے رسم ورواج میں عربی رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے گوان کی زبان ملیالم ہے۔ لیکن عربی الفاظ بہت زیادہ مستعمل ہیں۔

ماپلا نام کے متعلق مورخ نوئیس مور لکھتا ہے :۔

"موپلا کی معنے نوشاہ یا داماد کے ہیں۔ یہ نام اس لئے دیا گیا کہ عرب تاجر جب ملک میں آئے تو نہایت معزز مانے جاتے تھے۔ انہوں نے جب یہاں شادیاں کیں تو ملکیوں کے داماد بن گئے۔ اور موپلا کے نام سے پکارے جانے لگے۔ اوراسی طرح یہ نام آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے پڑ گیا۔"

اب بھی اس ملک میں نوشاہ کو موپلا ہی کہا جاتا ہے

نلس اپنی تاریخ مدورا میں لکھتا ہے :۔

"مدورا کی کلن قوم نے ہی پہلے پہل مسلمانوں کو یہ نام دیا۔ اس لئے کہ عرب تاجروں نے اس قوم کی عورتوں سے شادی کی تھی۔"

اس کے برخلاف یول اوربرنل "انڈین انٹی کوئٹیز" (Indian Antiquities) میں لکھتے ہیں :۔

"ماپلا کے معنی داماد کے ہیں۔ ضلع تنجاور میں یہ نام ابھی تک باقی ہے۔ یعنے راجہ کی بیٹی سے جس کی شادی ہوتی ہے۔ اس کا نام موپلے صاحب دکھایا جاتا ہے۔"

پدمانابھ منن کی تاریخ ملیبار میں لکھا ہے :۔

"لفظ موپلا دراصل مہاپلا کا بگڑا ہوا لفظ ہے۔ مہا کی معنی بڑے اور معزز کے ہیں۔ عرب تاجر معزز ہونے کی حیثیت سے مہا کہلاتے تھے۔ ان کی اولاد مہاپلے کہلائی۔ پلے کی معنے بیٹے کے ہیں۔"

لوگن اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :۔

" ممکن ہے کہ لفظ "ما" محمدؐ سے ہو۔ محمدؐ سے مراد عام مسلمانوں سے ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی اولاد اس ملک میں موپلا کہلائی۔ ملیالم زبان میں پلا کی معنے بیٹا۔ بچہ اور اولاد کے ہیں "

مورخ ڈے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :۔

" ما کی معنے ماں کے ہیں۔ اور پلا بچے کو کہتے ہیں۔ عربوں نے دیسی عورتوں سے شادیاں کیں۔ اس لئے بچے بجائے باپ کے منسوب ہونے کے ماں سے منسوب ہوئے "

ولسن بھی اپنی تاریخ میں مورخ ڈے کی روایت ہی لکھا ہے۔

لیکن ڈنکن لکھتا ہے کہ کسی شخص نے ایک قاضی کو دق کرنے کیلئے ماں کا بچہ کہا اور اس وقت سے یہ نام یہاں کے مسلمانوں کا پڑ گیا۔

کتاب "ایشیاٹک ریسرچ (Asiatic Research) میں لکھا ہے :۔

" لفظ ما۔ مہا۔ مہے۔ لفظ موخا کے بگڑے ہوئے تلفظ ہیں۔ پلا کی معنے بچے کے ہیں چونکہ اگلے مسلمان موخا (ملک عرب) سے ہجرت کرکے یہاں آتے تھے۔ انہیں موپلا کہا گیا "

براون لکھتا ہے :۔

" موپلا لفظ معبر کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ معبر کے معنی "پانی پر" ہیں۔ اس لئے کہ عرب سمندر کے ذریعے آتے تھے۔ اس لئے انہیں موپلا کہا گیا "

مورخ پرسی بیا جز لکھتا ہے :۔

" موپلا کے متعلق اب تک جس قدر روایتیں مروج ہیں سب سے نزدیک ترین قیاس

نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لفظ موپلا مفلح کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ مفلح لفظ فلاح سے بنا ہے۔ جس کی معنی کاشتکاری یا زراعت کے ہیں۔ عرب جب اس ملک میں آئے تو انہوں نے زراعت اختیار کر لی۔ اور ان کا نام بلحاظ پیشہ مفلح تھا۔ جو بگڑتے بگڑتے موپلا بن گیا۔"

ان مذکورۂ بالا اقتباسات و مورخین کی آراء سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لبے، مرکیار اور موپلے ان عربوں کی اولاد سے ہیں جنہوں نے اس ملک میں یہاں کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ اور ممکن ہے کہ ان علاقوں کے باشندے بھی جو براہ راست اسلام لائے۔ وہ بھی اسی نام سے پکارے جانے لگے۔ جس طرح ان علاقوں میں جہاں دکنی مسلمان آباد ہیں۔ کوئی شخص اسلام لاتا ہے تو دکنی مسلمانوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کے برخلاف نیتار اور راؤتھر مسلمان خالص ہندوستانی نسل سے ہیں۔

ان سب کے علاوہ جنوبی ہند میں دھنیئے بھی ہیں۔ جنہیں نداف کہا جاتا ہے۔ اضلاع بلاری کڑپہ و کرنول میں انہیں پنجارے کہا جاتا ہے۔ گو اور جگہ ان کی زبان دکنی یا ہندوستانی ہے لیکن ان اضلاع میں انکی زبان تلگو ہے۔ اور یہ اپنی ہی برادری میں شادیاں کرتے ہیں۔ یہ نہایت تعجب سے دیکھا گیا کہ انہیں مساجد میں آنے نہیں دیا جاتا۔ جس کی وجہ سے یہاں کے ہندوؤں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے۔ کہ مسلمانوں میں بھی اچھوت ہیں۔

ضلع اننت پور و بلاری وغیرہ میں چند مسلمان قبیلے ایسے ہیں۔ جنہیں منڈو تلکر کہا جاتا ہے۔ (تلکر بمعنی ترک) یہ سنگ تراشی کا کام کرتے ہیں۔ ان کا قبیلہ گاؤں سے دور بالکل علیحدہ رہتا ہے۔ دوسرے مسلمانوں میں یہ شادیاں نہیں کرتے۔ اسی طرح ردولا (اننت پور) کے قریب مسلمانوں کا ایک قبیلہ ہے۔ جس کے افراد کو "لباڑی قوم" (جنوبی ہند کی مشہور

خانہ بدوش قوم جو کوڑیوں کے زیورات اور ہڈی اور پیتل کی چوڑیاں پہنتی اور ہر جگہ ٹکریاں صحیریں یا چونا بیچتی نظر آتی ہیں) اپنا پیشوا مانتی ہے۔

اہل نوائط

اہل نوائط جس قدر جنوبی ہند میں پائے جاتے ہیں شاید اس قدر شمالی ہند میں نہیں ہیں۔ ان کی کثیر تعداد ساحل کوکن اور مدراس کے قریب ضلع جنوبی ارکاٹ اور ویلور میں پائی جاتی ہے۔

نوایط کے متعلق مشہور مورخ طبری کا بیان ہے :۔

"نوایط قوم قریش سے ہیں"

لیکن تاریخ یمن کا مصنف بتاتا ہے :۔

"نوایط ملاحوں کا ایک قبیلہ ہے"

جامع اللباب کا مصنف لکھتا ہے :۔

"نوایط شہر کوفہ کے عمائدین سے تھے"

غرضکہ ان کی اصل کے متعلق روایات بہت مختلف ہیں۔ جو کچھ کتب تاریخ میں ملتی ہیں۔ ان کا لب لباب یہ ہے :۔

(۱) نوائط (بنو = اولاد۔ نائطہ = فرزند نضر بن کنانہ قریش) چونکہ نائطہ کی اولاد میں ہیں۔ اس لئے قوم قریش سے ہیں۔ (طبری)

(۲) نوائط۔ (بنو) وائط۔ ایک مقام کا نام جو بغداد سے ۹۰ میل کے فاصلہ پر ہے: یہ لوگ وائط میں رہتے تھے۔ بنو وائط کہلانے لگے۔ یعنے وائط کے باشندے۔ رفتہ رفتہ کثرت استعمال

سے یہ لفظ نوائط بن گیا۔

(۳) نوائط (بنو = اولاد۔ وائط = ملاح) چونکہ یہ لوگ اچھے تیراک اور کشتی بانی میں مشاق تھے۔ اس لیئے بنو وائط کہلانے لگے۔ جو آگے چلکر نوائط ہو گیا۔ (تاریخ یمن)

(۴) نوائط (بنو = اولاد ۔ نائط = متحد یا متفق) یہ لوگ شروع سے ہی ایک ہی لیڈر کے ماتحت ہوتے تھے۔ اس لیئے نوائط کہلانے لگے۔

(۵) نوائط = عائدین کوفہ سے ہیں۔ (جامع اللباب)

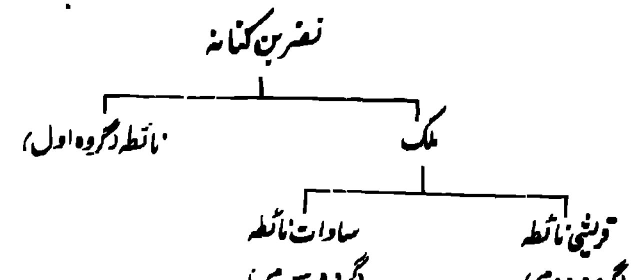
اب ان روایات کے بعد خود اہل نوائط کی روایات کو دیکھا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ قوم قریش سے ہیں۔ اس کا سبب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ قریش مکہ معظمہ کی ایک معزز اور سردار قوم تھی۔ اور جناب رسول اللہ صلعم بھی اسی کے ایک فرد بزرگ ہیں۔ بہرحال نوائط کے تین گروہ ہیں

(۱) جو اپنے کو نائطہ بن نضر بن کنانہ کی اولاد بتاتا ہے۔

(۲) جو مالک بن نضر بن کنانہ کی اولاد کے نام سے مشہور ہے۔

(۳) جو اپنے آپ کو حضرت امام زین العابدین کی اولاد ظاہر کر کے اپنے نسب نامہ کو مالک بن کنانہ پر ختم کرتا ہے۔

ان تینوں روایتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ نوائط نضر بن کنانہ کی اولاد سے ہیں۔ ذیل کا شجرہ اس کو اچھی طرح واضح کرتا ہے:۔



نضر بن کنانہ چونکہ قریش تھا۔ اس لئے تینوں گروہ قریش ہیں۔ پہلے اور دوسرے گروہ کو چھوڑ کر تیسرا گروہ اہلِ بیت رسول اللہ سے سلسلۂ نسب رکھتا ہے۔ اس لئے سادات نائطہ کے نام سے مشہور ہوگیا ہے۔ اور ان کا شجرہ حسب ذیل ہے:۔

حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم

فاطمۃ الزہرا رضہ | (حضرت علی رضہ)

- امام حسین رضہ
  - امام زین العابدین
  - امام باقر
  - امام جعفر صادق
  - سید محمد
  - سید عبداللہ (مقیم وائط)
  - سید عبدالرحمٰن (وائطی)
- امام حسن رضہ

(بی بی) شہر بانو ← شہر یار ← خسرو پرویز ← نوشیرواں

نوائط کی اس روایت کو تسلیم کرنے میں بعض مورخین کو بجا طور پر شک ہے۔ وہ روایت یہ ہے:۔

"مالک بن نضر بن کنانہ کی اولاد جس میں پہلا اور دوسرا گروہ شامل ہے۔ نائطہ کہلاتی ہے۔ تیسرا گروہ سید کہلاتا ہے۔ یہ شبہ اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ صرف نائطہ کی اولاد ہی نائطہ کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے۔ مالک کی اولاد نائطہ نہیں کہلا سکتی۔"

ایک مورخ لکھتا ہے:۔

"نوائط کا پہلا گروہ بنو نضر کہلاتا ہے۔ دوسرا گروہ جو مالک سے نسبت رکھتا ہے وہ شیخ ہے۔ اور تیسرا گروہ حضرت امام زین العابدین کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے سید ہے۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں۔ جنوبی ہند میں جو لوگ نوائط کہلاتے ہیں۔ وہ شیخ تو ہیں مگر بنو نضر نہیں کہلاتے۔ بلکہ اپنے آپ کو صرف نوائط کہتے ہیں۔ اس مجموعی لقب کے علاوہ ان کے چند فروعی لقب بھی ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ الگ الگ اپنے اپنے خاندانی ناموں سے بھی اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں"

مورخین کے ایک اور گروہ کا خیال ہے:۔

"نوائط کا پہلا مسکن مدینہ ہے۔ اور چونکہ یہ اہل بیت کی اولاد ہیں۔ اس لئے عوام میں ان کی عزت وحرمت بڑھ گئی۔ اس کے علاوہ عادات وخصائل اور علم وفضل کے لحاظ سے بھی مرتبہ سیادت کو بڑا دخل ہے۔ کسی زمانہ میں زمین کی کاشت اور سائنس کی ترقی میں یہ لوگ سب سے پیش پیش تھے۔ اس لئے حجاز میں بھی یہ ذی عزت تھے"

ہم اس کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ کہ نوائط کا پہلا مسکن مدینہ ہے۔ کیونکہ قریش مکہ میں رہتے تھے۔ ہاں اسلام لانے کے بعد بہت سے قریش مدینہ میں آگئے تھے۔ اور حضرت امام زین العابدین کی اولاد نے اسی جگہ سے ترقی کی۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ سادات نائطہ کا پہلا مسکن مدینہ ہو۔ لیکن قریشی نوائط کا پہلا مسکن مدینہ نہیں ہو سکتا۔ ان مذکورہ بالا تینوں روایات کو لیتے ہوئے یہ بھی کہا جاتا ہے:۔

"یہ تینوں گروہ مدینے میں رہتے تھے۔ حجاج بن یوسف کا ظلم جب حد سے بڑھ گیا تو مجبوراً نقل مکان کر کے مقام واسط میں آکر آباد ہو گئے۔ جو بغداد سے نو میل

کے فاصلہ پر ہے۔ پھر وہاں سے ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ اس روایت کی تاریخ جو حوالہ دیا جاتا ہے وہ پہلے دو گروہوں کے متعلق ہے۔ سنہ ۶ھ ہجری اور تیسرے گروہ کے متعلق سنہ ۱۵۲ھ ہے"

مورخ ابو جعفر طبری، نواب عزیز یار جنگ، نواب شاہنواز صمصام الملک ان تاریخوں پر متفق ہیں۔ تزک والا جاہی کے مصنف نے بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن ان تاریخوں پر ایک گہری نظر ڈالی جائے۔ تو پہلی تاریخ یعنی سنہ ۶ھ وہ سنہ ہے جبکہ حجاج بن یوسف کا پتہ بھی نہ تھا۔

حضرت امام حسینؑ کی شہادت سنہ ۶۱ھ ہجری میں ہوئی ہے۔ اور کسی تاریخ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اس سے پہلے اہلِ مدینہ یا مکہ پر کسی مسلم گورنر کی جانب سے ظلم ہوا ہو۔ حجاج، عبدالملک بن مروان کا گورنر تھا۔ اور یہ خلیفہ یزید کے بعد تیسرا خلیفہ ہے۔ اس کا زمانہ بہت بعد کا ہے۔ اور یہی حالت دوسرے سنہ یعنی سنہ ۱۵۲ھ کی ہے۔ یہ زمانہ "خلافت عباسیہ" کا ہے۔ اس وقت دوسرا خلیفۂ عباسی منصور داد حکومت دے رہا تھا۔ اس لئے حجاج کے ظلم و ستم کی روایات خصوصاً اس معاملہ میں صحیح نہیں ٹھہرتیں۔ چونکہ حجاج اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے بدنام ہے۔ اس لئے نوائط کی ہجرت کو اس کے ظلم سے منسوب کر دینا اگرچہ سہل ہے۔ مگر تواریخ سے ثابت کرنا دشوار ہے۔

اب اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سنہ غلط لکھ دئے گئے ہیں۔ تو خود روایات کہہ رہی ہیں کہ ان سنین میں یہ لوگ مدینہ سے نکلکر وائط آئے تھے۔ تو جغرافیہ اور تواریخ اس بات کی گواہی دے رہے ہیں۔ کہ یہ مقام بغداد سے نو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حجاج حجاز کا گورنر بھی تھا اور وائط کا بھی۔ لہٰذا یہاں بھی اس کے ستم سے پناہ نہیں مل سکتی تھی۔ دوسرے سنہ کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ منصور عباسی نے جہاں علویوں اور بنو فاطمہ

پر ظلم وستم کئے۔ وہاں نوایط پر بھی کئے۔ لیکن یہ کس قدر مضحکہ انگیز ہے کہ ظلم وستم سے تنگ آ کر مظلوم لوگ اس کے پائے تخت کے پاس جاکر پناہ لیتے ہیں۔ اسی طرح کی مضحکہ خیز وہ روایت بھی ہے۔ جس میں حجاج کے ظلم کی داستان بیان کرتے ہوئے بعض مورخوں نے لکھا ہے:۔

" یہ لوگ واسط میں ایک ہی سردار سید عبداللہ کے ماتحت رہتے تھے۔ اور جب وہاں بھی ان پر ظلم ہوا تو بصرہ میں جا رہے۔ اور یہاں ان کے دوسرے سردار عبدالرحمن کا انتقال ہوگیا۔ جو سید عبداللہ کا جانشین تھا۔ تب ان لوگوں نے ہندوستان کی کی طرف ہجرت کی۔"

آخر بصرہ بھی تو بغداد کے ماتحت تھا۔ وہاں پناہ گزین ہونا کیسا؟ اور پھر محض عبدالرحمن کی وفات ہندوستان کی طرف ہجرت کی وجہ کیونکر ہو سکتی ہے؟

ان روایتوں کے بعد بعض مورخوں کی یہ روایت ہے کہ ۷۵۲ھ میں ہندوستان آئے یہ وہ سن ہے جبکہ بغداد میں خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ چاروں طرف طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ ادھر ہندوستان میں خاندان تغلق کا دَورِ حکومت تھا۔ جس کے متعلق ابن بطوطہ لکھتا ہے:۔

" اس زمانے میں عربی ممالک سے لوگ جوق درجوق آکر بادشاہ وقت کی فیاضی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔"

ہمارے خیال میں یہ ممکن ہے کہ اس زمانے میں بہت سے عرب یہاں آئے ہوں۔ اور انہیں میں چند نوایط بھی ہوں۔

اب اگر ان تمام مذکورہ روایات پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ کہ نوائط کی اصلیت کیا ہے۔ شہر واسط سے اگر منسوب کیا جائے۔ تو قریش اور اولاد نائط ہونے کی

دلیل کمزور ہو جاتی ہے۔

دوسری روایت جس کا تعلق لغوی معنے (متحد و متفق رہنے والے) سے ہے وہ تو بالکل ہی کمزور ہے۔ کیونکہ پہلے تو یہی ثابت نہیں ہوتا کہ تمام قوم نوائط ایک ہی سردار کے ماتحت رہی ہے۔ خصوصاً جبکہ ان لوگوں کا مختلف اوقات میں عرب سے نکلنا ثابت ہے۔ اس کے علاوہ پہلے دوسرے اور تیسرے کے درمیان خون کے اختلاف کی بھی ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ تیسرا گروہ یعنے سادات نائطہ میں حضرت شہر بانو کی اولاد ہونے سے عجمی خون بھی شامل ہو گیا ہے۔ نیز اس روایت کو ثابت کرنے کے لئے جو دلیل دی گئی۔ وہ عقلاً بھی بے جا کمزور ہے۔ یہ فرض بھی کر لیا جائے۔ کہ یہ ایک سردار کے ماتحت رہتے تھے۔ محض اس وجہ سے ہمیشہ کے لئے یہ نام ان کو دیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور اس کی دوسری مثال دنیا میں شاید کہیں نہیں ملیگی۔

تیسری روایت عمائدین کوفہ ہونے کی ہے۔ اس سے صرف اتنا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عجب نہیں کہ چند نوائط شہر کوفہ میں آئے ہوں۔ جو وائط سے قریب ہے۔

چوتھی روایت ان کی ملاحی اور تیراکی کے پیشہ سے متعلق ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا جبکہ وہ اپنے آپ کو قبیلۂ قریش اور حجاز سے بتاتے ہیں۔ تو مکہ اور مدینہ میں سمندر نہیں ہے۔

غرض جس طرح اہل نوائط کی اصلیت اور وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ اسی طرح ان کے ہندوستان میں آنے کے اوقات میں بھی شدید اختلاف ہے۔ لیکن اس قدر تو یقینی ہے۔ کہ ان کی زیادہ تر تعداد ساحل کوکن (مرہٹواڑی) پر اس وقت آکر اتری جبکہ یہاں ہندو حکومتیں قایم تھیں۔ اس کے بعد بھی جب دکن میں اسلامی سلطنتیں قایم ہوئیں۔ تو ان آنیوالوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ جیسا کہ کتاب کے شروع میں لکھا گیا ہے۔ کہ تجارت کے سلسلے میں عرب کا

عراق اور ایران کے تاجر اسلام سے پہلے اور اسلام لانے کے بعد آتے رہے۔ اسی طرح اہل نوائط بھی تجارت کے سلسلہ میں ساحل عراق و یمن سے آکر ساحل کوکن پر اترتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کرنل ولکس اپنی تاریخ میں لپے، ماپلے اور نوائط میں کوئی امتیاز قائم نہیں کیا ہے جس طرح اہل عرب نے ملیبار اور سراندیپ میں یہاں کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ اسی طرح ان اہل نوائط نے بھی کوکن کی عورتوں سے شادیاں کیں اور ان سے جو اولاد ہوئی۔ وہ ملکی قانون (مارومکتایم) کی رو سے ماں کے خاندان سے منسوب ہوگئی جیسے۔ جیدے، چکرا، گھٹالے، مونجے، بپاٹے۔ پٹھانے وغیرہ۔ ان لفظوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ہندی الاصل ہیں۔ کیونکہ ٹ، چ، ڑ وغیرہ خالص ہندی حروف ہیں۔ یہ حروف فارسی اور عربی زبان میں نہیں ہیں۔ لیکن جو اہل نوائط ملک میں اسلامی سلطنتوں (جیسے دکن کی بہمنی سلطنت وغیرہ) قائم ہونے کے بعد آئے۔ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ آئے۔ اور اسلامی سلطنتوں میں ملازمت اختیار کرلی۔ یہ لوگ یا تو اپنے قدیم قبائلی نام سے مشہور ہوئے یا دکن کی جن شہروں میں آباد ہوئے اسی شہر سے منسوب ہوئے۔ جیسے مہکر سے مہکری (مہکر۔ دکن کا ایک شہر) اور انہوں نے حیرتناک طور پر اپنی عصبیت کو محفوظ رکھا۔ ان نو وارد اہل نوائط نے دکن کی ان سلطنتوں میں بڑے بڑے عہدے حاصل کئے۔ اور ملکی سیاسیات میں اس قدر دخیل ہوگئے کہ دکن کی تاریخ ان کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔

یہاں سے یہ لوگ جنوب میں بیجاپوری اور بعد میں عالمگیر کی فوجوں کے ساتھ آئے دکن کی بہمنی اور بعد میں دوسری پانچ اسلامی سلطنتوں میں انہوں نے کارہائے نمایاں کئے شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے جب جنوبی ہند فتح کیا اور ارکاٹ کی صوبہ داری قائم ہوئی تو یہاں کی حکومت اہل نوائط کے ہاتھوں میں دی گئی تھی۔ اور ارکاٹ کا پہلا نائطہ نواب

محمد سعید عرف محمد سعادت اللہ خان تھا۔

ہندوستان آنے کے بعد جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ نوائط بھی ترقی کرتے گئے۔ اور ان میں بہت سے خاندانوں کے نام بدل گئے۔ اور وہ خالص نائطہ یا نائطہ کی اولاد کے ناموں سے منسوب ہونے کے بجائے مختلف ہندی ناموں سے منسوب ہوگئے۔ مثلاً نوائط کا ایک خاندان طاہر کہلاتا ہے۔ جس کے متعلق تزک والا جاہی کا مصنف لکھتا ہے :-

"یہ لوگ پہلے پھٹانے کہلاتے تھے (یعنے بھنے ہوئے چنے)"

لیکن شاہ محمد طاہر دکنی کے عقیدتمند ہونے کی وجہ سے شاہ موصوف نے انہیں طاہر کا نام دیدیا تھا۔ اسی کتاب میں ایک دکنی بیت اور آصف جاہ نظام الملک کا مقولہ بھی بطور سند درج ہے۔ شعر کا مضمون یہ ہے :-

"شاہ طاہر کی وجہ سے وہ طاہر ہوئے۔ ورنہ اصل میں وہ دمڑی کے پھٹانے ہی ہیں"۔

"کرناٹک کی بے دتوفی اسی سے ظاہر ہے کہ جو چیز دکن میں ناپاک تھی۔ وہ کرناٹک میں طاہر (پاک) ہوگئی ہے"۔ (تزک والا جاہی)

یہ طعن اس لئے کی گئی کہ اس زمانہ میں اہل نوائط اور والا جاہی یعنے خاندان انوری میں ان بن تھی۔ اور ارکاٹ کی صوبہ داری کے لیئے ہر دو فریق لڑ رہے تھے۔ پھٹانے کا لفظ استعمال کرکے تمام اہل نوائط پر بلا تخصیص چوٹ کی گئی ہے۔ کہ وہ مخلوط النسل ہیں۔

مذکورہ بالا تمام روایات اور مباحث پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو میری دانست میں نتیجہ یہی نکلتا ہے :-

(۱) اہل نوائط حجازی یا قریشی نہیں۔ ان کو ملک حجاز سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ عراق اور

ساحل یمن کے باشندے ہیں۔

(۲) بے شک ان کا تعلق دائط سے ہوسکتا ہے جو ملک عراق میں ہے۔

(۳) ان میں جو سادات یا قریشی کہلاتے ہیں وہ صرف اس لئے ہے کہ یمن و عراق میں جب اسلام پھیلا تو یہاں کے باشندوں اور حجازی عربوں میں آپس میں شادیاں ہوئیں اور اولاد کو ماں یا باپ میں جن کا لقب زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا۔ ملقب کیا گیا۔

(۴) اب رہے ایسے نام جیسے چمکر، گھٹالے، گڑبے، جیدے، پھالے، پھٹانے وغیرہ یہ خالص مرہٹی الاصل ہیں۔ عراق و یمن کے تجارتی تعلقات ساحل کوکن سے نامعلوم زمانے سے تھے وہی عراقی و یمنی اسلام لانے کے بعد بھی کوکن سے تجارت کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں یہاں بہت سے قبائل آکر آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے جب یہاں کی عورتوں سے شادیاں کیں تو اولاد ماں کے نام سے منسوب ہو گئی۔ جس طرح جنوب میں رواج ہے۔ اور دوسرا ملکی قانون (مارماکٹایم) کی رو سے بھی وہ ماں سے ہی منسوب ہو سکتے تھے۔ اس لئے وہ تمام نوائط جن کے نام مرہٹی خاندانوں کے نام پر ہیں یا جن کے ناموں میں ہندی حروف پائے جاتے ہیں۔ عراقی یا یمنی اور مرہٹوں کی مخلوط نسل سے ہیں۔ آج بھی خالص مرہٹی خاندانوں میں یہی نام مروج ہیں۔

اب رہا نام نائطہ۔ اس میں شک نہیں رہا کہ اس کی معنی صرف مُلّاح کے ہیں۔ اور یہ نام اس لئے پڑ گیا کہ یہ تجارت بحر کے ذریعہ تھی۔ اور چونکہ یہ لوگ کشتیوں میں آتے تھے۔ اس لئے نوائط یعنے ملاح کہلائے گئے۔

جنوبی ہند کا محرم

محرم میں ہندو رسم و رواج اور خرافات کا دخل

جنوبی ہند میں محرم جس صورت میں منایا جاتا ہے۔ اس کا آغاز اس زمانہ میں ہوا۔ جبکہ دکن کی اسلامی سلطنتوں پر مغلوں نے حملے کرنا شروع کیا تھا۔ اس تاریخ میں کسی دوسری جگہ لکھا جا چکا ہے کہ تالیکوٹہ کی جنگ کے بعد ہی احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ پر مغلوں نے حملے شروع کر دیئے تھے۔ جن کی وجہ سے یہ سلطنتیں جنوبی ہند پر پوری توجہ نہ دے سکیں۔ مغلوں سے بچاؤ کے لئے ان سلطنتوں نے مناسب سمجھا کہ مرہٹوں اور ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ دکن کی ان اسلامی سلطنتوں میں مرہٹواڑی کے قرب و جوار میں رہنے کی وجہ سے مرہٹی اثر بہت زیادہ اثر کر چکا تھا۔ اور یہاں کے مسلمان بہت سے مرہٹی رسوم اختیار کر بیٹھے تھے۔ ز اور اس کی ایک اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے حرموں میں ہندو عورتوں کو داخل کر لیا تھا۔ اور ان عورتوں نے شادی بیاہ میں اپنے اگلے رسم و رواج باقی رکھے۔ اور مسلمانوں نے بھی انہیں بے ضرر سمجھ کر خاموش ہو گئے۔ یہی رسم و رواج ان کی اولادیں بھی منتقل ہونے آئے۔ اور آج معاشرت کا جزو اعظم بن گئے ہیں ؛

فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :-

"جب علی عادل شاہ کے لڑکوں کی ختنہ ہوئی تو دکن کے رسم و رواج کے مطابق

لڑکوں کو سرخ لباس پہنایا گیا۔ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔ شب گشت نکالا گیا اور راستہ میں دو طرفہ آتش بازی ہو رہی تھی"۔

فرشتہ کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جب شمال سے دکن میں آئے تو اپنے قدیم اور سیدھے سادے رسم و رواج کو لیکر آئے تھے۔ دکن کی رہائش اور مرہٹوں کے میل جول نے ان میں بہت سی رسوم پیدا کر دیں۔ جو آج تک بھی اگر بڑے شہروں میں نہیں تو دیہات میں موجود ہیں۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ مرہٹوں میں یہ رسم موجود ہے۔ کہ نوشاہ جب شادی کے لئے دلہن کے گھر جاتا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں کٹار ہوتی ہے۔ جس کے سرے پر لیموں لگا ہوا ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے بھی اس رسم کو اختیار کر لیا۔ (اب یہ رسم بہت سے بڑے شہروں میں نظر نہیں آتی) ہلدی، مہندی اور تیل کی رسمیں جو نکاح سے پہلے مرہٹوں اور ہندوؤں میں رائج تھیں۔ مسلمانوں میں بھی رائج ہو گئیں۔ اور آج بھی ادا کی جاتی ہیں۔ اسی طرح کنگن کی رسم ہے جو نکاح کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ اور سہاگ کے لئے گلے میں کالی پوت اور چوڑیاں ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

معاشرت کے اس پہلو کو نظر انداز کر کے یہاں صرف محرم سے بحث کی جاتی ہے۔

جنوبی ہند میں محرم جس طرح منایا جاتا ہے اس کی تفصیل یوں ہے :۔

"محرم کا چاند نظر آتے ہی تیاری شروع کر دی جاتی ہے۔ بعض مقامات میں تو پہلی محرم کو ہی اور بعض مقامات پر تیسری اور چوتھی کو علم کے وہ صندوق جس میں سال بھر علم بند رکھے جاتے ہیں نکالے جاتے ہیں۔ شہر میں ان کا گشت ہوتا ہے۔ کہیں گھوڑوں پر پھولوں کی چادریں ڈال کر باجوں کے ساتھ کوئی لڑکا اس صندوق کو لیکر بیٹھتا ہے اور کہیں سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ اس گشت کے بعد انہیں مقام مقررہ پر لا کر

بٹھایا جاتا ہے۔ ساتویں، آٹھویں اور نویں شب کو پھر یہ علم اٹھاتے اور گشت کراتے ہیں۔ ان کے آگے آگے مجاور عود دان اور مور کے پروں کا مورچھل لئے ہوئے چلتے ہیں۔ اور ایسے ہی موقعوں پر یہ علم اٹھانے والے انگاروں کے آلاؤں میں سے بھی گذرتے ہیں۔ جس جگہ علم رکھے جاتے ہیں اسی جگہ کے قریب ایک چھوٹا سا گڑھا بنایا جاتا ہے۔ جو دو ہاتھ سے چار چھ ہاتھ لمبا اور قریباً ایک آدھ قدم عمیق ہوتا ہے۔ اس گڑھے میں لکڑیاں جلا کر آگ بنائی جاتی ہے۔ اس کے بعد جب یہ آگ تیار ہو جاتی ہے تو ان انگاروں پر سے جو بجھنے کے قریب ہوتے ہیں۔ علم اٹھانے والے دوڑ دوڑ کر گذرتے ہیں۔ بعض بعض مقامات پر علم اور تعزئے ساتھ ساتھ بٹھا رکھے جاتے ہیں۔ اور تعزیہ اکثر نویں کی شب میں گشت کے لئے نکلتے ہیں۔ اور لوگ ان پر عبیر، پھول وغیرہ پھینکتے ہیں۔ ان علموں اور تعزیوں سے منتیں مانگی جاتی ہیں۔ چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ اور عموماً جب علموں سے منتیں مانگی جاتی ہیں تو منت پوری ہونے پر دوسرے سال سونے یا چاندی کے چھوٹے چھوٹے علم نذر دئے جاتے ہیں۔

تعزئے اور علموں کے علاوہ جنوبی ہند کے محرم میں جو خاص باتیں ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) محرم میں گروہ بنتے ہیں۔

(۲) شیر، ریچھ، بندر اور دیوانوں وغیرہ کے سوانگ بھرے جاتے ہیں۔

گروہ میں عموماً پندرہ سے بیس آدمیوں یا لڑکوں کی تعداد ہوتی ہے۔ گروہوں کی کئی قسمیں ہیں۔

بھانڈ، نانک سوٹے، سدّی اور زنگی وغیرہ۔

بھانڈ میں صرف تالیاں بجاکر نظمیں پڑھی جاتی اور نقلیں کی جاتی ہیں۔ ہر گروہ اپنا ایک مخصوص رنگ رکھتا ہے۔ جوان کے عامول سے معلوم ہوتا ہے۔ گلے میں کھنٹے ہوتے ہیں۔ علاوہ سرگروہ کے گروہ میں ایک بادشاہ ایک وزیر ضرور ہوتے ہیں۔ جو اپنا مخصوص پارٹ ادا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مسخرا بھی ہوتا ہے۔ راستوں میں بھانڈ صرف تالیاں بجاتے ہوئے محرم کی مناسبت سے کوئی غم افزا نظم پڑھتے ہوئے۔ یا حریف گروہ کو مغلظ گالیاں نظم میں دیتے ہوئے جاتے ہیں۔ ہر شاعر اپنی اپنی گروہ کا نام علیحدہ رکھتا ہے۔ جیسے شاہی نقال، شاہی فسانہ گو، آزاد ظریف، اکبری بھانڈ وغیرہ۔ ان میں اکثر مقابلہ بھی ہوتے ہیں۔ یہ مقابلے اکثر راتوں کو کسی جگہ ہوتے ہیں۔ جس کو چوک کہا جاتا ہے۔ جہاں ہر دو گروہ نقلیں کرکر یا نظمیں سنا کر داد حاصل کرتے ہیں۔

اسی طرح جھنجھنے والے یعنے سدّی، زنگی وغیرہ ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے ہاتھ میں جھنجھنا ہوتا ہے۔ عموماً یہ شلوار اور ترکی ٹوپی پہنتے اور گلے میں کھنٹے ڈالے ہوئے رہتے ہیں۔ اور پیروں میں گھونگرو بھی باندھتے ہیں۔ ان میں بھانڈوں کے مانند مقابلے بھی ہوتے ہیں۔

نانک سوٹے۔ ان کا لباس بھی قریب قریب بھانڈ کے لباس جیسا ہوتا ہے۔ لیکن بعض جماعتیں پورا لباس کسی خاص رنگ میں رنگ لیتی ہیں۔ انکے گلوں میں بھی کھنٹے ہوتے ہیں اور ہاتھ میں سوٹے۔ جنہیں نظمیں پڑھتے وقت بجاتے ہوئے چلتے ہیں۔ نانک سوٹے والے دو گروہ میں منقسم ہیں۔

(۱) مکھنڈ (۲) پاکھنڈ (یہ ایک دوسرے کی ضد سمجھے جاتے ہیں)

پھر شاعر اپنی مکھنڈ یا پاکھنڈ کو علیحدہ نام دیتے ہیں۔ جیسے الف والے، نکتہ والے، ترنم یاتر بھوگی، زنار وغیرہ ان میں بھی مقابلے ہوا کرتے ہیں۔

گروہوں کے بعد شیر ہیں۔ جو محرم کا جزو اعظم ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ شیر کا سوانگ بھرنے والا مختلف رنگوں سے جو شیر کے رنگ میں پائے جاتے ہیں۔ اپنے پورے جسم اور چہرے کو رنگ لیتا ہے یہ رنگنے والے علیحدہ ہوتے ہیں جو اجرت پر رنگ دیتے ہیں۔ نقش و نگار اور پٹے اسی طرح بنائے جاتے ہیں۔ جس طرح اصلی جنگلی شیر پر ہوتے ہیں۔ رنگ آمیزی اور نقش و نگار کے لحاظ سے بعض بعض تو کمال کر دیتے ہیں۔ سر پر اس قسم کی کپڑے کی ٹوپی جس میں کان لگے ہوئے رہتے ہیں۔ اوڑھتے ہیں۔ شیر کو پیچھے کوئی شخص رسّی یا زنجیر سے تھامے ہوئے رہتا ہے۔ اور دم کی جگہ رنگین کاغذوں کا ایک جھنڈا بانس پر لگا رہتا ہے۔ جس کو ایک اور شخص شیر کے پیچھے تھامے ہوئے چلتا ہے۔

شیر کے آگے تھوڑے فاصلہ پر عموماً باجے والے رہتے ہیں۔ جو زور زور سے باجہ بجاتے ہوئے چلتے ہیں۔ ان کے پیچھے لکڑی کا کرتب دکھانے والے پھینک کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ شیر ان کے بعد قدم ڈالتا، کودتا ہوا نکلتا ہے۔ کبھی کبھی شیر جب اپنے شناساؤں کے گھر پر سے نکلتا ہے۔ تو اس کے آگے بکرا چھوڑا جاتا ہے۔ جس کو وہ دانتوں سے اٹھا کر چھوڑ دیتا ہے اور یہ شیر کا حق ہے۔

شیروں کے پیچھے ایک بیل گاڑی ہوتی ہے۔ جس کی شکل فیل نما ہوتی ہے۔ یہ گاڑی شیر کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اور بچے اس پر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور کبھی ایک پنجرہ نما گاڑی ہوتی ہے۔ جس میں بڑے اور چھوٹے پانچ چھ شیر ہوتے ہیں۔ جو باری باری سے اتر کر چلتے ہیں۔

دیکھو، یہ بیچارہ تیل سے لت پت ہو کر روئی یا اون کے پرزے تمام جسم پر تھوپ کر نکلتا ہے۔ اسی طرح بندر بھی بنتے ہیں۔ دیوانے سچ مچ دیوانے دکھائی دیتے ہیں۔ پریشان ہو

کپڑے پھٹے ہوئے۔ کچھ ڑیں لت پت، ہاتھ میں پانی کا ایک مٹکا۔ جس سے لوگوں پر پانی ڈالتے ہوئے بھاگتے رہتے ہیں۔

دوسرے معمولی سوانگ جو ہیں ان میں جلالی قابل الذکر ہے۔ یہ سر سے پیر تک تیل اور سیاہی میں ڈوبا ہوا رہتا ہے۔ کمر پر ایک موٹا سا تھیلا یا اور کوئی چیز رہتی ہے۔ جس سے پیچھے والا بید سے مارتا رہتا ہے۔ اور یہ چیخیں مار مار کر لوگوں سے پیسے طلب کرتا ہے۔

پچپے شاہ۔ اس کے ہاتھ میں ایک تختہ اور ناریل کا چھپہ (ناریل کا پوست) رہتا ہے۔ جس سے وہ تختہ پر بجاتا ہوا اکثر لوگوں کو گالیاں سناتا رہتا ہے۔

ہجڑے مرس وغیرہ بیکر دھان کوٹتے ہوئے نکلتے ہیں۔

غرض کھانے اور کمانے کے لئے اور بھی مختلف سوانگ بھرے جاتے ہیں۔ جیسا دولہ اور دلہن وغیرہ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سوانگوں کی تاریخی حقیقت کیا ہے۔ جب ان سوانگ بھرنے والوں سے پوچھا جاتا ہے تو صرف دو جواب ملتے ہیں۔

(۱) یہ کہ ہمارے بزرگوں نے بھی یہی کیا تھا اور ہم بھی یہی کر رہے ہیں

(۲) دوسرا یہ کہ میدان شہادت میں یزید کی فوجوں نے فتح سے سرشار ہو کر اس قسم کے سوانگ بھرے تھے۔

جہاں تک مورخین نے پتہ لگایا ہے یہ علم عہد عباسیہ کے آخری زمانہ کی یادگار ہے۔ جب بغداد میں عجمی رسوخ بہت زوروں پر تھا۔ اس علم کے متعلق جس سے ہماری مراد پنجہ کا نشان ہے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ عہد عباسیہ میں اس کو شاہی پھریرے کی بانس یا لکڑی پر بنا کر لگایا گیا۔ اور اس سے مراد پنجتن کی لیجاتی تھی۔ جن کے سایہ میں عباسی پھریرا لہرا رہا ہے۔ چونکہ یہ شاہی نشان تھا۔ فوج اس

پھریرے کو سلامی دیتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ پھریرے کی بجائے آج کل تو پنجہ کی بانسوں کو بنارسی زرین اور ریشمی ساڑھیوں سے ملبوس کر دیا جاتا ہے۔ اور جو شاہی نشان اس وقت تعظیم کے لئے تھا پنجتن کے نام سے اس کی پرستش کی جانے لگی۔ اور منتیں مانی جانے لگیں۔

ضلع اننت پور و بلاری میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان علموں کے ذریعہ لوگ اپنا قرض بھی وصول کرتے ہیں۔ جب قرضہ دینے والا دیکھتا ہے کہ قرضہ وصول نہیں ہوتا۔ تو وہ اس جگہ آ کر جہاں علم رکھے جاتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر میرا قرضہ وصول کر کے دو تو میں اتنی رقم نذر چڑھاؤنگا۔ علم جس وقت اٹھائے جاتے ہیں تو علم اٹھانے والے علم لیکر قرضدار کے گھر جاتے ہیں اور اس وقت تک نہیں ٹلتے۔ جب تک قرض وصول نہیں ہو جاتا۔

گروہ ان کا رواج صرف دکن سے ہوا۔ مرہٹوں میں نامعلوم زمانے سے ان کے ہولی کے تہوار میں مختلف نام کے گروہ بنتے تھے۔ اور ان کے شاعر انہیں اپنی قوم کی اگلی تاریخ یاد دلانے کے لئے انہیں نظمیں لکھ کر دیتے تھے۔ جن میں ان لوگوں کو جوش دلایا جاتا تھا کہ اپنے اسلاف کے مانند بہادر بنیں۔

مسلمانوں نے یہ رسم مرہٹوں سے ہی لی۔ اور ان میں بھی گروہ بننے لگے۔ شروع شروع میں یہ گروہ صرف غم حسین اور واقعات کربلا کے متعلق نظمیں پڑھکر سناتے تھے۔ لیکن شاعروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ اور لوگوں سے واہ واہ اور سرپرستی حاصل کرنے کے شوق نے نقلیں اور ہزلیات بھی پیدا کر دیئے۔ اور اس حد تک بڑھ گئے کہ سچ مچ بھانڈ بن گئے۔

اب بھانڈ پر غور کیا جائے تو یہ لفظ بھاٹ کے ہم معنی ہے۔ اور خاص ہندی لفظ ہے اور جو گروہ بنتے ہیں ان کے ناموں پر غور کیا جائے تو بہت سے نام ہندی اور مرہٹی الاصل ہیں۔ جیسے مکھمنڈ۔ ایک ہندی لفظ ہے جس کے معنی ضدی اور ہٹ کرنے والے کے ہیں۔ اور

اس جماعت کو بھی کہتے ہیں جس کے افراد اپنا گذارہ دنگا، فساد یا عورتوں کی ناجائز کمائی پر کرتے ہیں۔

پاکھنڈ۔ ایک سنسکرت لفظ ہے جس کے معنے دغابازوں اور منافقوں کی جماعت ہے۔

نانک سوٹے۔ نام ہی بتا رہا ہے کہ یہ بابا نانک جو سکھ مذہب کے مشہور گرو گذرے ہیں۔ ان سے تعلق رکھتا ہے۔

تربھوگی۔ یہ بھی دکن کے چوروں کی ایک جماعت کا نام ہے۔ جو لوگوں کے گلے کاٹتے اور انہیں لوٹ لیتے تھے۔ جان شکسپیر نے بھوگی کے معنے دغابازی، مکر اور فریب کے دئے ہیں۔ اس جماعت کا نصب العین ہمیشہ خوش رہنا ہے۔ خواہ کسی حیلہ سے ہو۔

سدی، زنگی، عرب، ترکی اور نقال وغیرہ محتاج تشریح نہیں۔

شیر۔ جسم رنگنے اور طرح طرح کے سوانگ بھرنے کی رسم ڈریویڈین قوموں میں نامعلوم زمانہ سے چلی آتی ہے۔ دسہرہ کے تہوار میں نیچ ذات کی قومیں اپنے بزرگوں کی رسم پر شیر، ریچھ، بندر وغیرہ کا سوانگ بھرتے ہیں۔ انکی مذہبی روایات اور کہانیوں کو جو عموماً مسلمان گھروں میں بھی رائج ہیں۔ دیکھا جائے تو ہر کہانی کا موضوع ایک راکشش ہوتا ہے۔ جو لوگوں کو ستاتا، بچوں اور عموماً شہزادیوں کو اٹھا لیجاتا ہے۔ اس پر غالب آنے کیلئے شہزادے یا دوسرے لوگ کوئی نہ کوئی سوانگ بھر کر اس پر حملہ کرتے اور فتح پاتے تھے۔ ڈریویڈین قوم اپنے اسلاف کے کارناموں کو یاد رکھنے کیلئے ہر سال دسہرہ کے تہوار پر اس طرح کا سوانگ بھرتی ہے۔

باقی دوسرے سوانگ جو ہیں وہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ پیدا ہوتے چلے گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ جنوبی ہند کے مسلمانوں نے یہ تمام امور کس طرح اختیار کئے۔ اسی تاریخ میں بتلایا گیا ہے۔ کہ دکن کے مسلمانوں میں مرہٹی طرز معاشرت اور رسوم دن بدن نفوذ

کر رہے تھے۔ مغلوں نے جب دکن پر حملے کئے تو یہاں کی سلطنتیں اپنے آپ کو ملکی کہتی ہوئی مرہٹوں اور ہندوؤں سے بہت زیادہ مل گئیں۔ اور ان کے ہر تہوار میں شریک ہونے لگیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ محرم جو صرف غم حسین کی مجلسوں تک محدود تھا۔ اب اس میں مرہٹوں کی تقلید میں گروہ شامل ہو گئے۔ اور شاعروں نے موشگافی کرتے کرتے ان گروہوں کو اس صورت میں لے آئے جس طرح اس زمانہ میں دکھائی دیتے ہیں۔

یہی مسلمان جب جنوبی ہند میں آئے تو ڈراویڈین قوموں کی رسمیں بھی اختیار کرلیں یا بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ سلطنتِ وقت کو خوش کرنے کیلئے جیسے مرہٹے محرم میں شامل ہونے لگے۔ ویسے ہی جنوب میں ڈراویڈین قومیں بھی شامل ہوگئیں۔ اسی لئے دیکھا جائے گا کہ مسلمانوں سے بڑھکر مرہٹے اور نیچ ذات کے ہندو محرم مناتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دکن کی تینوں اسلامی سلطنتیں احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کے حاکم شیعہ عقاید کے تھے۔ انہوں نے مجالس غم حسین، تعزیئے اور علم کا رواج دیا۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ رواج آئندہ چلکر یہ صورت اختیار کرلیگا۔ جس صورت میں کہ آج مروج ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان سلطنتوں کے رئیسوں نے بوجہ شیعہ ہونے کے علم کو نہایت فراخدلی سے رواج دیا۔ یہاں تک کہ گاؤں کے گاؤں ان علموں لے خرچ کیلئے وقف تھے اور اب بھی دیہات میں جو جاگیریں نظر آتی ہیں۔ وہ تمام کی تمام بیجاپوری حکام کی دی ہوئی ہیں۔

اس طرح کا محرم صرف ان مقامات میں رائج ہے۔ جو کبھی گولکنڈہ، بیجاپور اور احمد نگر کے ماتحت تھے۔ اس لحاظ سے اگر جغرافی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کا محرم مرہٹواڑی سے لیکر جنوب میں ترچناپلی تک مروج ہے۔ جنوب کا وہ علاقہ جو ملیبار کہا جاتا ہے یہاں محرم بالکل نہیں منایا جاتا۔ ان علاقوں میں جہاں محرم رائج ہے۔ اور خصوصاً کرنپہ،

کرنول، بلاری، اننت پور، میسور اور مرہٹواڑی میں جاکر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دیہات میں مسجد تو نہ ملیگی. لیکن کم از کم ایک چبوترہ ضرور ملیگا۔ جس کو عاشور خانہ کہا جاتا ہے اور جاگیریں اس عاشور خانہ کے لئے وقف ہیں۔ ان اضلاع کے ڈسٹرکٹ گزیٹیریں دیکھے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور اور گولکنڈہ والوں نے کس فراخدلی سے یہ جاگیریں دی تھیں اور کس طرح ہندو قوم محرم مناتی ہے۔

اننت پور ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا مصنف (ڈبلیو فرانسس لکھتا ہے :-

"گڑگو (اننت پور میں ایک قصبہ ہے) اپنے محرم کے لئے نہایت مشہور ہے۔ جس طرح اس ضلع کے تمام دوسرے مقامات میں ہندو قوم محرم زیادہ مناتی ہے. یہاں بھی محرم بالکل اسی قوم کے ہاتھ میں ہے. مسلمان اس میں بالکل کم حصہ لیتے ہیں۔ محرم کے ایام میں ہزارہا کی تعداد میں باہر کے مقامات سے ہندو یہاں آتے ہیں. گاؤں کا پٹیل (پٹواری) محرم چاوڑی میں بیٹھ کر آنے والوں سے ٹن کے بند صندوقچوں میں نذرانہ وصول کرتا ہے۔ یہ تمام نذرانے نہایت امانت داری سے ایک جگہ جمع کئے جاتے ہیں. اور اسی رقم سے محرم کا خرچ پورا کیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ تعجب خیز وہ نظارہ ہے. جو نویں اور گیارہویں محرم کے دن دیکھا جاتا ہے. اس دن لوگ علم لیکر آگ کے الاؤ میں سے چلتے ہیں. سب سے پہلے حجام باجہ بجاتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے بعد تماشائی بھی اسی آگ میں سے گذرتے ہیں "

اس طرح مشترکہ محرم منانے کا جو اثر مسلمانوں پر پڑا وہ مسلمانوں کی موجودہ طرز معاشرت اور انکے عقائد سے معلوم ہو سکتا ہے۔

انت پور ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا مصنف اپنی کتاب کے صفحہ ۲۹ پر لکھتا ہے :۔

"گو کہ زمانہ قدیم میں مسلمان اور ہندو مذہباً ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ لیکن اب اکثر مسلمانوں نے ہندوؤں کا لباس اختیار کر لیا ہے۔ بہت سے دیہات میں کوئیں دونوں کے لئے مشترک ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں شامل ہوتے ہیں۔ ہندو قوم مسلمان فقیروں اور ان کی درگاہوں کا ادب کرتی ہے۔ نذرانے چڑھاتی ہے اور مسلمان مندروں میں ناریل کا نذرانہ چڑھاتے اور پھوڑتے ہیں۔ دونوں قوموں کا یہ اتحاد محرم کے دنوں میں اور زیادہ ترقی کر جاتا ہے۔ اکثر مقامات پر محرم کا تمام انتظام ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ایک مسلمان ضرور رہتا ہے۔ جو رسوم بجا لاتا ہے۔ دونوں قوموں کے اس اتحاد نے مسلمانوں میں بھی ایسے فرقے پیدا کر دئے ہیں۔ جو مسلمان تو کہلاتے ہیں۔ لیکن عام مسلمانوں میں شادی بیاہ نہیں کرتے۔ رولا کے علاقے میں لمباڑی قوم کے مذہبی راہ نما مسلمان ہیں۔ لیکن یہ دوسرے مسلمانوں کو اپنی بیٹیاں شادی میں نہیں دیتے۔ اور نہ انکی بیٹیوں سے شادی کرتے ہیں۔ اور اسی طرح ڈکستر ا تعلق میں منڈو تلکر مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے جو دوسرے مسلمانوں سے شادی بیاہ نہیں کرتا۔"

(نوٹ :۔ اس تاریخ کے مصنف نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ تقریباً پچیس سال تک ان اضلاع میں گذارا ہے۔ تعجب سے دیکھا گیا کہ نداف یعنے مسلمان جو روئی دھنکتے ہیں۔ انہیں دوسرے مسلمان مسجدوں میں آنے نہیں دیتے۔ اور نہ یہ لوگ سوائے برادری کے دوسرے مسلمانوں سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں۔)

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اکثر دیہات میں محرم کے ایام کو کھینچ کر بیس بیس، چالیس چالیس دن تک اسی طرح تماشہ کیا جاتا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ محرم کے ختم ہونے کے بعد ایک اور محرم

پھر نے بہانے پر بچوں کے لئے دس دن تک منایا جاتا ہے اور کوڑی پیر کا محرم کہا جاتا ہے۔

محرم کو دیکھتے ہوئے صرف یہی دو نتیجے نکلتے ہیں:۔

(۱) ایک یہ کہ مسلمان سلاطین بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ نے اپنے سیاسی فوائد کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ گوارا کر لیا کہ مرہٹے اور ہندو بھی محرم جس چاہیں شامل ہو جائیں۔

(۲) حاکم وقت کی خوشنودی اور انکا تتبع کرنے کے لئے ہندوؤں اور مرہٹوں نے خود بخود محرم اختیار کر لیا۔ اور اپنے رسم و رواج اس میں داخل کر دئے۔ جس کی وجہ سے بعد کی آنے والی نسلوں نے بھی انہیں محرم کا جزو سمجھ کر اختیار کر لیا۔

اب صرف انگاروں پر چلنے کے رسم کی تشریح باقی رہگئی ہے۔ جس کو محرم منانے والے مسلمان علموں کی سچائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ آگ پر چلنے کی رسم بھی ہندوستان کی لی ہوئی ہے۔

ہندوستان میں نامعلوم زمانہ سے انگاروں پر چلنے کی رسم مختلف قوموں میں عموماً اور ڈریویڈین قوموں میں خصوصاً پائی جاتی ہے۔

ٹرائبس انڈ کیاسٹس آف بنگال کا مصنف سر ایچ ایچ رسلی نے لکھا ہے:۔

"صوبہ بہار میں ایک ہندو قبیلہ دوسادھ نامی ہے۔ اس قبیلہ کے دیوتا کا نام راہو ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سانپ بنکر سورج اور چاند کو نگل جاتا ہے۔ بیماریوں کو دور کرنے یا کسی منت کے برآنے پر راہو کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر بھگت جو یہ پوجا کرتے ہیں۔ انگاروں پر سے چلتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دہکتی ہوئی آگ کے درمیان ایک سیڑھی رکھی جاتی ہے۔ بھگت آگ میں سے گذر کر سیڑھی پر چڑھتا ہے۔ جس کے پایدان (Rungs) ان تلواروں کے بنے ہوئے ہوتے

ہیں۔ اس رسم کے ادا ہونے کے بعد لوگ کھانا کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔ آگ پر چلنے کی یہ رسم قمری ماہ کی چوتھی، نویں یا چودھویں کو ادا کی جاتی ہے۔"

جس طرح بنگال میں یہ رسم جاری ہے۔ اسی طرح ضلع بہار میں بھی یہ رسم ادا کی جاتی ہے جنوبی ہند میں آگ پر چلنے کی یہ رسم نامعلوم زمانہ سے چلی آتی ہے۔ اور ڈریوڈین قوم میں آج بھی اس کو منایا جاتا ہے۔

آر۔ین۔بیٹی (   ) نامی ایک مصنف لکھتا ہے :۔

"انگاروں پر چلنے کی رسم میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں۔ وہ جنوبی ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ماری اماں کا جو کالی کی مترادف ہے پوجا کرتے ہیں۔ ان کی یہ پوجا دس تک ہوتی ہے۔ انگاروں پر چلنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو کسی مراد کے برآنے کے لئے عہد کر لیتے ہیں۔ لوگ انگاروں کی اس راکھ کو تبرک سمجھ کر لیجاتے ہیں۔"

میتھک سوسائیٹی جرنل (My thic Society Journal) مورخہ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ایک مضمون نگار لکھتا ہے :۔

"مدراس کے قریب آلندور کے ایک مندر میں دروپدی کی پوجا کی جاتی ہے۔ یہ پوجا دس دن تک کی جاتی ہے۔ اور دسویں دن انگاروں پر چلنے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ ایک لمبا گڑھا کھودا جاتا ہے۔ جس میں لکڑیاں جلا کر انگارے بنا لئے جاتے ہیں۔ ان انگاروں کو گڑھے میں ہر چہار طرف پھیلا دیا جاتا ہے اور ان پر کچھ پانی چھڑکتے ہیں۔ جو لوگ دروپدی سے کچھ منت رکھتے ہیں۔ ان انگاروں پر چلتے ہیں۔ بعد میں لوگ اس راکھ کو تبرک سمجھ کر لے جاتے ہیں۔"

کیاسٹس انڈیا ایس آف سدرن انڈیا میں لکھا ہے :-

"نیلگری کی وحشی قوموں میں بھی سال میں ایک بار دس دن تک انگاروں پر
چلنے کی رسم پائی جاتی ہے"

ان اضلاع کے گزیٹیرس کے انگریز مورخ حیرت سے لکھتے ہیں کہ نہیں معلوم مسلمانوں نے اس رسم کو کس وجہ سے اختیار کیا۔

بہر طور اس تمام تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ محرم جو اگلے دنوں میں صرف مجالس غم تک محدود تھا۔ اس میں مرہٹواڑی اور جنوبی ہند کی تمام رسمیں یکے بعد دیگرے شامل ہو کر اب اس حالت میں رہگیا ہے۔ جس حالت میں آج نظر آتا ہے۔

مذکورۂ بالا تحریر اور روایتوں کو جو اس میں بطور سند دئے گئے ہیں۔ غور سے مطالعہ کیا جائے تو جنوبی ہند کے محرم اور اس کے رسم و رواج اور دس دن تک کے کھیل تماشے اور انگاروں پر چلنے کی رسم کی وجوہات سمجھ میں آجاتی ہیں۔ کہ کس طرح ہند و مسلم کی ملی جلی معاشرت نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔ اور اب یہ فیصلہ مسلمانوں پر چھوڑا جاتا ہے کہ وہ دیکھیں کہ اس کو واقعہ شہادت امام حسین علیہ السلام سے کس قدر تعلق ہے۔

ضمیمہ

رزم نامہ تالیکوٹہ

(رونلڈ ہراس کی کتاب "تاریخ خاندان اراویڈو" سے رزم نامۂ تالیکوٹہ کے آخری تین قطعے یہاں دئے جاتے ہیں۔ جن میں حسین نظام شاہ سلطان احمدنگر کے کسی درباری شاعر نے اس فیصلہ کن جنگ کا حال لکھا ہے۔ کسی اور جگہ اس جنگ کی تفصیل میں بتلایا گیا ہے کہ یہ حسین نظام شاہ ہی کی استقامت و جوانمردی کا نتیجہ تھا کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی تھی)

لشکر آراستن حسین شاہ بعزم غزائے کافر و روان شدن بجانب بیجانگر

حسین شاہ آں بادشاہ دلیر — کہ پیشش بود ہمچو روباہ شیر

سر سرفرازاں و گردن کشاں — کہ بروے کند آفریں انس و جاں

خداوند شمشیر و تخت و کلاہ — چو تابندہ خورشید با عز و جاہ

بآں حشمت و جاہ و فرزانگی — بآں ہیبت و زور و مردانگی

نبود و نیامد کسے در جہاں — جہاندار و فیروز با عز و شاں

چناں داشت شمشیر و بازوے زور — کز و در جہاں بود غوغا و شور

بدل غیر ازیں آرزوئے نداشت — جز ایں میل خاطر بسوئے نداشت

کہ با کافر رائے بیجانگر — کند جنگ و کوتہ کند شور و شر

کہ از دست آں کافر نابکار — مسلماں بسے گشتہ بودند زار

ہمی خواست دایم ز لطف خدا — کہ او را میسر شود ایں غزا

روان گشته القصه از بهر جنگ سوئے ملک بیجانگر بیدرنگ
بیاراست لشکر بعزم نبرد بدان سان که کس جمع لشکر نکرد

جنگ کردن حسین شاه با رامراج که بادشاه بیجانگر بود و فتح کردن

سحرگاه چون مرغ بکشاد بال تهی شد دماغ سپهر از خیال
بغول سیه بانگ بر زد خروس درآمد بغریدن آواز کوس
چو کافر خبر یافت کامد سپاه جهان گشت بر چشم کافر سیاه
یکے لشکر انگیخت از تیر و تیغ فروزنده بر تیش بر آمد به میغ
ز نعل ستوران پولاد میخ بجنبش درآمد زمین هم ز بیخ
زبس نعره کامد برون از کمین فرو اوفتاد آسمان بر زمین
ز شوریدن بانگ چون رستخیز بوحش بیابان درآمد گریز
چو بر جنگ شد ساخته ساز شان گریزان شده دیو از آواز شان
دو ابر از دو سو در خروش آمدند دو دریائے آتش بجوش آمدند
چنان آمد از هر دو لشکر غریو کزان هول دیوانه شد مغز دیو
چو لشکر بلشکر درآورد روئے مبارز برون آمد از هر دو سوی
درآمد به غریدن ابر سیاه ز ماهی تف تیغ بر شد بماه
ز پویه که پی بر زمین میفشرد در اندام گاو استخوان گشت خرد
روا رو زنان تیر فولاد سائی در اندام شیران فولاد خائی
ترنگ کمان هائے بازو شکن بسے خلق را برده از خویشتن
صف ژنده پیلان هیجا شکوه میان سپاه آمده کوه کوه

مژه چوں سناں چشمہا چوں عقیق | ز خرطوم تا دم درآہن غریق

زبس ژنده پیلاں بصف اندروں | شد از پائے پیلاں زمیں نیلگوں

غریو دو لشکر گذشت از فلک | بداں ساں که کر گشت گوش ملک

ولے کشته کافراں بیشتر | دل کفر ز اسلام دلریشتر

حسیں شاه آں بادشاه جہاں | گزو در حذر بوده شیر ژیاں

بیارامت بازار ناورد را | برانگیخت آب رواں گرد را

حمایل یکے تیغ ہندی چو آب | بگوہر تر از چشمۂ آفتاب

ز فولاد ہندی کله بر سرش | که گوہر برشک آمد از گوہرش

نشسته بربارگی کوه وش | بخوشحالی و تندیٔ روئے خوش

بشمشیر کیں چوں درآورد دست | ببازار کافر درآمد شکست

دل از جا بشد کافر شوم را | چو از کورۂ آتشیں موم را

حسیں شاه را فتح شد رہنموں | بزنہار خواہی درآمد زبوں

چو خصماں گرفتار خواری شدند | دلیراں کافر بزاری شدند

بزخم سناں کافر رام راج | سرش بر زمیں خورد افتاد تاج

ز افتادن کافر از زخم تیز | تو گفتی برآمد یکے رستخیز

بیک کس اشارت چو آں شاه کرد | سرش را ببرید و پر کاه کرد

زبس کشته برکشته مردان مرد | شده راه کشته بر ره نورد

زبس غارت آوردن از بیشماره | غنیمت نگنجید در عرصه گاه

چو شاه آں متاع گراں ہیچ دید | چو دریا یکے دشت پر گنج دید

شد از فتح کفار و تاراج گنج | خوش آن و بر آسوده از راه و رنج
بعبرت دران کشتگان بنگریست | بخندید پیدا و پنهان گریست
که چندین خلائق درین دار و گیر | چرا کشت باید بشمشیر و تیر
گنه گر برایشان نهم نارواست | ور از خود خطا بینم این هم خطاست
فلک را سر انداختن شد سرشت | نشاید کشیدن سر از سرنوشت
که داند که این خاک انگیخته | بخون چه دلهاست آمیخته
بیا ساقی از می مرا مست کن | بجوی می ورد هی نقل در دست کن
ازان مے که دل را بدان خوش کنم | بدو نزغ ورش طلق آتش کنم

باز آمدن حسین شاه از غزای کافر و فتح بیجانگر بشهر احمد نگر ورحلت کردن او از دار الفنا بدار البقا

گذارندهٔ داستان دری | چنین داد نظم گذارش گری
که چون فرخی شاه راگشت جفت | چو گلنار خندید و چون گل شگفت
در گنج بکشاد بر گنج خواه | توانگر شد از گنج و گوهر سپاه
غنی کرد گردن کشان را به گنج | ز گوهر کشی لشکر آمد به رنج
بفرمود تا کوس بنواختند | وزانجا سوئے ملک خود تاختند
روارو زنان نای زرین زدند | سراپرده بر پشت پروین زدند
شهنشه بزد کوس و لشکر براند | سر رایت خود بگردون رساند
پس آنگه روان شد بفتح و ظفر | بریده سر راو بیجا نگر،

سوے ملکت خویش و آرامگاہ — کہ بد شہر احمد نگر تخت گاہ
چنیں شاہ آں شاہ فیروزمند — برافراختہ سر بچرخ بلند
نشستہ برمرکب خاص خویش — خرامندہ براسپ رقاص خویش
بمرکب رواں لشکر از ہر کنار
چنداں کہ داند کس آنرا شمار

ضمیمہ

سرا

تاریخ میں ہر جگہ سرا کا نام آیا ہے۔ یہ لکھا جا چکا ہے کہ عالمگیر اورنگ زیب جس وقت دکن کا وایسرائے تھا۔ تو اس نے بیجاپور کی فوجوں کو حکم دیا تھا کہ جنوبی ہند پر حملہ آور ہوں۔ بیجاپوری جنرل رن دولہ خاں نے ۱۶۳۸ء میں جنوب پر فوج کشی کی۔ اور تمام بالاگھاٹ کا علاقہ میسور سے جنوب تک فتح کر لیا گیا۔ اور ایک صوبہ بالاگھاٹ بیجاپور کے نام سے بنایا گیا۔ اس صوبہ کا پہلا گورنر رن دولہ خاں تھا۔ اس نے اپنے صدر مقام کے لئے پہلے بنگلور کو اور بعد میں سرا کو منتخب کیا۔ (بنگلور میں رن دولہ خاں کی ایک یادگار باقی ہے۔ جس کو ابھی تک صوبہ دار کا چھتر کہا جاتا ہے۔ یہ بیونت پور ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے)

سرا بنگلور سے شمال کی جانب ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسکی بنیاد پندرہویں صدی عیسوی میں رکھی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ رنگپا نایک حاکم رتن گیری شکار کے لئے نکلا تھا۔ جس وقت اس میدان میں پہونچا۔ جہاں اب سرا واقع ہے تو

اس نے یہاں ایک خرگوش دیکھا۔ اس نے خرگوش پر شکاری کتے کو چھوڑا۔ خرگوش بجائے بھاگنے کے کتے سے لڑنے لگا۔ رنگپا نایک نے سمجھا کہ اس زمین میں بہادری کی خاصیت ہے۔ چنانچہ اس نے قلعہ اور شہر بنانے کا حکم دیا۔ یہ ابھی تعمیر ہو رہے تھے کہ رن دولہ خاں نے ان پر قبضہ کر لیا۔ اس کو بھی آب و ہوا کے لحاظ سے یہ جگہ نہایت پسند آئی۔ یہاں سے سرا کے عروج کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ سرا پر ۱۶۳۸ء میں قبضہ ہوا۔ رن دولہ خاں کے بعد ۱۶۸۶ء تک سرا کے اور پانچ گورنر ہوئے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں:-

(۱) افضل خان (۲) ملک ریحان

(۳) عبدالحلیم خان (۴) سید مفتاح

(۵) نجیب خاں احراری۔ رستم جنگ

۱۶۸۶ء میں جب شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے بیجاپور کا خاتمہ کردیا تو سرا بھی مغلیہ سلطنت کے ماتحت آگیا۔ عالمگیر کی جانب سے پہلا گورنر قاسم خاں مقرر ہوا۔ جس کو شہنشاہ نے کل جنوبی ہند کے فتح کرنے کا حکم دیا۔ قاسم خاں کی فتوحات مشرق و جنوب میں اس قدر وسیع ہوئیں کہ تمام مشرقی میدانی علاقے کو جسے ساحل کورومنڈل کہا جاتا ہے۔ سرا سے علحدہ ایک اور گورنر کے ماتحت کردیا گیا۔ صدر مقام پہلے جنجی اور بعد میں ارکاٹ قرار پایا۔

مغلیہ قبضہ کے بعد سرا کے ماتحت یہ سات پرگنے دئے گئے۔ جہاں ایک ایک نائب گورنر تھا۔

(۱) بسواپٹن (۲) بودی ہال (۳) سرا (۴) پگنڈہ (۵) بڑا بالاپور (۶)

ہوسکوٹہ (۷) کولار۔

ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل ریاستیں بھی سرا کے ماتحت تھیں۔

(۱) ہرپن ہلی (۲) کنداریی (۳) آنے گندی (وجیانگر) (۴) بدنور (۵) چتل ورگ (۶) میسور (۷) ماگڑی۔

یہ ریاستیں اپنا اپنا سالانہ خراج سرا کو بھیجدیتی تھیں۔

قاسم خاں کے بعد ذوالفقار خاں سرا کا گورنر مقرر ہوا۔ اسکے عہد میں ہندو ریاستوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ لیکن اس نے از سرِ نو فوج کشی کر کے جنوب کو کامل طور پر فتح کر لیا۔ اسی سلسلہ میں جب میسور کے راجہ کو یہ معلوم ہوا کہ ذوالفقار خاں سرنگاپٹم (میسور) پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تو اس نے شہنشاہ عالمگیر کو تحفے تحائف بھیجکر از سرِ نو حلف وفاداری کی تجدید کی۔

سرا اس وقت اپنے پورے عروج پر تھا۔ بیجاپوری مسلمانوں کو اس پر قبضہ کئے ہوئے پچاس سال گذر چکے تھے۔ یہ جنوب میں بیجاپوری تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت یہاں پچاس ہزار گھرانے اور نوّے مساجد آباد تھیں۔

آتش خاں کے بعد سرا کے اور بہت گورنر (صوبہ دار) مقرر ہوئے۔ جن کے نام ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

(۱) قاسم خاں (۲) آتش خاں (۳) معمور خاں کوڑاکہ (۴) چین قلیچ خاں (۵) خداوند خاں (۶) تہور خاں (۷) بردل خاں (۸) کفایت خاں (۹) محمود خاں (۱۰) داؤد خاں (۱۱) عبداللہ خاں (۱۲) عبدالرسول خاں (۱۳) امین خاں (۱۴) غالب خاں (۱۵) نجیب خاں (۱۶) درگاہ قلی خاں (۱۷) عابد خاں (۱۸) حیدر علی۔

عالمگیر کی وفات کے بعد جب ملک میں خانہ جنگی پھیل گئی تو سرا بھی اس سے محفوظ نہ رہا۔ یہ امین خاں کا زمانہ تھا کہ سرا کے گورنر اور ارکاٹ کے صوبہ دار سعادت اللہ خاں میں کش مکش شروع ہو گئی۔ سعادت اللہ خاں چاہتا تھا کہ سرا کا صوبہ بھی اس کے ماتحت کر دیا جائے۔ لیکن امین خاں نے سختی سے مخالفت کی۔ امین خاں کے بعد اسکے جانشین کمزور نکلے یہی وہ زمانہ ہے کہ نظام الملک آصف جاہ اول نے دخل دیکر سعادت اللہ خاں کی مرضی سے امین خان کو گورنر مقرر کیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سرا والوں نے حیدرآباد یا ارکاٹ کی سیادت کو کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ اور ہمیشہ ارکاٹ اور سرا میں نااتفاقی رہی۔

ملک میں یہ خانہ جنگی اس طرح تھی کہ ۱۷۵۷ء میں مرہٹوں نے سرا پر قبضہ کر لیا۔ چونکہ حیدرآباد تمام جنوبی ہند کو اپنے ماتحت سمجھ رہا تھا۔ اس لئے نواب بسالت جنگ ملک سے مرہٹوں کو بے دخل کرنے کیلئے جنوب میں آیا اور حیدر علی کی مدد سے ہوسکوٹہ پر قابض ہو گیا ہوسکوٹہ کے بعد بسالت جنگ کے حکم سے حیدر علی نے سرا پر بڑھکر ۱۷۶۱ء میں اسے مرہٹوں کے قبضہ سے چھڑا لیا۔ اس حسن کارگذاری اور دلیری کے صلے میں بسالت جنگ کی سفارش پر شہنشاہ دہلی کی طرف سے حیدر علی کو "نواب سرا" کا خطاب حاصل ہوا۔ اور اس طرح نواب حیدر علی سلطنت مغلیہ کے آخری گورنر تھے۔ جس کے بعد ہی انہوں نے اپنی علیحدہ سلطنت قایم کی جو تاریخ میں "سلطنت خداداد" کے نام سے مشہور ہے۔

۱۷۶۶ء میں مرہٹے پھر سرا پر قابض ہو گئے۔ مگر ۱۷۷۴ء میں ٹیپو سلطان نے ایک ایسی فاش شکست دی کہ اسکے بعد مرہٹے پھر دریائے کرشنا کی جنوب میں آنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس طرح سرا ۱۷۷۴ء میں سلطنت خداداد کا ایک حصہ بن گیا۔ اور یہاں ایک گورنر مقرر

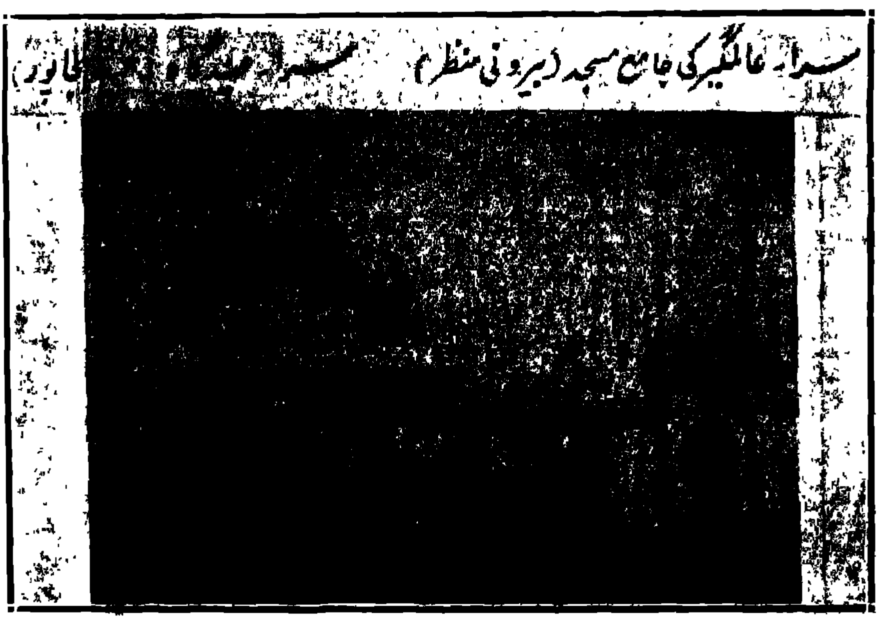
کردیا گیا۔ اور یہ گورنری اس سلطنت کے خاتمہ تک رہی۔ جب ۱۷۹۹ء میں سلطنت خداداد کو زوال آیا تو سرا پر بھی زوال آگیا۔

مغربی مورخین ٹیپو سلطان پر الزام لگاتے ہیں کہ وہی سرا کی ویرانی کا ذمہ دار ہے اس لئے کہ اس نے بارہ ہزار گھرانوں کو یہاں سے سرنگا پٹم بھیج دیا تھا۔ مگر نظر غور سے دیکھا جائے تو سرا کی ویرانی کا سبب ٹیپو سلطان نہیں بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اس کمیشن پر آتا ہے جو زوال سلطنت خداداد کے بعد ملک کے تجزیہ کے لئے مقرر ہوئی تھی۔ جس طرح سرنگا پٹم میں مسلمانوں کے جتھے کو توڑ کر اسے ویرانہ بنایا گیا۔ یہی پالیسی سرا میں بھی عمل میں آئی۔ اسکے بعد جب میسور میں ہندو راج قایم ہوا اور پورنیا وزیر اعظم بنا تو رہے سہے خاندان بھی اس کی پالیسی سے بتدریج سرا چھوڑنے پر مجبور رہوے۔ کیونکہ تمام جاگیریں ضبط کرلی گئیں لوگوں کیلئے کوئی وسیلۂ معاش نہیں رہا تھا۔ اس لئے کہ مسلمان صرف فوجی ملازمت کرتے تھے یہ سرا کی اسلامی آبادی ہی تھی جو بیجاپور، سلطنت مغلیہ اور بعد میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی فوجوں کو سپاہی مہیا کرتی رہی تھی۔ جس کا ثبوت سرا کے قبرستانوں سے ملتا ہے۔ ان تمام قبرستانوں میں جو شہر کے کل رقبہ میں پھیلے ہوے ہیں۔ دیکھا جائے تو نوے فیصدی قبریں عورتوں کی نظر آئیں گی۔ جس سے نتیجہ نکل سکتا ہے کہ مردانہ آبادی فوجی ملازمت کے سلسلہ میں ہمیشہ شہر سے باہر رہی ہے۔

سرا کی صنعتیں

سرا اپنے زمانہ عروج میں پھولدار چھینٹ، کملوں اور لاک کے لئے مشہور تھا۔ یہاں کی چھینٹ تمام ہندوستان میں مشہور تھی۔ بلکہ غیر ممالک کو بھی جاتی تھی۔ سلطنت خداداد کے زوال کے بعد ہی ان صنعتوں پر زوال آگیا اور آج چھینٹ بنانے والوں کا نام و نشان بھی نہیں۔


سنہراء عالمگیر کی جامع مسجد (اندرونی منظر)


سنہرا عالمگیر کی جامع مسجد (بیرونی منظر)

سرا کی موجودہ حالت

اس وقت اپنے دیکھنے والوں کیلئے سرا ایک شہر خموشاں کا منظر پیش کر رہا ہے۔ کل سات ہزار کی آبادی ہے جس میں نصف سے زیادہ مسلمان ہیں۔ سرا جس وقت عروج پر تھا۔ تو اسکی آبادی سات میل کے رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ صرف پٹھانوں کے محلہ میں پٹھانوں کے چودہ ہزار گھر آباد تھے مگر اب یہ تمام رقبہ قبرستانوں اور کھیتوں سے گھرا ہوا ہے۔ بلکہ گھروں کے اندر تک قبریں موجود ہیں۔

آثار سرا

جامع مسجد

یہ مسجد شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے حکم سے تعمیر ہوئی تھی۔ مسجد نہایت عالیشان اور سنگین ہے۔ رئیس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ اسلامی تعمیر کا بہترین نمونہ ہے اور ایک ہی پتھر کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ شاید رئیس کی مراد اس سے یہ ہے کہ ایک ہی چٹان سے یہ تمام پتھر لیا گیا ہے۔ مسجد پر چار خوشنما بلند مینار اور تین گنبدیں ہیں۔ درمیانی محراب سنگ مرمر کی ہے۔ جس پر نہایت خوبصورت نقش ونگار ہیں۔ قریب ہی ایک موٹی سنگین زنجیر ہے۔ جس میں چراغ آویزاں کیا جاتا ہے۔ مسجد کے صحن میں ایک بہت بڑا کنواں ہے اس سے ایک نالی کے ذریعہ حوض میں پانی بھرا جاتا ہے۔ مسجد کے مشرقی رویہ پر پانچ دروازے ہیں۔ شمال وجنوب اور مغرب میں بھی دروازے تھے۔ مگر اب بند کر دیئے گئے ہیں۔ صرف ایک بڑا مشرقی دروازہ آمد و رفت کے لئے کھلا ہوا ہے۔ مسجد کے اندر اور باہر پختہ سنگین فرش ہے۔ اندر کوئی کتبہ وغیرہ نہیں۔ لیکن مسجد کی باہری دیوار پر چند کتبے دوسری ویران شدہ مسجدوں کے لگے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ لوگوں نے ویران شدہ مسجدوں کی تاریخ محفوظ رکھنے کیلئے یہ کتبے یہاں

لاکر لگا دیئے تھے۔ (یہ عجیب بات ہے کہ ان میں اس مسجد کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ ان کتبوں میں جواب مسجد کی دیوار پر نقل کر دیئے گئے ہیں۔ مندرجۂ ذیل تاریخیں ملتی ہیں:-

(۱) تاریخ عیدگاہ ۱۶۳۸ء

(۲) ملک ریحان کی درگاہ کی تاریخ ۱۶۳۸ء سے ۱۶۵۰ء

(۳) تاریخ مسجد سدی مختار

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

۱۱۰۱ھ

(۴) تاریخ مسجد شیخ فرید

در گوشِ عقل آمد از غیب ایں ندا

"بیت المقدس است"، بگو تاریخ ایں بنا

۱۱۰۸ھ

جستجو اور تاریخ و نیز ایک اور قدیم کاغذ سے معلوم ہوا کہ اس جامع مسجد کی تعمیر ۱۱۰۸ھ میں ہوئی تھی۔ چونکہ مسجد شیخ فرید کی تعمیر کا سنہ بھی ۱۱۰۸ھ ہی ہے۔ اس لئے ہم کو مسجد شیخ فرید کی جستجو ہوئی مگر اس کا کوئی پتہ نہ مل سکا۔ بعد میں بعض معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ اسی جامع مسجد کو مسجد شیخ فرید بھی کہتے ہیں۔ اس سے نتیجہ نکالا گیا کہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے حکم سے جس انجینیر نے اس مسجد کو تعمیر کیا تھا۔ اس کا نام شیخ فرید ہے۔ اس لئے اس میں شک نہیں رہا کہ اس مسجد کی تاریخ تعمیر

"بیت المقدس است"

۱۱۰۸ھ

ہے۔

مقبرۂ ملک ریحان یہ مقبرہ شہر کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ اور اسی کے مقابل سے بنگلور کو سڑک جاتی ہے۔ ملک ریحان سرا کے گورنر ہے ہیں۔ آپکے اوصاف آج بھی زبان زد خلائق ہیں۔ آپ کا دور حکومت اس قدر مسعود و بابرکت رہا کہ ہندو اور مسلمان دونوں یکساں آپ کے نام کے گرویدہ ہیں۔ آپ کی مدت حکومت ۱۴ سال تھی۔ اس چودہ سال میں آپ نے جس طرح حکومت کی اور لوگوں کے دلوں پر آپ کا قبضہ ہوگیا۔ وہ حیرتناک ہے۔ ایک شاعر آپ کی چاردہ ۱۴ سالہ عہد حکومت کے متعلق لکھتا ہے :- ؎

درسنہ الکہزار و چہل و ہفت — رونق افزائے ملک شد ایں جا
صاحب دولت و ریاست بود — سیرتش ہمچو اولیائے خدا
وصف ایشاں چہ ساں کنم تحریر — از شمار و حساب ہست جدا

آپ کی وفات سنہ ۱۰۶۱ھ میں ہوئی۔ کسی شاعر نے آپ کی وفات کی تاریخ لکھی ہے :- ؎

سالِ رحلت ز عقل پرسیدم — ہاتف از غیب گفت بہ ندا
عرشیاں و ہم ملایک گفت — روح ریحاں بعرش بجا

(ملک ریحان کے مقبرے پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ یہ تاریخیں ایک قدیم کاغذ میں نظر سے گذری ہیں۔

ملک ریحان کے مقبرے اور قبرستان کے لئے اگلے وقتوں میں جو جاگیریں عطا ہوئی تھیں۔ ان میں سات مواضع شامل تھے۔

(۱) وجی گنڈ (۲) یلور (۳) چن گنٹہ (۴) ہلکور (۵) کوس گنٹہ (۶) گرناتھ ہلی

(۷) اس موضع کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

معلوم ہوا کہ جس وقت سلطنتِ خداداد میسور کو زوال ہوا تو یہ جاگیر دیوان پورنیا کے حکم سے ضبط کر لی گئی۔ اور اس کے عوض ڈھائی ایکڑ زمین دی گئی۔ جس میں اگر بارش ہو تو فصل ہوتی ہے ورنہ نہیں۔ ہر سال ملک ریحان کا عرس ہوتا ہے جس کا خرچ سرا کے ہندو مسلمان دونوں ملکر ادا کرتے ہیں۔ کندوری اور باقی دیکھ بھال متوسلین مقبرہ اس آمد سے کر رہے ہیں جو ڈھائی ایکڑ کے کھیت سے ہوتی ہے۔

ملک ریحان کا مقبرہ ایک وسیع قبرستان میں ہے۔ مقبرہ کی عمارت اسلامی فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے اور گنبد کے اندر سنہری نقش و نگار کیا ہوا ہے۔ اوپر بہت ہی خوبصورت اور نازک چار مینار ہیں۔ اس مقبرے اور سرا کے دوسرے مزارات و مساجد وغیرہ کے متعلق لوئیس ریس اپنی کتاب میں لکھتا ہے :-

"میسور میں سارا سنک (SARACENIC) طرز تعمیر کے بہترین نمونے سرا میں پائے جاتے ہیں۔ اور بلا شبہ یہی مغلیہ تعمیرات کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی تعمیرات کا نمونہ سرا کی جامع مسجد اور مقبروں سے ملتا ہے سرا کے مقابر پر جو گنبدیں ہیں۔ اگر چہ بڑے نہیں ہیں۔ مگر بہت خوبصورت ہیں اور اس طرح تعمیر کئے گئے ہیں کہ گویا ایک پھول کھلا ہوا ہے۔ اور اس کی پتیاں جھک کر مل گئی ہیں۔"

گوہر تاج ہندوستان کا مقبرہ

یہی صنعت اس مقبرہ کے گنبد میں بھی ہے۔ یہ مقبرہ ملک ریحان کے قبرستان میں واقع ہے۔ مقبرہ ایک اونچی سطح پر واقع ہے۔ جس پر سیڑھیوں کے

سرا کے کھنڈرات ۔ بیگم کی مسجد ۔



سرا و مقبرہ ملک ریحان ۔ بائیں جانب کا مقبرہ عالمگیر کی بیٹی کا ہے



ذریعہ جاتے ہیں۔ مقبرے سے ملحق جانب مغرب ایک مختصر سی مسجد ہے۔ مقبرے کے جنوب میں ایک اونچے چبوترے پر بہت سی پختہ قبریں ہیں۔ مگر ایک پر بھی کتبہ نہیں۔ انہی میں ایک مختصر سی گنبد کے نیچے جو چاروں طرف سے کھلا ہوا ہے ایک ننھی سی قبر ہے۔ جس میں شہنشاہ ہندوستان عالمگیر اورنگ زیبؒ کی سات سالہ لخت جگر آرام پذیر ہے۔ شہنشاہ جس وقت جنوبی ہندوستان میں تھا تو اس شہزادی کی وفات ہو گئی اور اس گوہر تاج ہندوستان کو سرا کی سرزمین کے سپرد کیا گیا۔ گنبد کے چاروں طرف جو محرابیں کھلی ہوئی ہیں۔ ان پر لوہے کی کڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس پر مخمل و کمخواب کے پردے پڑے رہتے تھے تاکہ نا محرم آنکھ بھی قبر پر نہ پڑے۔ شاہزادی کے متعلق مشہور ہے کہ قرآن ختم کر چکی تھی۔ بہرطور سرزمین سرا کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے شہنشاہ کی ایک معصوم امانت کو اپنے آغوش میں رکھتی ہے۔ شاہزادی کے مزار پر کتبہ نہیں ہے البتہ سرہانے تعویذ پر اس طرح لکھا ہوا ہے:۔

اللّٰہ

محمدؐ

۱۱۰۴ھ

اس مزار سے چند گز کے فاصلہ پر ایک خوشنما احاطہ ہے۔ جس میں دو زنانہ قبریں ہیں۔ ان پر بھی کوئی کتبہ نہیں۔ لیکن احاطہ کے دروازے کی لوح پر یہ تحریر ہے:۔

رحل السلطان بلیلۃ المعراج

۱۲۰۶ھ　　　۱۲۰۶ھ

ان دونوں قبروں کے متعلق مشہور ہے کہ ساس اور بہو کی قبریں ہیں۔ مگر یہ کون

اور کیا تھیں۔ اس کا پتہ سرا میں کسی سے نہیں چلتا۔ سنہ ہجری سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے
کہ سلطنت خداداد کے زوال سے صرف آٹھ سال پیشتر یہ کتبہ لکھا گیا ہے۔

نوٹ:۔ لیکن اس کتبہ کے متعلق میسور کے محکمۂ آثار قدیمہ نے ایک عجیب و غریب مضحکہ انگیز تشریح
کی ہے۔ میسور آرکولاجیکل ڈپارٹمنٹ کی رپورٹ بابت ۱۹۱۸ء کے صفحہ ۵۰ پر لکھا ہے:۔

"سرا میں ملک ریحان کی درگاہ کے احاطہ میں دو کتبے پائے گئے۔ جو عہد مغلیہ
سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ایک پر صرف بَلیلَۃَ المِرَاج لکھا ہوا ہے۔ بلیلہ ایک
زنانہ نام ہے جو بلال (جو پیغمبر کے موذن تھے) کا مونث ہے۔"

پہلے تو کتبہ میں بلیلۃ المعراج کے آگے کے دو لفظ چھوڑ دئے گئے ہیں۔ اور پھر محکمہ نے یہ کوشش ہی نہیں کی کہ
لیلۃ المعراج کے مفہوم کو سمجھے۔ اور آخر میں تاریخ جو عہد ٹیپو سلطان سے تعلق رکھتی ہے اسکو عہد مغلیہ کا بتلایا گیا ہے۔

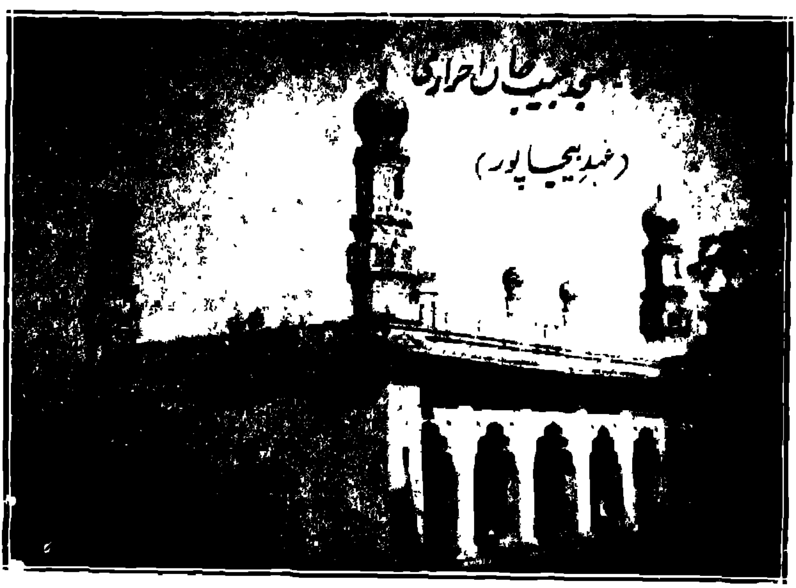
بیگم کی مسجد

ملک ریحان کے مقبرے سے تھوڑے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی دو منزلہ عمارت ہے جو یاسؔ حسرت کا ایک ہوش ربا منظر پیش کر رہی ہے۔
یہ عمارت بیگم کی مسجد کہلاتی ہے۔ دراصل یہ زنانہ مسجد تھی۔ جہاں خواتین سرا نماز پڑھتی
تھیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ عیدین کے موقع پر کل عورتیں نماز عید کیلئے اسکے احاطہ میں جمع ہوتی
تھیں۔ اب وہ احاطہ یعنے چار دیواری کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ مسجد کے اوپر
کی چھت اور دیواریں جا بجا سے شق ہو کر گر گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دروازے اور دریچے
نہایت بے دردی سے نکالدئے گئے۔ جس سے ڈراڑیں پڑ گئے ہیں۔ اوپر کا حصہ بالکل مخدوش
حالت میں ہے۔ نیچے بھی کم و بیش یہی حالت ہے۔

مسجد نجیب خاں احراری

یہ مسجد عہد بیجاپور میں نجیب خاں احراری گورنر سرا نے تعمیر کی تھی۔ کل مسجد سنگین بہت وسیع اور ہوادار


سرا - عیدگاہ (تعمیر عہد بیجاپور)


(عہدِ بیجاپور)

ہے اور ایسی نظر آتی ہے کہ گویا ابھی بنکر تیار ہوی ہے۔ اس کے عالیشان مینار بہت دور سے نظر آتے ہیں۔ اس مسجد کے دروازے بھی مختلف سمتوں میں تھے۔ لیکن بند کردئے گئے۔ اور اب ایک ہی بڑا دروازہ ہے صحن میں کئے ایک مزا بسنے جوڑ گئے ایک بہت بڑا حوض تھا۔ جس کو پاٹ دیکر اب مختصر کردیا گیا ہے۔ اس مسجد کے لئے بھی ایک بہت بڑی جاگیر تھی۔ جو ویران پور نیا کے عہد میں زوال سلطنت خداداد کے بعد ضبط ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کی جاگیر کی سند موضع ناگرہ کے پٹیل کے پاس پیتل کی تختی پر لکھی ہوئی موجود ہے۔ مسجد کے اندر یہ کتبہ لگا ہوا ہے:-

ہاتف بہ بانگ گفت پس از حمد و از ثنا

"بیت العتیق" حق شدہ تاریخ ایں بنا

شمالی دیوار پر جو کتبہ لگا ہے۔ اس پر لکھا ہوا ہے:-

از سعیٔ واحد بیگ شد ایں مسجد خان نجیب

کرد اب ایں از خدا در عاقبت کرد نصیب

اس مسجد کی نسبت مشہور ہے کہ زوالِ سلطنتِ خداداد کے بعد جب انگریزی و میسوری فوجوں نے سرا پر قبضہ کیا تو اس میں گھوڑے باندھے جانے لگے تھے۔ اور بعد میں واگزاشت ہوی۔

عیدگاہ

عیدگاہ میں کوئی کتبہ نہیں۔ عمارت نہایت عالیشان اور بہت بڑی ہے۔ اس عیدگاہ کی تعمیر کا سنہ ۱۲۳۵ھ ہے۔ یعنے بیجاپور والوں نے جس وقت سرا پر قبضہ کیا اسی سال یہ عیدگاہ تعمیر ہوی تھی۔ عیدگاہ سے جانب جنوب تھوڑے فاصلہ پر چھاج پلی کا کٹہ (تالاب) ہے۔ یہ کٹہ دراصل ایک تالاب کا بند ہے مشہور

ہے کہ یہاں عورتوں کے غسل کیلئے پردے کے انتظامات تھے۔ اس بند کے نیچے اب بھی درختوں کے جھنڈ ہیں جو بالکل تروتازہ اور شاداب نظر آتے ہیں۔

محمد خاں کا روضہ

محمد خاں کا پورا روضہ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ جس پر نہایت عمدہ نقش ونگار ہیں۔ روضہ کے اندر عورتوں کے دو مزار ہیں۔ روضہ سے ملحق ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو شکستہ حالت میں ہے۔ اس سے تھوڑے فاصلہ پر ایک اور قبرستان ہے۔ اس میں بھی ایک شکستہ مسجد ہے۔ اس مسجد کے اندر ایک چھوٹا سا کتبہ ہے۔ جس پر کندہ ہے۔

" خدایا بدہ ریحان سلامتے

اسمٰعیل ابن قادر خاں برکے

۱۱۲۰

ابن بوستان ابن جمال ابن مصری ابن علی ابن مختار "

مسجد کے صحن میں ایک سنگین اور عالیشان مقبرہ ہے۔ جس میں دو قبریں ہیں۔ اور دونوں پر ایک گنبد سائبان ہے۔ مگر یہ نہایت تعجب خیز امر ہے کہ ایک قبر تو بھری ہوئی ہے مگر دوسری خالی ہے۔ شاید کسی کے دفن کیلئے پہلے سے تیار کیگئی تھی مگر وہ یہاں دفن نہ ہوسکے اس قبرستان میں اور احاطے بھی ہیں۔ ایک بڑے احاطے میں ایک اور مقبرہ ہے۔ اس پر بھی دو گنبد ہیں۔ جن میں سے ایک قبر ہی پر گرا پڑا ہے۔ نیز ہر جگہ بڑی بڑی سنگین باؤلیاں ہیں۔ جن کے اندر اترنے کیلئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس سے آگے ایک اور وسیع قبرستان ہے اور اس میں ایک سادہ مگر بڑا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ سید فرید اللہ شاہ حسینی صاحب چشتی رح کا ہے۔ جن کے متعلق مشہور ہے کہ ساتؔ سو سال آگے تبلیغ اسلام کے لئے یہاں آئے تھے۔ وفات کے بعد یہیں دفن ہوئے۔

سرا۔ روضہ و مسجد نادر خاں برکی



سرا۔ محمد خاں کا روضہ



کہا جاتا ہے کہ سید فرید اللہ شاہ حسینی کے قبرستان کیلئے پندرہ ایکڑ زمین ملی تھی جو ضبط ہوگئی۔ اب صرف ۳½ ایکڑ رہ گئی ہے۔

سرا کا قلعہ

قلعہ میں داخل ہونے سے پہلے ایک چھوٹی سی شکستہ مسجد ملتی ہے جس کی اب صرف ایک محراب باقی ہے۔ اس مسجد کا کتبہ مسجد نجیب خان احراری کے احاطہ میں پڑا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجد ملک ریحان کے زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی۔ کتبہ پر یہ عبارت کندہ ہے:۔

بنی ھذا المسجد الشریف العظیمی لعالی المبارک
علی نظر الراجی غفور تاب الملک ریحان مبارک
عفی اللہ عنہما بحق نبی الکریم بہین وتبارک

مسجد سے تھوڑے فاصلہ پر قلعہ کا دروازہ ہے۔ اس پر بھی کوئی کتبہ نہیں۔ گو دروازہ ٹوٹ گیا ہے۔ مگر قلعہ کسی قدر اچھی حالت میں ہے۔ اندر سرا کے گورنر کا محل تھا۔ اس کے متعلق رئیس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ مغلیہ طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کے نمونہ پر حیدر علیؒ اور ٹیپو سلطانؒ نے بنگلور اور سرنگا پٹم میں اپنے محلات تعمیر کئے تھے۔ اب اس محل کی صرف چار دیواری کھڑی ہے۔ قلعہ کی ایک جانب ایک بہت بڑا سنگین کنواں ہے جس سے نالی کے ذریعہ پانی ایک محفوظ و سائبان دار حوض میں پہونچایا جاتا تھا۔ وہاں سے محل اور دوسری جگہ جاتا تھا۔

مقبرۂ عرب شاہ قادریؒ

قلعہ سے نکلکر گاؤں کو آتے وقت راستے میں عرب شاہ قادری کا مقبرہ اور قبرستان ہے۔ یہ مقبرہ ڈھائی سو سال پیشتر تعمیر ہوا تھا۔ اس مقبرہ اور قبرستان کیلئے موضع بید گرٹہ جاگیر میں ملا تھا۔

جاگیر ضبط ہوکر اب پندرہ روپیہ ماہانہ ملتے ہیں۔

پٹھان واڑی کی مسجد

قلعہ کے آگے جو وسیع میدان ہے۔ اگلے زمانہ میں یہ نہایت آباد تھا۔ اسکو پٹھانوں کا محلہ یا پٹھان واڑی کہا جاتا تھا۔ یہاں پٹھانوں کے چودہ ہزار گھرانے آباد تھے۔ اس میدان میں ایک سنگین خوبصورت مسجد ہے جو مغلیہ طرز تعمیر کے نمونہ کی ہے۔ مسجد کا ایک مینار شکستہ ہوکر گر چکا ہے۔ اب صرف ایک مینار باقی ہے۔

شہر کے اندر

شہر کے اندر بہت سے قبرستان ہیں۔ ان قبرستانوں میں جو قبریں ہیں کسی پر بھی کوئی کتبہ نہیں۔ البتہ ایک قبر کی لوح پر یہ کندہ ہے:۔ ھٰذا القبر شیخ عبدالکریم ابن شیخ علی ابن شیخ امین

شہر ربیع الاول ۱۱۲۶ھ ہجری

ایک اور قبرستان میں ایک اونچے چبوترے پر حضرت شاہ شریف حسینؒ کا مزار ہے جن کا عرس شعبان کے مہینہ میں ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مقبرے اور قبرستان کیلئے بھی ایک جاگیر موضع ارسے ہلی میں ملی تھی جو ضبط ہوگئی۔ ممکن ہے کہ ذیل کا کتبہ جو ایک قدیم کاغذ میں نظر سے گذرا اسی مزار کا ہو۔ واللہ اعلم

قدوۃ سالکان ہادیٔ وقت ۔۔۔ شاہ عارف بزم خاک بخفت

جستم از عقل سال رحلت را ۔۔۔ ہاتف از غیب شیخ را بگفت

از عمر یک صد و شانزدہ سالگی

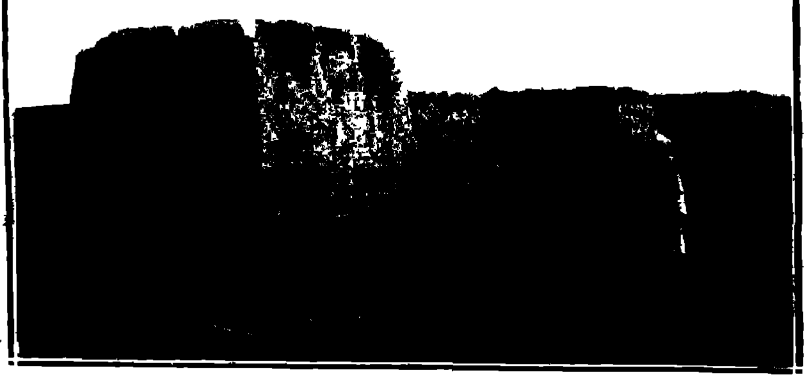
نقل فرمودند حساب تاریخ

وفات در ۱۱۷۱ھ ہجری

اور ایک کاغذ پر یہ لکھا ہوا تھا۔



سرا۔ عہد مغلیہ کی ایک مسجد
جس کا صرف ایک مینار باقی ہے۔



سرا۔ قلعہ

این مسجد نزول شد نجیب خاں صوبہ دار سرا، افتادہ شد برقت،

آوارگی قلعہ و دیار ۱۲۱۱ھ ہجری۔

(نوٹ :- اس تاریخ سے قلعہ و شہر سرا کی تباہی کی تاریخ ملتی ہے جو سلطنت خداداد کے زوال سے

۶ سال بعد ہوئی۔)

سرا میں انکے سوا اور کوئی آثار باقی نہیں ہیں۔ جہاں نظر اٹھتی ہے بسوائے ویرانوں کھنڈروں۔ قبرستانوں، شکستہ مسجدوں اور مقبروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ صرف جامع مسجد، مسجد نجیب خاں اور ملک ریحان کا مقبرہ کسی قدر اچھی حالت میں ہیں۔ نوسے مساجد میں پانچ، چھ کے سوا جن کا تذکرہ ہم نے کیا ہے اور کسی مسجد کا پتہ نہیں ملتا۔

آہ! یہ ہے وہ شہر جو پونے دو سو سال (یعنے ۱۶۳۸ء سے ۱۷۹۹ء تک خالص اسلامی تہذیب و تمدن کا جنوب میں مرکز رہا ہے۔ جہاں بیجاپوری اور مغلیہ تہذیب پہلو بہ پہلو کارفرما رہی تھی۔ آج جو مسلمان یہاں آباد ہیں وہ بالکل تباہ حالت میں ہیں۔ اور کوئی صنعتیں اور کارخانے بھی یہاں نہیں ہیں۔ جنکے لئے سرا کبھی مشہور تھا۔

(نوٹ :- ابھی حال میں سید امین الدین صاحب نے ایک چھوٹی سی بٹن بنانے کی کلٹری ایجاد کی ہے۔ جو ناریل کے پوست سے اور ہڈیوں وغیرہ سے گنڈیاں بنائی جاتی ہیں۔ سرا میں مصنف کتاب کو سید صاحب سے بہت مدد ملی تھی۔ قلعہ کی جو تصویر دی گئی ہے۔ اس میں سید صاحب کی تصویر بھی ہے۔)

اسد رجہ اقلیت میں نہ رہتے (یہاں سیاسی اہمیت سے میری مراد وہ مسلمہ حقیقت ہے کہ رعایا حکمران قوم کا اثر بہت زیادہ محسوس کرنے لگتی ہے۔ جنوبی ہند کی آبادی کا بہت زیادہ حصہ چونکہ نیچ ذاتوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے اگر مسلمان اپنے اصول مساوات کے ساتھ ساتھ حکمران بھی ہوتے تو اسلام کو یہاں بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوتی) لیکن مسلمانوں کی کوتہ بینی نے ایسے اسباب پیدا کر دئے جنہوں نے اس سلطنت کو ہی ختم کر دیا۔ یعنے اس سلطنت میں شیعہ سنی اختلافات اس قدر پیدا ہو گئے کہ پوری سلطنت اس آگ کی نذر ہو گئی۔

مورخ ہیگ اپنی کتاب ہسٹورک لینڈ مارکس آف دکن کے صفحہ ۴ پر لکھتا ہے:۔

"بہمنی سلطنت کے زوال کے اسباب میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ غیر ملکی اور دکنی امرا میں مذہبی اختلافات پیدا ہو گئے۔ یہ علاؤالدین احمد شاہ ثانی بہمنی کا زمانہ تھا کہ ان اختلافات نے زور پکڑا مسلمانوں کی خانہ جنگی اس وقت تک ختم نہیں ہوئی جب تک دکن کی اسلامی سلطنتیں خود ختم نہیں ہو گئیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اپنی جانب سے اس پر مزید حاشیہ کی ضرورت نہیں۔ اسی مورخ نے اپنی مذکورۂ بالا عبارت کی تشریح بھی کر دی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"شہنشاہ محمد بن تغلق سے بغاوت کرنے کے بعد دکن میں جب مسلمانوں نے اپنی علیحدہ سلطنت قائم کی تو ایران، عراق، وسط ایشیا اور ساحل عرب سے مسلمان یہاں آکر آباد اور اس سلطنت میں عہدے حاصل کرنا شروع کئے۔ انکی بہادری و ذہانت کو دیکھتے ہوئے بہمنی سلاطین نے انہیں بڑے بڑے عہدے دینے شروع کئے۔ یہاں تک کہ ایک بہمنی بادشاہ نے ایک غیر ملکی سردار شاہ قلی سلطان کو اپنی بیٹی مناکحت میں دی۔ خلف حسن بصری اور خواجہ محمود گاوان جو غیر ملکی تھے۔ انہیں ملک التجار کا خطاب دیا گیا۔ اسی سے

جنوبی ہند میں مسلمانوں کی اقلیت کے اسباب

کل ہندوستان میں سب سے پہلے جو خطہ اسلام کی روشنی سے منور ہوا تھا۔ وہ جنوبی ہند تھا۔ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں بتلایا جا چکا ہے کہ ساحل ملیبار و مدورا پر عربوں کی نامعلوم زمانہ سے آمد و رفت تھی۔ اس لحاظ سے بہ نسبت شمالی ہند کے جنوبی ہند میں اسلام کو زیادہ وسعت پذیر ہونا تھا۔ بہ خلاف اس کے کل جنوبی ہند میں مسلمانوں کی آبادی ۹ فیصدی سے بڑھکر نہیں ہے۔ اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ اس کے علل و اسباب کیا ہیں؟

(۱) اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ اسلام کو چھ سو سال تک یہاں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ گو یہ اپنے آغاز ہی سے ساحل ملیبار و مدورا پر عرب تاجروں اور اولیاء اللہ کے ذریعہ محدود پیمانہ پر پھیل چکا تھا۔

(۲) اسلام کی سیاسی اہمیت سنہ ۱۳۱۰ء سے یعنے ملک کافور کے حملے کے بعد سے ہوئی۔ لیکن اسکے چند سال بعد ہی ملک میں ایک ایسا انقلاب آیا جو اس کا سد راہ بنگیا۔ یعنے مسلمان خانہ جنگی میں مبتلا ہوگئے شہنشاہ محمد بن تغلق کا گورنر جو مدورا میں تھا باغی ہوگیا۔ اور اس طرح شمالی ہند سے جو تعلق پیدا ہو چکا تھا وہ منقطع ہوگیا۔ اور ہندوؤں کی ایک نئی زبردست سلطنت وجود میں آگئی۔ جسکا نام وجیانگر ہے۔ جو شمالی اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کے درمیان حائل ہوگئی۔ یا بالفاظ دیگر اسلام کے ہی سد راہ ہوگئی گو اسی زمانہ میں دکن میں ایک زبردست اسلامی سلطنت قایم ہوئی جس کا نام دولت بہمنیہ تھا۔ اور یہ سلطنت ہر طرح سے سلطنت وجیانگر کے مد مقابل تھی اور ممکن تھا کہ اگر اس سلطنت کو استقلال نصیب ہوتا تو جنوبی ہند بتدریج پھر اسکے قبضہ میں آجاتا اور ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی یا کم از کم مسلمان

پہلے دربار میں بادشاہ کے دائیں بازو دکنی امراء کی نشست تھی۔ اب انہیں بائیں بازو بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ اور دایاں بازو غیر ملکی امراء کو دیا گیا۔"

دکنی امراء نے جن کے خاندان اس سلطنت کے بانیوں میں سے تھے، سلاطین بہمنیہ کی ان کارروائیوں کو اپنی توہین سمجھی۔ گروہ بندی شروع ہوی۔ دکنی امراء سنی العقاید تھے۔ اور غیر ملکی شیعہ۔ حبشی جو فوج میں کثیر تعداد میں تھے۔ انہوں نے بھی عقاید کے لحاظ سے دکنی امراء کا ساتھ دیا۔ خانہ جنگی شروع ہوی۔ اور پائے تخت کی گلیاں تبرا کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ مضافات اور سلطنت کے دور دراز مقامات بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہمنی سلطنت پارہ پارہ ہوگئی۔ جہاں شیعہ امرا کا زور تھا۔ انہوں نے اپنی حکومتیں علیحدہ قایم کیں اور جہاں دکنی یا سنی امراء تھے۔ انہوں نے اپنی علیحدہ۔ اسطرح جو سلطنتیں قایم ہوئیں۔ انہیں تاریخ میں بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ، بیدر اور برار کہا جاتا ہے۔ شیعہ سنی اور ملکی و غیر ملکی اختلاف یہاں بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دکن کی یہ اسلامی سلطنتیں اپنی اندرونی خانہ جنگیوں میں مبتلا ہونے کے علاوہ ہمیشہ ایک دوسرے سے بھی لڑتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکی رقیب ہندو سلطنت نے انکے اس اختلاف سے خوب فائدہ اٹھاتے ہوے انہیں آپس میں لڑاتی رہی۔ مسلمان جب خانہ جنگی کو ختم کرکے متحد ہوے تو انہوں نے اس ہندو سلطنت پر حملہ کیا اور اس کو ختم کر دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس فتح (تالیکوٹہ) کے بعد پھر ان میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ اور قریباً ایک صدی تک پھر ان میں آپس میں جنگیں ہوتی رہیں۔ اس خانہ جنگی کی وجہ سے انہوں نے جنوبی ہند پر (جہاں ہندوؤں میں طوائف الملوکی پھیلی ہوی تھی) بالکل توجہ نہیں کی۔

سترہویں صدی کے اخیر میں عالمگیر اورنگ زیب نے جب دکن کی ان اسلامی سلطنتوں کو ختم کیا تو مرہٹے اب اسکی راہ میں حائل ہو چکے تھے۔ مرہٹے اور مسلمانوں کی لڑائیاں شروع ہوگئیں۔

تاہم عالمگیر نے جنوب میں دو صوبہ داریاں قایم کیں۔ ارکاٹ اور سرا۔ ان صوبہ داریوں کے قایم ہونے کے چند سال بعد ہی عالمگیر کی وفات ہو گئی۔ اور بسلسلہ تخت کیلئے شمالی ہند میں خانہ جنگی شروع ہوی۔ یہی جنوب میں بھی ہوا۔ اور یہ صوبے ایک دوسرے کے مخالف بن گئے۔

اور جب اس سے نجات ملی تو ارکاٹ ہی میں مسند نشینی کے جھگڑے پیدا ہوئے۔ اور یہی وہ وقت ہے کہ انگریز اور فرانسیسی جو اب تک صرف تجارت پر قانع تھے۔ ملکی معاملات میں دخل دینا شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز کامیاب ہوتے چلے گئے۔ اور تمام ملک عالمگیر کی وفات سے ایک سو سال بعد انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں کو جو پہلا موقع ملک کا فور کے حملے کے بعد ملا۔ اسکو خود انہوں نے چالیس سال کے اندر اندر گنوا دیا۔ اور دوسرا موقع جو ڈھائی سو سال تک (۱۵۶۵ء سے ۱۸۰۰ء تک) تالیکوٹہ کی جنگ کے بعد حاصل ہوا۔ اسکو بھی انہوں نے اپنی خانہ جنگی میں صرف کر دیا۔ جسکے بعد انگریز اس ملک پر قابض ہو گئے۔ ان حالات میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ مسلمان یہاں اس درجہ اقلیت میں ہیں۔

چند تاریخی غلط فہمیوں کی اصلاح

ملک کافور

آج کل چند مسلمانوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ شہنشاہ علاؤالدین کے قابل محز غلام اور جنوبی ہند کے مشہور فاتح کا نوں کا نام کافور نہیں بلکہ غفور ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ کافور کوئی اسلامی نام نہیں اور یہ ناممکن ہے کہ علاؤالدین نے اس کا نام اسلامی وضع کے نام چھوڑ کر کافور جیسا غیر اسلامی نام رکھا ہو۔ یہ اصل میں مغربی مورخین کا تعصب اور فریب ہے کہ انہوں نے غفور کو کافور بنا دیا۔ اور ان کی ریس میں اسلامی مصنفین بھی غفور کو کافور لکھنے لگے۔ عوام تو عوام؛ لکھے پڑھے لوگ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس لئے ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اس قسم کی غلط فہمیوں کی اصلاح کر دی جائے: تاکہ آئندہ کہیں ہماری تاریخ ہی مسخ ہو کر نہ رہ جائے۔

ملک کافور ایک حبشی غلام تھا۔ شہنشاہ علاؤالدین نے اس کا نام کافور ہی رکھا تھا یہ تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ حبشی سیاہ فام ہوتے ہیں۔ اس لئے اکثر امراء اسلام اپنے حبشی غلاموں کے ایسے نام رکھتے تھے جو ان کی خوش مذاقی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اسی لئے سعدیؒ شیرازی کا یہ مصرعہ ضرب المثل مشہور ہو گیا ہے ؛۔

"برعکس نہند نام زنگی کافور"

اس سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ آیا جنوبی ہند کے اس فاتح کا نام کافور ہی ہے یا

غفور۔ جہاں تک مغربی مورخین کا ہماری تاریخ سے تعلق ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی پیداوار تو صرف ایک صدی یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ صدی کی ہے۔ لیکن ان سے کئی صدی پہلے بلکہ علاؤالدین کے زمانے ہی میں حضرت امیر خسرو دہلوی نے تاریخ علائی لکھی ہے۔ اور ان کے بعد تغلق کے زمانے میں ابن بطوطہ اور ضیاء الدین برنی گذرے ہیں۔ پھر عہد مغلیہ (عہد اکبر میں) بدایونی نے تاریخ ہند لکھی ہے۔ اور سلاطین بیجا پور کے عہد میں فرشتہ نے اپنی تاریخ مرتب کی تھی۔ ان تمام مشہور تاریخوں میں ان کے مصنفوں نے اس فاتح کا نام کافور ہی لکھا ہے۔

مغربی مورخین پر یہ بیجا الزام ہے کہ انہوں نے اسلامی ناموں کو مسخ کردیا ہے۔ اس میں انکا کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے قدیم تاریخوں میں جو نام دیکھا وہی لکھا ہے اسلئے کافور بالکل صحیح ہے (نوٹ:۔ ریحان کو بھی اب بعض لوگ رحمان لکھنے لگے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے بلکہ اسی زمانے کے کتبے ابھی موجود ہیں۔ ان پر نام ریحان ہی لکھا ہوا ہے۔ یہ کتبے اسی کتاب میں کسی اور جگہ نقل بھی کئے گئے ہیں) اسلئے لامحالہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسکا اصلی نام کافور ہی تھا۔ اب اگر اسلامیت کے جوش میں اسکو کھینچ تان کر غفور بنایا جارہا ہے تو معلوم نہیں کہ یہ لوگ عنبر، سنبل، ریحان اور نسرین وغیرہ ناموں کی کیا تاویل کریں گے۔ جس طرح کافور تاریخ ہند کی ایک مشہور شخصیت ہے۔ اسی طرح عنبر، سنبل اور ریحان بھی مشہور شخصیتیں ہیں۔ غلاموں کے نام اس قسم کے رکھنے کی ایک یہ وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اُس زمانے کے اسلامی سلاطین و امراء میں اس زمانے کے مسلمانوں سے زیادہ مذہبی جوش تھا۔ انہوں نے نہ چاہا کہ اپنے غلاموں کے نام خدا و رسول کے ناموں پر رکھیں۔ جب ہمارے پاس قدیم تاریخی کتب میں اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ کافور کا نام کافور ہی ہے تو اب اس قسم کی دماغی اختراعات کو رواج دینا خود اپنی تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔

اگر یہ خیال ہے کہ کافور عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ اور مسلمانوں میں عربی نام رکھنے کا قاعدہ ہے تو یہ بھی درست نہیں۔ کافور، عنبر، سنبل، ریحان سب عربی ہیں۔ اور عربی زبان میں مستعمل ہیں۔

پھر یہ کہ کافور کوئی نیا اور اسلامی دنیا میں اجنبی نام بھی نہیں۔ قدیم عربی اسلامی حکومتوں میں بھی کافور نام کے بہت سے غلام گذرے ہیں۔ جن میں بعض نہایت ممتاز، بااثر اور نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ مثلاً عربی کے مشہور و نامی شاعر متبنی کے ایک ممدوح کا نام کافور تھا۔

عہد عباسیہ کے سب سے ممتاز خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں اس کا ایک مشہور غلام کافور تھا۔ کافور کی دو ایک حکایتیں گلستان (مصنفہ شیخ سعدی شیرازیؒ) میں بھی ملتی ہیں۔ غرضکہ یہ نام غلاموں کیلئے دنیائے اسلام کا معروف اور متداول نام ہے۔ پھر اسے غفور بنانا ہٹ دھرمی اور شرارت نہیں تو اور کیا ہے۔

دوارسمندرم "ہوسے سالا" سلطنت کے پائے تخت کا نام ہے۔ اصلی نام دوارکا سمندرم تھا۔ جو کثرت استعمال سے رفتہ رفتہ دوارسمندرم اور دورے سمندرم بن گیا۔ تاریخ علائی، تاریخ برنی اور فرشتہ وغیرہ میں اس کو دہورسمندر کے نام سے لکھا ہے۔ اس نام کا شہر موجودہ وقت (ہلے بید ہے۔ جو) میں ریاست میسور کے ضلع ہاسن میں ہے اور اسی شہر میں وہ مشہور سمندر بھی ہے جس پر ملک کافور نے قبضہ کیا تھا۔ اب اس شہر کے نام کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا کی جارہی ہے کہ اس شہر کا نام عربوں نے باب البحر رکھا تھا یہ غلط فہمی دوارسے سمندرم کے نام سے پیدا ہوئی ہے۔ سنسکرت میں دوارکا، دوارسے، دوار دروازے کو کہتے ہیں۔ اور سمندرم کے معنے قدیم ڈراوڑی زبانوں میں سمندر کے ہیں۔ اکثر الفاظ

اور ناموں کے آخر میں میم بڑھا دیا جاتا ہے۔ اور یہ عام بات ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا ترجمہ عربی میں باب البحر ہوگا۔ یعنے سمندر کا دروازہ لیکن عرب اس قدر عقل سے عاری نہیں تھے کہ ایک شہر کو جو سمندر کے ساحل سے قریباً ڈیڑھ سو میل دور ہو۔ اس کو باب البحر کہنے لگیں۔ اور وہ بھی بلا ضرورت عربی مورخوں اور جغرافیہ دانوں نے باب البحر کا نام کئی جگہ استعمال کیا ہے خصوصاً ہندوستان میں یہ نام انہوں نے اس آبنائے کو دیا ہے۔ جو ہندوستان اور سیلون کے درمیان میں واقع ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ اس لئے کہ اس آبنائے کے قریب تین سمندر ملتے ہیں۔ ایک بحر عرب، دوسرا خلیج بنگالہ، تیسرا بحر ہند۔ اور یہ آبنائے صحیح طور پر ان سمندروں کا دروازہ ہے۔ اسی طرح ملک عرب کے قریب باب المندب بھی ہے یہ آبنائے جو بحیرۂ عرب اور رڈسی (بحیرۂ احمر) کو ملاتی ہے۔ اور صحیح طور پر ان دونوں سمندروں کا باب (دروازہ) ہے۔

چونکہ دوارسمندرم کے معنے عربی میں باب البحر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ غلط فہمی پیدا کی جارہی ہے۔ ورنہ درحقیقت باب البحر اور دوارسمندرم میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ قدیم ہندوستان میں اس قسم کے بہت سے نام پائے جاتے ہیں۔ دوارکا گجرات کا ایک مشہور شہر ہے۔ دوارکا کرشن جی کی جائے پیدائش کا بھی نام ہے۔ دوارکا کے معنی دروازہ کے ہیں۔ جس طرح دہلی کے معنے دہلیز کے ہیں۔ ہندوؤں نے اس جگہ کا نام دوارکا سمندرم اس لئے رکھا ہوگا کہ سمندر کے معنی کثرت کے بھی ہیں۔ اس سے ان کی مراد ہے۔ بہت سے دروازوں والا شہر۔ یعنے بڑا شہر۔ جس میں مکانات کی کثرت آبادی کی بہتات اور دروازوں کی افراط

ہے

میسور

اس نام کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ عربوں ہی نے اس ملک کا نام میسور رکھا تھا۔ یہ غلط فہمی بھی نام ہی کی وجہ سے ہوی ہے۔ میسور کے معنے عربی میں آسانی کے ہیں۔ اور تاویل یہ کی گئی ہے کہ عربوں کے جہاز یہاں آسانی سے لنگر انداز ہوتے تھے۔ اسی لیئے عربوں نے اس کو ملک کو میسور نام دیا۔

کسی تاریخ یا جغرافیہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ کہ اس تمام ملک کو جواب ریاست میسور کہلاتا ہے۔ کسی زمانے میں میسور کہا جاتا تھا۔ یہ نام کوئی ۱۴۰ سال کی پیداوار ہے سلطنتِ خداداد کی تباہی کے بعد جب انگریزوں نے شہر میسور کو راجدھانی کے لیئے انتخاب کیا تو کل ریاست کو بھی یہی نام دیا گیا۔ ورنہ خاص شہر میسور کوئی قدیم تاریخی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ ایک معمولی قصبہ تھا۔ جہاں ہڈناڈ کا پالیگار (زمیندار) سولھویں صدی عیسوی میں ایک معمولی قلعہ بنا کر رہنے لگا تھا۔ (اس کا مفصل بیان تاریخ میسور میں آ چکا ہے)

اگر ریاست میسور کی موجودہ تشکیل نہ ہوتی تو میسور کا نام بھی آج کوئی نہ جانتا۔ وہ ایک معمولی قصبہ ہی رہتا۔ اب اگر اس کو کھینچ تان کر یا عربی کے لفظی معنی لیکر یہ کہا جائے کہ یہاں عربوں کے جہاز آسانی سے لنگر انداز ہوتے تھے تو معلوم نہیں۔ میسور میں وہ کونسا سمندر تھا جس میں عربوں کے جہاز آکر لنگر انداز ہوتے تھے۔ اگر کوئی سمندر تھا تو کیا وہ خشک ہوگیا۔ حیرت ناک بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ موجودہ ریاست جس کو میسور کا نام دیا گیا ہے۔ قدیم کرناٹک کا ایک حصہ ہے۔ مغرب میں ساحل سمندر سے لگے ہوئے ملک کے شمالی حصہ کو کوکن اور کنارا اور جنوبی حصہ کو کرالا یا ملیبار کہتے تھے۔ اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ تمام ملک کو میسور ہی کہا جاتا تھا تو یقیناً یہ بھی ثابت کرنا پڑیگا کہ قدیم زمانے میں میسور ایک بہت

بڑی سلطنت تھی۔ جس کے زیر نگین ملیبار، کنارا اور کوکن وغیرہ بھی تھے۔ کسی تاریخ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس لئے میسور کے متعلق یہ کہنا کہ یہ نام عربوں کا رکھا ہوا ہے۔ بالکل غلط ہے۔

مزار ابو تمیم انصاری رضؓ

مدراس کے قریب کولم نامی ایک گاؤں میں کسی بزرگ کا مزار ہے۔ جس کے متعلق مشہور ہو گیا ہے کہ یہ حضرت ابو تمیم انصاریؓ کا مزار ہے۔ یہاں ہر سال بڑے اہتمام سے عرس ہوتا ہے۔ ہزاروں مرد اور عورتیں آتی ہیں۔ پہلے تو یہ کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابو تمیم انصاری رضی اللہ عنہ جو صحابی رسول اللہؐ تھے۔ ہندوستان آئے ہوں۔ یہ سچ ہے کہ تجارت کے لئے عرب جنوبی ہندوستان کے ساحلوں پر آتے تھے۔ لیکن حضرت ابو تمیم انصاریؓ کا نام کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ اب اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت ابو تمیم انصاری رضی اللہ عنہ جنوبی ہند میں آئے بھی تھے تو انہیں کولم جیسے غیر معروف مقام میں آنے کی کیا ضرورت واقع ہوئی عرب بلاشبہ ساحل مدراس اور ساحل ملیبار پر ان شہروں میں آتے جاتے تھے جو کسی زمانے میں تجارتی منڈیاں تھیں۔ مگر کولم کوئی تجارتی منڈی نہ تھی۔

یہ بھی ہم فرض کر لیتے ہیں کہ حضرت ابو تمیم انصاریؓ کولم آئے تھے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ عربی تاریخوں میں ابو تمیم انصاریؓ کا مزار ملک شام میں ہونا بتایا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بھی غلط ہو۔ لیکن جو روایت حضرت ابو تمیم انصاریؓ کے متعلق مشہور ہے وہ اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ کسی طرح عقل سلیم اس کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو تمیم انصاریؓ جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے وصیت کی کہ میری لاش دفن نہ کرنا۔ بلکہ ایک صندوق میں بند کر کے سمندر میں بہا دینا۔ چنانچہ آپ کی وصیت کے مطابق آپ

کے عزیزوں اور دوستوں نے اس پر عمل کیا اور صندوق کو ملک عرب کے سمندر میں بہا دیا وہ دریا میں بہتا، گھومتا پھرتا، موجوں اور تھپیڑوں کا مقابلہ کرتا ہوا مدراس کے قریب کوولم کے ساحل پر آ لگا۔ یہاں کے مقامی حاکم کو خبر دی گئی۔ اس نے صندوق کھلوایا تو اس میں ایک مقدس، نورانی پیکر بے روح نظر آیا۔ اور پہلو میں ایک تحریر شدہ کاغذ رکھا ہوا تھا۔ پڑھوایا گیا تو میت کا حال معلوم ہوا۔ وہ نورانی لاش حسب وصیت سمندر ہی کے کنارے سپرد خاک کر دی گئی۔

اب مقام غور ہے کہ ایک جلیل القدر صحابیؓ رسولؐ پر کس قدر اتہام ہے کہ آپ نے احکام اسلام اور عمل رسولؐ کے خلاف یہ وصیت کی ہو کہ لاش صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دی جائے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ عربی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابو تمیم انصاریؓ نے خلیفہ دوم سیدنا حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں انتقال فرمایا ہے۔ کس کی مجال تھی کہ اس زمانہ میں احکام اسلام کے خلاف کوئی وصیت یا کام کر سکتا۔ اس کے بعد یہ بھی غور طلب امر ہے کہ اگر راجہ نے اس کو پڑھوایا کیونکہ یہ تو عربی زبان میں ہوگی اس وقت یہاں عربی زبان جاننے والا تھا کون۔ ہندو راجہ اس وصیت پر عمل کرنا کیوں ضروری سمجھتا جبکہ ہندوؤں میں دفن میت کا رواج ہی نہ تھا۔ حضرت ابو تمیم انصاری کی وصیت پر عمل بھی کیا تو مزار پر کتبہ کیوں نہ لگایا۔ اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ یہ وصیت اب کس کے پاس محفوظ ہے۔ راجہ نے جب میت کو دفن کیا اور مقبرہ بنوایا تھا تو اس کے لئے کتبہ بھی لگا دینا آسان تھا۔ ہندوؤں نے اگر اپنی تاریخ مرتب نہیں کی تو کم از کم وہ اپنے چند کارنامے کتبوں کی صورت میں ضرور چھوڑ گئے ہیں۔

خیر، اس سے بھی قطع نظر کر کے یہ دیکھنا ہے کہ جب کولم میں اسلامی سلطنت نہیں تھی تو

اس کی دیکھ بھال اور تولیت سولھویں صدی کے اخیر تک کس طرح ہوتی رہی۔ یہاں تو جب تک گولکنڈہ کی اسلامی سلطنت نے اس ملک پر قبضہ نہیں کر لیا مسلمان لوگ آباد ہی نہ تھے۔ اگر اس واقعہ میں کچھ بھی حقیقت ہوتی تو گولکنڈہ کی تاریخ میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔

تیرہویں صدی عیسوی میں مدورا میں اسلامی سلطنت قائم تھی۔ اور مشہور سیاح ابن بطوطہ جنوبی ہند میں آیا ہوا تھا۔ اگر یہ مزار حضرت ابوتمیم انصاری کا ہوتا تو سیاح ابن بطوطہ ضرور اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر کرتا۔

ان دلائل کی روشنی میں یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مزار حضرت ابوتمیم انصاریؓ کا نہیں ہے۔ اب جو مقبرہ بنا ہوا ہے وہ سو ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ اس سے بھی بہت بعد کا۔ اور قبر نہایت لمبی ہے۔ فن تعمیر کے جاننے والوں کا خیال ہے۔ کہ ساٹھ ستر برس سے زیادہ کا نہیں ہے۔ جبکہ مسلمانوں میں ضعف اعتقاد اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ مقبرہ بعد کو بنوایا گیا ہے۔ بہر حال کوئی قرینہ اس روایت مشہورہ کو باور کرنے کا نظر نہیں آتا۔

مطبوعہ برقی کوثر پریس معسکر بنگلور

چند تاریخی ناموں کی تشریح

نظر نگر:- ترچناپلی۔ مسلمانوں نے اس شہر کو حضرت نظر ولی کے نام پر یہ نام دیا تھا۔ حضرت نظر ولی کا زمانہ چارہویں صدی ہجری ہے۔

دوہور سمندر، دوار سمندرم یا دوار کا سمندرم:- ہوے سالا سلطنت کا پائے تخت جس کو ہلے بید کہا جاتا ہے۔

معبر:- جنوبی ہند کا مشرقی حصہ جو مدراس سے تناولی تک ہے۔

پائین گھاٹ و بالاگھاٹ:- شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے جنوبی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے اس میدانی ملک کو جو مشرق میں ہے پائین گھاٹ اور مغربی حصہ کو جو پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ بالاگھاٹ نام دیا۔ گھاٹ سے مراد پہاڑی ہے۔

فرنگی کنڈہ:- مدراس کے قریب ہے۔ انگریز اس کو سنٹ تھامس ماونٹ کہتے ہیں۔ لیکن مقامی طور پر پلے وارم کے نام سے مشہور ہے۔

چین پٹن یا چینا پٹن:- مدراس۔

دوآبہ رائچور:- ملک کا وہ حصہ جو دریائے کرشنا اور تنگ بھدرا کے درمیان واقع ہے۔

تنگ بھدرا:- دراصل یہ دو دریا ہیں۔ ایک کا نام تنگا۔ دوسرے کا بھدرا ہے۔ مقام کڈلی میں ان دونوں کا اتصال ہوتا ہے۔ جس کے بعد اس کو دریائے تنگ بھدرا کہتے ہیں۔

عرب تمل:- یہ ایک مخلوط زبان ہے۔ جو عربی اور تمل زبان کی آمیزش سے جنوبی ہند میں پیدا ہوئی۔ اور [illegible] مشتمل ہے۔

ختم شد